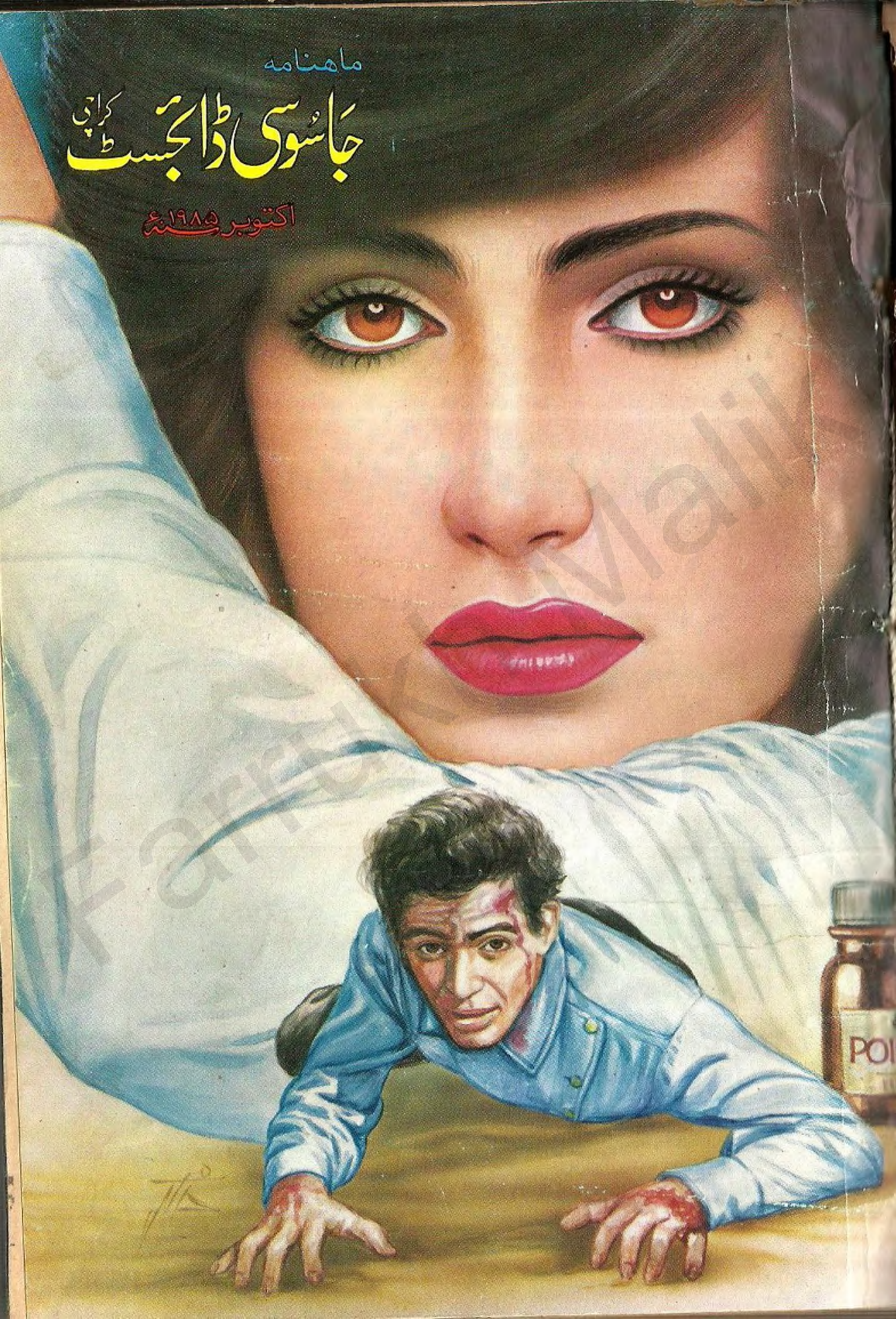

ماهنامه
جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
اکتوبر ۱۹۸۵ء

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

پبلشر: معراج رسول ○ مقام اشاعت: سعید منشن بلیمو ریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ○ پرنٹر: ابنِ حسن ○ مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Farhan Malik

مدیر اعلیٰ
معراج رسول

منتظم اعلیٰ
غلام کبریا

مسند نشین
یوسف طاہر

مصوّر
شاہد حسین

جلد: ۱۵ ◉ شمارہ: ۱۰ ◉ اکتوبر ۱۹۸۵ء ◉ قیمت فی پرچہ: ۱۲ روپے ◉ زرِ سالانہ: ۱۸۰ روپے ◉ خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر ۲۲۹ ۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

چینی اور نکتہ چینی

قارئین کی محبتیں، کج ادائیاں، کرم فرمائیاں، ناراضیاں، رفاقتیں
نامہ و پیام، دل کے سلسلے، قربتیں، فاصلے، حکایتیں، شکایتیں

قارئین! السلام علیکم۔ ستمبر کا شمارہ اس اعتبار سے قابلِ ذکر رہا کہ بعض منفرد نوعیت کی غلطیوں سے آراستہ تھا جن میں سے کچھ غلطیوں کی نشاندہی اکثر خطوط میں کی گئی ہے۔ اس معاملے میں ہم کسی دلیل و حجت کے قائل نہیں اور معذرت سے بھی کام نہیں چلتا غلطی بہرصورت غلطی ہے۔ ہاں، یہ وعدہ کیا جاسکتا ہے کہ آئندہ ہر ممکن احتیاط برتی جائے گی۔ چینی، نکتہ چینی کے سلسلے میں بھی چند باتیں اس ماہ ہوجائیں۔ اکثر تبصرہ نگار، مصنف اور کہانی کی تعریف و توصیف کے ساتھ کہانی کا خلاصہ بھی لکھ مارتے ہیں، غالباً مقصود تبصرے کو بھاری بھرکم بنانا ہوتا ہے لیکن اس بوجھ تلے تبصرہ دب جاتا ہے۔ بعض حضرات صرف اپنی پسند کی کہانیوں پر ہی تبصرے کو بہت جانتے ہیں تو کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن کی بار یک بینی سے اشتہارات بھی محفوظ نہیں۔ انعامی مقابلے میں شرکت کے لیے جہاں ہر شعبے پر اظہارِ خیال ضروری ہے وہاں 'چینی' کے ساتھ 'نکتہ چینی' کو بھی نہ بھولیے ــــ اور اب پہلے اس ماہ کے انعام یافتہ خطوط اور پھر دیگر تبصرے۔

اس ماہ کا پہلا انعامی تبصرہ **معین الدین احمد خان سیال** نے اوکاڑہ سے ارسال کیا ہے۔ "اس وقت میرے سامنے میز پر ستمبر ۸۵ء کا جاسوسی ڈائجسٹ پڑا ہے۔ سرورق اس دفعہ چونکا دینے والا تھا۔ ہمیں گمان ہوا کہ یہ حسینہ "ذکریا" قاتلِ دل ہماری ہی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی ذاکر صاحب کو بے ساختہ داد دینے لگے اور ان کی تعریف میں آپ ہی آپ منہ سے کلمات ادا ہونے لگے۔ اور پھر میٹھے اور کڑوے 'چینی'، 'نکتہ چینی' کے ذائقے سے لطف اندوز ہوئے۔ اس کے بعد امامِ اعظمؒ پر لکھا ہوا ایمان افروز مضمون پڑھا جس سے قلب کی سیاہی دور ہونے لگی۔ امامِ اعظمؒ پر تبصرہ کرنے میں دوسرے قارئین کی طرح میں بھی بے بس ہوں۔ دل تو چاہتا ہے کہ خان آصف کو گلے لگا کر خوب داد دوں۔ (خان صاحب کو داد دینے کا صحیح طریقہ یہی ہے) ۔ اس کے بعد علی یار خان کی حسین کاوش "مجاہد" کی تلاش میں گھوڑے دوڑانے لگے، بحرِ صفحات میں۔ بالآخر صفحہ نمبر ۲۷ پر باگیں کھینچیں تو وہ 'اودھے' اور 'چرن سنگھ' کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ محترت اس وقت لوٹی جب ساری کی ساری قسط چٹ کر گئے۔ مجاہد ایک ولولہ انگیز تحریر ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے... کہ... کہ مجاہد میں خود ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو مجاہد بنائے۔ عظیم مصنف جبار توقیر کی نہ بھولنے والی اور بے مثال یادگار 'گمراہ' ہمیشہ دلوں پر نقش رہے گی۔ وہ خود تو اس دنیائے فانی میں نہ رہ سکے لیکن اپنی انوکھی یادگار چھوڑ گئے جو ہمیں ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہے گی۔ خدارا گمراہ کو جلدی ختم نہ کیجیے۔ جیلانی صاحب ادھر پاکستان آئے اور ادھر خاص دیس پنجاب کے پنجابی رنگ میں ڈھل گئے۔ خالص پنجابی نوجوانوں کی طرح کپڑا کندھوں سے لٹکا رکھا ہے۔ اسکیچ تقریباً معیاری ہے۔ احمد اقبال کے شوخ قلم کی، شوخ تحریر "شکاری" بھی معاشرے کی اونچ نیچ کی نشاندہی کرتی ہے۔ احمد اقبال صاحب اپنے انوکھے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر اس طرح بکھیرتے ہیں کہ قاری ان کے سحر میں گرفتار ہو کر شکار ہو جاتا ہے۔ بے شک ہمارے معاشرے میں ایک نہیں بلکہ کئی چوہدری دلاور موجود ہیں لیکن جہاں فرعون ہو وہاں اللہ تعالیٰ موسیٰ ضرور پیدا کرتا ہے۔ آخر میں احمد اقبال کو مبارکباد اور ایم اے ایس کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ 'ادھوری خبر' کا اگرچہ ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اقبال کاظمی کا اپنا ایک خاص انداز ہے جو کہ واقعات کو ایک دوسرے سے ٹوٹنے نہیں دیتا۔ کیپٹن کارل کا انجام پڑھ کر دل کو قدرے سکون حاصل ہوا۔ عبدالقیوم شاد کے ترجمے 'ضرورت مند' نے کچھ خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ ایک خوبصورت اور جوان عورت کا ایک بوڑھے اور معذور سے محبت کرنا...؟ بات دل کو نہیں لگتی۔ (یہ کہانی ایک بار پھر پڑھ لیں) ـــ ش۔م۔جمیل کی 'پسِ جرم' جیسی کئی کہانیاں پہلے بھی چھپ چکی ہیں۔ آدھی کہانی پڑھنے سے ہی پتا چل گیا تھا کہ یا تو جیف، کا چکر ہے یا پھر اس کی بیوی بینی کے اشارے پر یہ سب ہو رہا ہے۔ اسکیچ پر جو گھوڑے کی گردن اور منہ دکھایا گیا ہے اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ (حیرت ہے! آپ کو گھوڑے کا وہ مجسمہ نظر نہیں آیا جس کے سبب مجرم بے نقاب ہوا۔) 'مردم شناس' اچھی کاوش تھی، بے شک جو کسی کے لیے کنواں کھودتا ہے وہ خود ہی اس میں گرتا ہے۔ اسکیچ اچھا تھا۔ ابوالمنصور کی 'اپنی آگ' اس بات کی نصیحت ہے کہ آدمی کو اہم فیصلے کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ نسیم جاوید سید کا 'مہنگا سستا' بہترین انتخاب ہے ـــ یہ ایک نصیحت آموز کہانی ہے یقیناً خدا جب چاہتا ہے تو

واجیولی ہائلی کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ سرورق کی کہانیوں میں اس دفعہ بھی بازی صبا احمد کے ہاتھ ہی میں رہی۔ صبا احمد کی ’دورِ جنوں‘ ایک انوکھی اور منفرد تحریر ہے۔ برِصغیر کی اس عظیم لکھاری نے جس طرح انسان اور اس کے ضمیر کو ایک دوسرے کے مدِمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ یہ بلاشبہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ’دورِ جنوں‘ جب شروع کی تو آخری لفظ تک حقیقت ہی حقیقت نظر آئی۔ دوسرا نمبر اثر نعمانی کی ’ناسور‘ کا ہے۔ اگر کیپٹن شہزاد جیسے باضمیر اور محبِ وطن نہ پائے جائیں تو مجرموں کی سرگرمیوں سے کسی کو پناہ نہ ملے۔ یہ وہ ناسور ہیں جو زخم بن کر سارے جسم (مملکت) کو چاٹے جاتے ہیں۔ تیسرا نمبر ظفر اعجاز کی ’پیاس‘ کا ہے۔ جو کہ بالکل غیر ضروری سی تھی۔ (حیرت ہے!) نہ تجسس تھا، نہ سسپنس تھا۔ (مزید حیرت ہے!)۔ پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ بظاہر شریف نظر آنے والا بابر ہی آستین کا خنجر ثابت ہوگا۔ مصنف نے انجام چونکانے والا کیا ہے۔“ (اب آپ کے چونکنے پر حیرت ہے!)

دوسرے انعام کے حق دار ٹھہرے ہیں اس ماہ ٹیکسلا سے **مختار احمد**۔ ان کا تبصرہ ہی منفرد نہیں، تبصرے کے لیے جو کاغذ استعمال ہوا ہے وہ بھی تقریباً ایک میٹر لمبا ہے۔ بہرحال آپ تبصرہ ملاحظہ کیجیے ”سرورق اس بار نہایت خوبصورت اور واقعی جاسوسی قسم کا تھا۔ پلاسٹک کی چلمن سے خوبصورت حسینہ کی آنکھیں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ خان آصف صاحب جس تفصیل اور عرق ریزی سے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں، اس سے ہمیں کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس مضمون کے لیے ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ اور خان آصف واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں، خدا آپ کو اس کارِ خیر کا اجر دے (آمین)۔ اسی مضمون میں صفحہ نمبر ۳۲ سطر نمبر ۱۵ پر حضرت سالم بن عبداللہؒ اور ان کے والد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ذکر ہے اور پھر فوراً ہی سطر نمبر ۱۶ پر حضرت سالم بن عبداللہؒ کے انتقال کا ذکر ہے۔ اس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ حضرت سالم بن عبداللہؒ کا جس وقت انتقال ہوا تو آپ کے والدِ محترم اس وقت حیات تھے یا نہیں؟ (وہاں اس بات کی وضاحت کا کوئی موقع بھی تو نہ تھا) ’ادھوری خبر‘ دوسری جنگِ عظیم کے حوالے سے ایک اچھی کاوش تھی۔ واقعی کیپٹن کارل ہیلر اسی انجام کا مستحق تھا جس تک اُسے کارٹر نے پہنچایا۔ کیپٹن کارل نے اپنا نام جنگ کے بعد تبدیل کیا تھا پھر نہ جانے کیوں اس نے ماچس کی ڈبیہ پر اپنا اصل نام لکھا؟ بہرحال اب تک جنگِ عظیم کے حوالے سے جتنی کہانیاں شائع ہوئی ہیں، ان میں یہ کہانی اچھی تھی۔ گمراہ کی موجودہ قسط بڑی تیز تھی۔ پوری کہانی ایک ہی نشست میں پڑھی اور آخر تک سسپنس برقرار رہا۔ ’ضرورت مند‘ بدیسی کہانیوں میں دوسرے درجے کی کہانی تھی۔ سام ٹربن واقعی ایک ذہین سراغ رساں تھا۔ اس کہانی سے پتا چلتا ہے کہ خاندانی وکیل اور مشیر پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ ’پسِ جرم‘ اسمگلنگ کے موضوع پر ایک نہایت ہی پُرتجسس کہانی تھی۔ خدا کرے کہ پاکستان میں بھی اس کالے کاروبار میں ملوث افراد کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے کوئی ’جونی ناک‘ پیدا ہو جائے۔ ’شکاری‘ کے لیے احمد اقبال مبارک باد کے مستحق ہیں۔ وہ کہانی کو ایسے موڑ پر ختم کرتے ہیں کہ قاری اس کے بعد دعا کرنے لگتا ہے کہ کاش یہ مہینہ پندرہ دنوں کا ہو جائے۔ کہانی اب نہایت ہی سنسنی خیز مقام پر پہنچ گئی ہے۔ شکاری کے صفحہ نمبر ۱۳۶ پر دو مرتبہ نازو کے بجائے ’فوزیہ‘ کا نام لکھا ہوا ہے۔ (اس بار پروف ریڈنگ والے شاید عید کی چھٹیاں منانے گئے تھے یا منانے کی تیاریاں کر رہے تھے) ’مردم شناس‘ بدیسی.... کہانیوں میں محسن رضا کی اچھی کاوش تھی۔ اسمتھ بیچارہ واقعی غلط جگہ پھنس گیا تھا۔ ابوالمنصور کی ’اپنی آگ‘ کوئی خوشگوار تاثر نہیں چھوڑ سکی کیونکہ ایسی کئی کہانیاں پہلے بھی جاسوسی میں شائع ہو چکی ہیں۔ (اور آئندہ بھی شائع ہوتی رہیں گی۔ اس لیے کہ یہ ’اپنی آگ‘ ہے۔) مجاہد پڑھنا شروع کی تو کچھ امید بندھ گئی تھی کہ اس بار علی یار خان کو رہائی مل جائے گی لیکن آخر میں رہا ہوتے ہوتے پھنس گیا۔ علی یار خان کے کارنامے پڑھ کر ہم میں بھی جہاد کا جذبہ موجزن ہو جاتا ہے۔ (جزاک اللہ! چھاپتے ہوئے اِدھر بھی یہی کیفیت ہے) لیکن گزشتہ چند قسطوں سے آپ نے اُسے جہاد کے بجائے قید میں ڈال دیا ہے۔ (معاذاللہ! یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت کہاں ہمیں!) ’مہنگا سستا‘ نسیم جاوید سید نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے؟ (جی ہاں) بالکل ایسی ہی کہانی کسی اور ڈائجسٹ میں بھی پڑھی تھی۔ کہانی کا انجام واقعی چونکا دینے والا تھا۔ مجموعی طور پر کہانی اچھی تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی ’پیاس‘ معیار کے لحاظ سے بھی پہلے نمبر پر رہی۔ قدم قدم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کہانی میں آخر تک سسپنس رہا۔ قاری سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انسپکٹر عزت یار کے ساتھ تعاون کرنے والا اور مریم کا اتنا ممدوح بابر ہی دراصل وہ مجرم ہوگا جو خوبصورت لڑکیوں کو قتل کر کے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ ’ناسور‘ اثر نعمانی کی دوسرے درجے کی کہانی اور کیپٹن شہزاد کا تازہ ترین کارنامہ تھا۔ (ہم نے بھی اسے دوسرے ہی نمبر پر رکھا۔) صبا احمد صاحبہ مسلسل کئی مہینوں سے سرورق پر بہترین کہانیاں لکھ رہی ہے۔ اس بار اُن کی کہانی ’دورِ جنوں‘ ایک گھریلو معاشرتی کہانی تھی۔ شک واقعی ایسی بیماری ہے جو خاندان والوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ مصنفہ کی گرفت کہانی پر بہت مضبوط تھی اور ہم تو آخر تک آفاق صاحب کو ہی قاتل سمجھتے رہے۔ کہانی کے آخر میں رفیق کو بے گناہ ثابت کر کے جیل سے باہر لانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔“

محمد حامد فیض نے اسلام آباد سے ایک نہایت دلچسپ تبصرہ روانہ کیا ہے۔ طوالت کے سبب یہ تو ممکن نہیں کہ من وعن نقل کر دیا جائے۔ بطورِ تبرک کچھ حصے ملاحظہ کیجیے ”جیسے ہی آپ کا ڈائجسٹ مجھے موصول ہوا، اسی وقت میں نے اسے پڑھنا اور ختم کرنا شروع کر دیا۔ (حالانکہ اس مستعدی کی ضرورت نہ تھی) بہرحال آہستہ آہستہ میں ان تمام کہانیوں پر تبصرہ کر کے انعامی مقابلے کی صف میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ (اس کام میں سُستی نہ کریں) ڈائجسٹ کے اوپر ہی ذاکر صاحب کی سابقہ محبوبہ کا آدھا رُخ روشن نظر آ رہا تھا... (رد کے

میاں روک کے ! ذاکر صاحب پہلے ہی اسلام آباد والوں سے خوش نہیں ہیں۔) ڈائجسٹ کے آغاز ہی سے ہمارے اکابرین کرام کے مضمون کا سلسلہ تھا۔ حسبِ معمول حضرت امام اعظم..... ابو حنیفہؒ کے اساتذہ کے حالات و واقعات قلمبند کیے گئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عونؒ کی زندگی کے شب و روز کو خان آصف صاحب نے عمدہ اندازِ بیان کے ذریعے تحریر میں لانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد ادھوری خبر کی باری آتی ہے۔ کارٹر اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا تھا مگر جو سزا کارل کو ملنی تھی وہ قدرت کی طرف سے ملی۔ اگلی کہانی ہے جبار توقیر مرحوم کی سلسلے وار 'گمراہ'۔ اس کہانی میں تجسس اور ایکشن قدرے تیز ہوا ہے ــــ ویسے بھی جب تک کسی کہانی کا ٹیمپو تیز نہ ہو، اس کہانی کو پڑھنے میں مزہ نہیں آتا۔ اس کہانی میں اس بے بس ماں کی بے بسی کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جو صرف اپنے بیٹے اور بیٹی کے انتظار میں آخری گھڑیاں گن رہی ہے۔ شاد صاحب کی 'ضرورت مند' ایک منفرد انداز لیے ہوئے تھی کافی متاثر کر گئی۔ اس کہانی سے یہ پتا چلتا ہے کہ اگرچہ مغربی ماحول گناہ کے تاریک 'دھوئیں' سے گرد آلود ہے مگر جس طرح کوڑے کے ڈھیر میں 'پھول' بھی کھل آتے ہیں بالکل وہی صورتِ حال یہاں بھی دکھائی گئی تھی۔ ش۔م جمیل صاحب جن کے پُراسرار نام کے مخفف سے نہ جانے کیا بنتا ہے مگر یہ پُراسرار نام آج سے تقریباً کم از کم پندرہ سال یا شاید زیادہ ہو، کیونکہ اس سے قبل کے رسالے میں نے نہیں پڑھے، سے مختلف ڈائجسٹوں مگر جاسوسی ڈائجسٹ میں لازماً نظر آتا ہے۔ 'پلس جرم' ایک طویل کشمکش ہے، قانون کے محافظوں اور اسمگلروں کے درمیان۔ کاش ہماری پولیس کے عملے میں بھی ایسے لوگ موجود ہوتے جو بغیر کسی رُو رعایت کے ہر مجرم کو خواہ وہ کیسا ہی معاشرے میں مقام رکھتا ہو، پکڑ لیتے۔ اب باری ہے علی یار خان جیسے مجاہد کی۔ یہ صرف کہانی نہیں ہے بلکہ یہ ایک نشانِ مردِ مومن ہے، نشانِ عزم و ہمت ہے، نشان..... (بس بس، فی الحال اتنے ہی تمغے کافی ہیں)۔ 'مہنگا سستا' نسیم جاوید سید کی ایک درمیانی کہانی تھی۔ (یعنی پچھلی اور آئندہ آنے والی کہانیوں کے بیچ کی؟)۔ سرورق کی پہلی کہانی 'پیاس' کا انجام انتہائی غیر متوقع ہے۔ اگرچہ اس کہانی کا پلاٹ اچھا تھا مگر مجھے شبہ ہے کہ بالکل اسی پلاٹ پر مشتمل کہانی کچھ عرصہ قبل میں نے کسی ڈائجسٹ میں پڑھی تھی۔ ممکن ہے سسپنس یا جاسوسی ڈائجسٹ ہی میں سے کوئی ہو۔ (ایسی باتیں یقین اور ثبوت کے ساتھ کیا کریں) بہر حال کردار، واقعات اور تسلسل کے لحاظ سے یہ کہانی بہت اچھی تھی۔ سسپنس اور تجسس بھی نہایت عمدگی سے پیدا کیا گیا تھا۔ سرورق کی دوسری کہانی 'ناسور' دراصل کیپٹن شہزاد کے کارنامے پر مشتمل تھی۔ (اچھا!)۔ کیپٹن شہزاد کے سابقہ کارناموں کی طرح یہ بھی ایک عمدہ اضافہ تھا۔ اثر نعمانی 'خلیل جبران' جیسے کامیاب اور ہر دلعزیز کردار کے خالق ہیں۔ اب آہستہ آہستہ کیپٹن شہزاد کا کردار بھی وہی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ جیسا کہ میں پچھلے کئی مہینوں سے اپنے خطوط میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ صبا احمد وہ رائٹر ہیں جنھیں وقت کی نبض پر اور قاری کے دل پر پورا اختیار حاصل ہے۔ انکی کہانیوں کا انداز اتنا خوبصورت اور طرزِ تحریر اتنا دلکش ہوتا ہے کہ لکھنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ (مگر آپ لکھ رہے ہیں) زیرِ نظر سرورق کی تیسری کہانی "دورِ جنوں" بھی بالکل سابقہ کہانیوں کی طرح انتہائی خوبصورت تھی اور ہمارے معاشرے سے مطابقت رکھتی تھی۔ ہمارے ارد گرد اس کہانی کے کئی کردار بھی موجود ہو سکتے ہیں۔"

پتوکی سے **ایف آر طاہر** نے نامکمل تبصرہ بھیجا ہے، لکھتے ہیں "میری عادت ہے کہ ہر ماہ جب جاسوسی ملتا ہے تو فوراً ہی گمراہ سے شروع کرتا ہوں۔ 'گمراہ' کے بعد 'شکاری'، 'مجاہد' اور پھر سرورق کی کہانیوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ غلام جیلانی پاکستان پہنچتے ہی 'کھڑاک' کرنے لگا ہے جس سے کہانی ایک مرتبہ پھر سنسنی خیز ہو گئی ہے اور تیز رفتار بھی۔ شکاری بھی بہت اچھی جا رہی ہے۔ احمد اقبال بھی یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مجاہد، علی یار خان کے جزائر میں پہنچنے پر کچھ سست سی ہو گئی ہے۔ اب آئیں سرورق کی کہانیوں کی طرف۔ پہلی کہانی ظفر اعجاز کی 'پیاس'، ایک اچھی کہانی تھی مگر انجام کی وجہ سے کچھ خاص تاثر نہیں چھوڑ سکی۔ اثر نعمانی نے جبران کو چھوڑ کر اب کیپٹن شہزاد کو ہیرو بنا لیا ہے جو کہ میرے خیال میں جبران کی بہ نسبت ایک بہترین کردار ہے اور جبران کی کہانیوں سے زیادہ اچھی کہانیاں لے کر آتا ہے۔ 'دورِ جنوں' اس سے پہلے میں شاید جاسوسی میں یا کسی اور رسالے میں پڑھ چکا ہوں۔ انگریزی ناول یا انگریزی کہانی کے ترجمے کی شکل میں تھی۔ باقی کہانیاں ابھی تک نہیں پڑھ سکا۔ اس لیے ان پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔"

محمد طارق ایوب ہری پور ہزارہ سے رقمطراز ہیں "سرورق انتہائی خوبصورت تھا۔ "چینی نکتہ چینی" میں مسز عالیہ جید کا تبصرہ پسند آیا۔ خدا جانے انھیں سنجیدہ کاظمی صاحبہ کی تحریر کیوں پسند نہیں آئی۔ رخسانہ فیض الحسن کا تبصرہ اس قدر مشکل تھا اور میں نے اسقدر تکلیف سے پڑھا جیسے کوئی پرانی بس گجرات کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر بھاگ رہی ہو۔ امام اعظمؒ جناب خان آصف صاحب کی ایک ایسی تحریر ہے جسے پڑھ کر ہم اپنے بھولے بسرے لیکن بلند پایہ اور پاکیزہ ترین اسلاف کے بارے میں علم حاصل کر سکتے ہیں۔ ادھوری خبر اگرچہ کہانی اچھی تھی لیکن اس میں جاسوسی اور سسپنس نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ 'ضرورت مند' نہایت اعلیٰ اور سبق آموز تحریر تھی۔ 'پلس جرم' ایک بالکل بور تصنیف تھی۔ شروع سے لے کر آخر تک اس کہانی میں کوئی لطف محسوس نہ ہوا۔ 'مردم شناس' بہت پسند آئی۔ یہ اس مرتبہ کی مختصر کہانیوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اور چونکا دینے والی کہانی تھی۔ 'چینی نکتہ چینی' کا کالم پڑھنے کے بعد واضح ہوا کہ صبا احمد ایک صاحبہ ہیں اور جناب احمد اقبال صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ خدا قسم باپ بیٹی میں کیا کمالات موجود ہیں! اس مرتبہ 'دورِ جنوں' بلحاظِ جاسوسی ڈائجسٹ بہت پسند آئی۔ 'پیاس' اس مرتبہ میدان لے گئی۔ پچھلے ماہ کے برعکس اس ماہ ظفر اعجاز صاحب نے خوبصورتی سے سلسلہ جاری رکھا۔"

عبدالعزیز قریشی گاؤں یسالی ضلع راولپنڈی سے لکھتے ہیں "۱۳ اگست کو ستمبر کا شمارہ ملا۔ سرورق دیکھ کر ہی دنگ رہ گیا۔ سرورق واقعی بہت ہی خوبصورت تھا۔ شمارہ ملتے ہی سب سے پہلے 'مجاہد' شروع کی۔ علی یار خان کی یہ سرگزشت بہت اچھی جارہی ہے۔ 'امام اعظمؒ' بہترین سلسلہ ہے۔ خان آصف یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ گمراہ بھی بہت اچھی جارہی ہے۔"

غلام حیدر چوہدری منڈی فاروق آباد سے رطب اللساں ہیں "میں جاسوسی کا پرانا قاری ہوں لیکن خط لکھنے کی جسارت پہلی دفعہ کر رہا ہوں۔ اگر آپ شائع کریں گے تو آئندہ بھی آپ کی محفل میں شریک ہوتا رہوں گا۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی کہانیاں تو سب ہی اچھی ہیں لیکن 'گمراہ' اور 'شکاری' کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ جب تک یہ دونوں کہانیاں نہ پڑھ لوں کسی اور کہانی کا تو تصور ہی نہیں کرتا۔"

فاروق حسین بہار کالونی سکھر سے اس طرح گویا ہیں "اس ماہ جاسوسی ڈائجسٹ جلد ہی مل گیا۔ سرورق اچھا تھا۔ حسینہ کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی دلکش لگیں۔ اس ماہ بھی امام اعظمؒ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ خان آصف صاحب نے پیش کیا۔ مجاہد بہت اچھی جارہی ہے۔ علی یار خان کو ابھی بھی قید سے رہائی نہ مل سکی۔ انھیں جلد ہی رہا کریں۔ اس کے علاوہ گمراہ اور شکاری بھی پسند آئیں۔ گمراہ کو ابھی جاری ہی رکھیں۔ ہر ماہ لاکھوں قارئین اس کا انتظار کرتے ہیں۔ سرورق کی کہانیوں میں 'ناسور' بہتر تھی کیونکہ سراغرساں کہانیوں کی وجہ سے ہی جاسوسی کی مقبولیت قائم ہے۔ 'دورِ جنوں' بھی دل کو لگی۔ واقعی شک دیمک کی طرح انسان کو کھاجاتا ہے۔"

سید مخدوم ابوذر حسنین بخاری تحصیل پسرور سیالکوٹ سے یوں مخاطب ہیں "پچھلی کئی قسطوں سے شمارے میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کا جو تذکرہ ہے کہیں بھی ان کا ذکرِ خیر نہیں ہوتا۔ ہر قسط میں یا تو ان کے شاگردوں کا قصہ ہوتا ہے یا پھر اساتذہ کی باری۔ بات تو بڑی اچھی ہے کہ مکمل واقفیت ہوتی ہے پڑھنے والوں کو۔ اگر تھوڑا بہت تذکرہ آں کا بھی کر لیا کریں تو کیا فرق پڑ جائے آپ کو؟ رہی شمارے کی بات تو وہ یقیناً کسی تعریف یا تحسین کا محتاج نہیں۔ ہر پہلو سے مکمل اور جامع ہے۔" (بخاری صاحب! اس شکایت کا تفصیلی جواب خان آصف دے چکے ہیں، شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔)

رئیس ظفر الٰہی نے رحیم یار خان سے لکھا ہے "'شکاری' کو پڑھنا بیکار ثابت ہوا۔ ٹھیک ہے کہانی میں تھوڑا بہت رومانس ضروری ہے لیکن احمد اقبال صاحب نے تو حد کردی۔ آج کل کہیں محبت میں تو نہیں پھنسے ہوئے ہیں کیا؟ باقی امام اعظمؒ اور مجاہد کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجاہد کو پڑھ کر سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ جہاں بھی عالمِ اسلام کے مسلمانوں سے زیادتی ہوئی پاکستانی پیچھے نہیں رہے اور نہ رہیں گے۔"

گوجرانوالہ سے **طارق بٹ** نے لکھا ہے "جاسوسی میں مجھے سب سے اچھی 'مجاہد' لگتی ہے۔ علی یار خان کا کردار واقعی شاندار جارہا ہے۔ سرورق کی آخری کہانی 'دورِ جنوں' اچھی تھی جس میں صوفیہ کے کردار نے بہت متاثر کیا اور اثر نعمانی صاحب کی 'ناسور' کوئی خاص اچھی نہیں تھی۔ 'گمراہ' بھی لاجواب جارہی ہے۔ 'امام اعظمؒ' تو اپنی مثال آپ ہے۔"

ماسٹر **سکندر علی** جیکب آباد سے نکتہ چیں ہیں "سرورق پسند تو بہت آیا لیکن ایک بات جو مجھے اچھی نہ لگی وہ یہ تھی کہ آپ ہر مرتبہ نیلی آنکھوں والی لڑکی کو بھیجتے ہیں، کیا سیاہ آنکھ آپ کو اچھی نہیں لگتی؟ 'ادھوری خبر' نے کچھ اچھا تاثر نہ دیا۔ کہانی ٹاپک سے کہیں دور تھی۔ 'ضرورت مند' پسند آئی۔ باقی رہ گئیں سرورق کی باتیں تو سنو۔ 'پیاس' تو بالکل پسند نہ آئی اور پھر اعجاز صاحب نے یا پھر آپ کی پریس نے اتنی غلطیاں کی ہیں کہ کہیں نادر کی جگہ بابر اور کہیں انسپکٹر عزت یار۔۔۔ کی جگہ نادر لکھ دیا۔ مس صبا احمد یوں تو ہر ماہ میں ان کی کہانی کو نمبر ون قرار دیتا ہوں لیکن اس مرتبہ شکایت کروں گا کہ کہانی میں ہنسی بالکل نہ تھی۔ کہانی کا اختتام بالکل ادھورا رہا۔"

حیدرآباد کے **ناصر اقبال** تحریر فرماتے ہیں "جاسوسی کی تعریف کرنا ایسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ اس کے تینوں سلسلے اتنے جاندار ہوتے ہیں کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ اس ماہ سرورق کی کہانیاں لاجواب تھیں۔ خاص طور پر 'دورِ جنوں' ایک یادگار اور خوبصورت کہانی ہے۔ میں صبا احمد صاحبہ کو مبارک باد دیتا ہوں ایسی خوبصورت کہانی لکھنے پر۔"

لیاقت آباد کراچی سے **محمد یونس بلوچ** کا ارشاد ہے "یوں تو جاسوسی کی تمام کہانیاں اچھی ہوتی ہیں مگر قسط وار کہانیوں میں 'گمراہ' اور 'مجاہد' کی بات ہی اور ہے۔ جبار توقیر مرحوم کی اگر کوئی اور لکھی ہوئی کہانی ہو تو براہِ مہربانی گمراہ کے ختم ہونے پر اسے جاسوسی میں شامل کر دیں۔"

یہ خط ہے گورنمنٹ کالج میاں چنوں کے **محمد ریاض شاہد** کا، لکھتے ہیں "خان آصف صاحب نے جس پاکیزہ اور مقدس موضوع کو۔۔۔۔ اپنی تحریروں کے لیے منتخب فرمایا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ امام اعظمؒ کے بارے میں جتنے بھی واقعات تحریر کیے ہیں وہ ہمارے لیے انمول خزانہ ہیں۔ گمراہ کا اسکیچ اس ماہ سب سے زیادہ دیدہ زیب تھا۔ احمد اقبال کی سلسلہ وار کہانی 'شکاری' قارئین کو رفتہ رفتہ بڑی خوبصورتی سے شکار کرتی جارہی ہے۔ 'مجاہد' کی داستان بے حد ولولہ انگیز اور اثر انگیز ہے۔ اس وقت 'مجاہد' تمام سلسلے وار کہانیوں میں اے ون ہے اور سب سے ٹاپ پر جارہی ہے۔ اس کے علاوہ کہانیوں میں اثر نعمانی کی کہانی 'ناسور' بہت پسند آئی۔ 'دورِ جنوں'، 'پیاس'، 'اپنی آگ' قابلِ داد ہیں اور اقبال کاظمی کی 'ادھوری خبر' اور محسن رضا کی تخلیق 'مردم شناس' بھی بہت اچھی کاوشیں ہیں۔"

خادم حسین انجم نوشہرہ روڈ گوجرانوالہ سے رقمطراز ہیں "میں اس سے پہلے بہت سے دوسرے رسالوں کو پڑھا کرتا تھا

Farukh Malik

مگر جب میں گاؤں سے گوجرانوالہ شہر اپنے بہنوئی کے پاس کام کرنے کے لیے آیا تو وہاں میرے بہنوئی کے ایک بھائی نوال تھے جو جاسوسی ڈائجسٹ پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن میں اسے اٹھا کر دیکھنے لگا اور جب ورق گردانی کرتا گمراہ تک پہنچا تو بے اختیار اسے پڑھنے لگا جب کہانی ختم ہوئی تو مجھے اسے شروع سے پڑھنے کا شوق ہوا۔ میں اسی وقت بازار گیا اور پچھلے تین ماہ کے رسالے خریدے اور پڑھ ڈالے۔ خدا کی قسم اس وقت سے لے کر اب تک کسی اور رسالے کو نہیں پڑھا۔ صرف اسی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر تو ہر ماہ اسی کا انتظار رہنے لگا۔ اب آتے ہیں ذرا ستمبر کے جاسوسی کی طرف۔ جب اس کے سرورق پر نظر پڑی تو ہمیں ایک دوشیزہ چلمن سے جھانکتی ہوئی نظر آئی۔ کچھ آگے بڑھے تو چلیبی اور کھچیلی کو ملا کر ایک ہی سانس میں پی گئے۔ سرورق کی دوسری کہانی واقعی قابلِ دید تھی۔ اگر ہمارے ملک میں کیپٹن شہزاد جیسے عقل مند ابھی زندہ ہیں تو ہم پہ کوئی آنچ نہیں آسکتی۔ سرورق کی تیسری کہانی بھی کسی حد تک اچھی تھی۔"

سرائے کالا ٹیکسلا کے **میر نواب دین** لکھتے ہیں "گمراہ ایک اچھی کہانی ہے۔ غلام جیلانی کے ساتھ جو ظلم ہوئے مصنف نے ان میں حقیقی رنگ بھرا ہے۔ اب تو ماشاء اللہ 'مجاہد' اور 'شکاری' بھی اچھی جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ سرورق کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ صد آفرین جناب خان آصف صاحب کو وہ امام اعظمؒ جیسی بیرت افروز شخصیت کے واقعات لکھ کر نئی نسل کو اسلام کی طرف راغب کر رہے ہیں۔"

شجاعت حسین گوجرانوالہ سے فرماتے ہیں "اس بار گمراہ، شکاری اور 'مجاہد' میں موازنہ کرنا نہایت مشکل ہے۔ تینوں قسط وار سلسلے بہترین ہیں لہٰذا ان کو جاری رکھا جائے۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں ایک تاریخی کہانی کا اضافہ کر دیں اور بارہ روپے سے اضافہ کر کے پندرہ روپے قیمت کر دیں۔ محسن رضا کی 'مردم شناس' بہت اچھی کہانی تھی۔ 'پسِ جرم' اچھی کہانی ہے ش۔م جمیل ہر بار خوب ہی لکھتے ہیں۔ اثر نعمانی کی ناسور کوئی خاص متاثر نہیں کر سکی۔ اگر کیپٹن شہزاد نہ ہوتا تو جبران ہوتا، بات تو ایک ہی ہے۔ یہ کردار بہت پرانے ہو چکے ہیں، اب تو کوئی نیا کردار ہونا چاہیے۔"

محمود حسن، کھڈا کراچی سے رقمطراز ہیں "اس دفعہ سرورق کچھ جاندار نہیں ہے۔ 'امام اعظمؒ' کا مضمون اپنے نقش ہمارے دل پر چھوڑ رہا ہے۔ 'ادھوری خبر' بیکار اور بے ربط کہانی تھی۔ 'ضرورت مند' ٹھیک رہی۔ 'شکاری' جاسوسی کی جان ہے اسے بلا شبہ بہترین کہانیوں کی صف میں آسانی کے ساتھ شامل کیا جا سکتا ہے۔ احمد اقبال اس پر محنت کر رہے ہیں۔ 'مردم شناس' بہترین کہانی تھی۔ 'مجاہد' ایک بہترین سلسلہ ہے علی یار خان صاحب پتا نہیں اس قبر سے کب تک نکلنے میں مکمل طور پر کامیاب ہوں گے۔ 'مہنگا سستا' پرانا پلاٹ اور پرانی کہانی، بہرحال گزارے کے لیے ٹھیک تھی۔ سرورق کی تینوں کہانیوں میں سے صبا احمد صاحبہ کی 'دورِ جنوں' بہترین کہانی تھی۔"

کاکول سے **جاوید عباسی** کچھ اس طرح گویا ہیں "بات کچھ یوں ہے کہ ستمبر کا مہینہ تھا۔ موسم قدرے خوشگوار اور تھوڑا سہانا تھا کہ ہماری نظر ایک حسین چہرے پر، چہرہ تو نہیں البتہ دو خوبصورت آنکھوں پر پڑی۔ ہم نے سمجھایا کہ اے دل صاحب، ذرا ٹھہر تو جا، ابھی تو صرف آنکھوں کا منظر دیکھا ہے ذرا جغرافیہ تو معلوم کرنے دو لیکن وہ نہیں مان رہا تھا۔ اسی کشمکش میں ایک صاحب علم، غالباً نام ہے ان کا...... خان آصف صاحب تشریف فرما ہو گئے اور کچھ دینی باتیں کرنے لگے تو ہمارا دل سہارے میں آگیا۔ ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ 'ادھوری خبر' آگئی۔ میں نے سوچا کہ ادھوری خبر ہی پڑھ لیں۔ کارٹر نامی آدمی نے بڑا پرانا انتقام لیا تھا۔ خیر ہم خبر پڑھ ہی رہے تھے کہ جیسے طوفان آگیا ہو۔ ہم بھی گھبرائے ہوئے باہر نکلے تو پتا چلا کہ یہ اپنے غلام جیلانی بطور گمراہ پچھلے ہی دنوں پاکستان آئے ہیں اور آج کچھ سیر و تفریح کے لیے اپنی بیگم کے ہمراہ نکلے ہیں۔ ہم بھی دوڑتے ہوئے ان کے قریب پہنچے کیونکہ ان کی زوجہ محترمہ کوئی میم تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ ان کے ہیرے جواہرات غائب ہو گئے ہیں۔ بڑا افسوس ہوا بہرحال ہم کر بھی کیا سکتے تھے، بس تسلی وغیرہ دی تو چل پڑے۔ راستے میں ایک 'ضرورت مند' آن ٹپکا۔ ہم نے جان چھڑانے والی بات کی اور اِدھر اُدھر ہو گئے۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچے تو چولہے میں اپنی آگ جل رہی تھی۔ گرمی ہونے کی وجہ سے آگ کے نزدیک نہ جا سکے۔ ادھر یہ خبر ہمارے لیے منتظر تھی کہ جناب علی یار خان صاحب کیمپ سے فرار ہو گئے ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی لیکن وہ اپنی منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا ہر مسلمان کو مجاہد بنائے۔ اب ہم کو پیاس لگ رہی ہے اور ہم پانی پی کر... سونے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

محمد آقبال فیصل آبادی، مسقط سے فرماتے ہیں "مدت سے جاسوسی ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ صدیوں کا بیٹا اور مفرور، اوّل سے آخر تک پڑھی اس راستے کے ہم دونوں بھائی ہم سفر تھے۔ وہ پچھلے سال ہم سے بچھڑ گیا اور میں اس سفر پر تنہا رہ گیا۔ امام اعظمؒ کے متعلق جو مضمون ہے..... وہ ایسا ہے جیسے ستاروں میں چمکتا ہوا چاند۔ خان آصف صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ بس ایک بات خان آصف صاحب سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ مضمون کے لیے جن کتابوں سے استفادہ کر رہے ہیں اگر ان کے نام بھی بطور حوالہ لکھ دیا کریں تو یہ ایک مستند حیثیت کا مضمون ہوگا۔ باقی 'شکاری' بھی خوب جا رہی ہے مگر مختصر ہوتی ہے۔ صفحوں میں اضافہ کریں۔ 'مجاہد' بھی بہت اچھا سلسلہ ہے مگر مجاہر کوتانے بانے میں اُلجھا کر فی الحال اس کے مقصد سے دور کر دیا ہے۔"

محمد اکرم جاوید، ہنوا ضلع بھکر۔ ملک محمد عثمان غنی، پنڈ دادن خان۔ محمد حفیظ اختر، پاک پتن۔ سیّد عباس علی شاہ گیلانی، رائے ونڈ۔ ذوالفقار احمد، منڈیالہ تیگہ۔ سکندر خان، اسلام آباد۔ ڈاکٹر عبد الشکور سونگی، اوباڑو۔ لوزنگ خان، حاکم لک۔

محسن بولا "یہ دروازہ توڑ کے نہیں جا سکتا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ایک بار پھر ہم نے فتح شیر کو گھسیٹا۔ اسے باتھ روم کے فرش پر لٹانے میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ کہیں اسے سردی نہ لگ جائے۔

"ایک رات میں نہیں مرتا۔" محسن بولا "زیادہ سے زیادہ نمونیا ہوگا، وہ ٹھیک کر لیں گے۔"

"اگر مر جائے گا تب بھی افسوس نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہر جرم کا اعتراف تو کر ہی چکا ہے۔"

"سزائے موت جرم کی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ ہے۔" محسن کے پیچھے سے رابعہ نے کہا۔

"لیکن اس کے اعمال کی مناسبت سے کم ہے۔" محسن نے کہا اور دروازے کو کنڈی لگا دی۔ ہم دونوں ایک ہی لحاف میں گھس گئے۔

"کتنے ٹیپ استعمال ہوئے؟" میں نے کہا "آواز صاف آ رہی تھی نا؟"

"بالکل صاف تھی۔ نوّے منٹ کا ایک کیسٹ تقریباً دونوں طرف سے بھر گیا۔" محسن نے کہا "مائیکرو فون بہت حسّاس ہے۔"

"ریڈیو کے اسپیکر کی آواز باہر تو نہیں سُنائی دیتی تھی؟"

"شیشے بند تھے۔" محسن بولا "اس کے علاوہ گلی میں سے دو ہی آدمی گزرے۔ انہیں بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ کار میں کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے ریڈیو سے ٹیپ کے لیے ڈائریکٹ کنکشن لے لیا تھا۔"

"تو نے بی ایس سی کیا ہے محسن۔ تھوڑا سا وائرلیس اور ٹیلی کمیونی کیشن کی طرف توجہ دے۔ تیرا تو فطری رجحان ہے اس طرف۔" میں نے کہا "ہمارے پاس دو طرفہ مواصلاتی رابطہ ہونا چاہیے۔"

"ہونا تو چاہیے۔ واکی ٹاکی بازار میں نہیں ملیں گے کیا، اسمگل کیسے ہوتے ہیں؟"

"معلوم کرنا پڑے گا۔ اگر ملے بھی تو کراچی میں ملیں گے۔" میں نے کہا۔

"کراچی تو جانا ہی ہے ہمیں۔ وہاں دیکھ لیں گے۔ ورنہ پھیر بنائیں گے۔" محسن بولا۔ رابعہ اپنے لحاف میں گھس کے سر نکالے ساری گفتگو سُن رہی تھی۔ الف دین تیسرے لحاف میں بے سُدھ پڑا چھت کو گھور رہا تھا اور شاید یہ غور کر رہا تھا کہ ایک دن میں تقدیر اسے کہاں لے آئی۔ اگر وہ میرے پیچھے نہ لگتا تو بائیس ہزار لے کر گھر لوٹ جاتا اور چین سے سوتا۔ اسے یہ سب معلوم ہی نہ ہوتا کہ طافو کیسے مرا اور مر کے کہاں پہنچا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔" رابعہ نے کہا "ٹیپ ریکـ مجھے دے دو۔"

"لیکن ہم کچھ آرام کرنا چاہتے ہیں۔" محسن نے کہا "ڈیڑھ گھنٹے کا ٹیپ ہے، صبح سن لینا۔"

"میں ایئر فون لگا کے سُنوں گی۔" وہ بولی "اسپیکر بند ر

محسن نے ٹیپ ریکارڈر اسے دے دیا۔ کمرے کی لائٹ جلتی رہی۔ پہلے محسن کو اور پھر مجھے نیند نے آ لیا۔ ریوالور جو میں رابعہ کو دیا تھا وہ اسی کے تکیے کے نیچے تھا۔ دوسرا محسن نے اپنے تکیے کے نیچے رکھا تھا چنانچہ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں زیادہ تھکا ہوا تھا اور نہ جانے کب تک سوتا رہتا اگر محسن جھنجوڑ کر بیدار نہ کرتا۔ "سکندر! وہ بھاگ گیا۔" وہ بولا۔

"کون، کون بھاگ گیا؟" میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ مجھے کھڑکی کے شیشوں سے دن کا اُجالا نظر آیا۔ پھر رابعہ اور محسن کے متوحش چہرے دکھائی دیے۔

"الف دین کمینہ۔" محسن نے کہا۔ "اور وہ ہمارے سب کرائے پر پانی پھیر گیا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔ "فتح شیر کو اپنے ساتھ لے گیا؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا اور محسن نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ اس کی کنڈی کھلی پڑی تھی۔ ہوا میں مجھے ایک مخصوص مہک کا احساس ہوا جو گزشتہ شب اس کمرے کی محبوس ہوا میں نہ تھی۔ یہ بند کمرے کے گرد و غبار کی بُو نہیں تھی۔ نئی دیواروں پر سیمنٹ کے تازہ پلستر کی بُو نہیں تھی اور کوئی ایسی بُو نہیں تھی جو ہمارے وجود کی خبر دیتی۔ یہ ایک دہشت زدہ کر دینے والی بُو تھی۔ میں اُٹھ کے باتھ روم کی طرف دوڑا اور دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹھٹک کر رُک گیا۔ باتھ روم کے فرش پر خون ہی خون تھا۔ خون کے چھینٹے اس کی دیواروں پر تھے اور خون سے اس کا فرش لال ہو رہا تھا۔ خون بہہ کے ڈرین میں چلا گیا تھا اور مجھے خون آلودہ ہاتھوں کے نشان باتھ روم کی دیواروں پر نظر آ رہے تھے۔ درمیان میں فتح شیر مرا پڑا تھا۔ الف دین نے اس کو چھری سے پے در پے وار کر کے مار ڈالا تھا اور پھر اس کی گردن کاٹ کے الگ کر دی تھی۔ فتح شیر کا سر اپنی کھلی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا اور میں نے گھبرا کے دروازہ بند کر دیا۔

شکار ڈھول کے اسرار شکنجے شکاری شکار
باقی واقعات آئندہ ماہ جاسوسی ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے



کشش

زن، زر اور زمین کے لیے قتل تو ازل سے ہوتے آئے ہیں مگر کسی انسان کا قتل جرم و سزا کی ایک تاریخ بن جاتا ہے. ایک زخمِ خوابیدہ کا قصہ، اک خواہشِ انتقام کا شاخسانہ، اک دلِ سوختہ کا فسانہ۔ کتنے ہی برسوں میں جا کر اس کہانی کے پیچ و خم کھُلے ـــ ایک ہار کی کہانی جس کی خاطر کسی نے جان ہار دی تھی۔

سنجیدہ کاظمی

شہنشاہ جہانگیر کے دور میں جب پہلے انگریز نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہ ہار اس وقت نواب شرافت اللہ کے خاندان کی ملکیت تھا۔ ہار اگرچہ زیادہ قیمتی نہیں تھا لیکن چونکہ یہ اس خاندان کو اس کی خدمات کے عوض شہنشاہ ہمایوں سے تحفے میں ملا تھا اس لیے اس کی حیثیت بڑھ گئی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ یہ ہار ایک ہندو راجا نے اپنی خوبصورت بیوی کے لیے بنوایا تھا۔ ہندو راجا سلطنتِ مغلیہ کا خیر خواہ تھا لیکن جب ہمایوں مائل بہ زوال ہوا تو اس راجا کی وفاداریوں نے بھی رُخ بدل لیا۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد جب ہمایوں دوبارہ تخت پر قابض ہوا تو ہندو راجا اپنی جان بچانے کے لیے ہمایوں کے قدموں میں گر پڑا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بے شمار ہیرے جواہرات نذر کیے جن میں یہ ہار بھی شامل تھا۔ ہمایوں نے یہ ہار اسی وقت اپنے ایک مصاحب صبغت اللہ کو بخش دیا جس نے آڑے وقت میں اس کی قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں۔ ہمایوں کے انتقال کے بعد جب شہنشاہ اکبر تخت نشین ہوا تو اس نے صبغت اللہ کے خاندان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ایک جاگیر بخش دی۔ صبغت اللہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اور پھر اس کا پوتا نواب شرافت اللہ اس جاگیر کا وارث بنا جسے جہانگیر کے دربار میں ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔

جہانگیر کے دور میں سرٹامس رو کی آمد نے گویا انگریزوں کے لیے ہندوستان کے دروازے کھول دیے تھے۔ وہ سلطنتِ مغلیہ کی وفاداریوں کا دم بھرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں پیر پھیلاتے رہے۔ ان کی ریشہ دوانیوں کے باعث بہت سے راجے مہاراجے اور نوابین شہنشاہ کی نظروں میں اپنا اعتماد کھونے لگے۔ نواب شرافت اللہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو رفتہ رفتہ جہانگیر سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔ اس کے انتقال کے بعد جاگیر چھن گئی اور تھوڑے ہی عرصے بعد یہ خاندان کسمپرسی کا شکار ہوگیا۔ تمام قیمتی اشیا بکنے کے بعد وہ ہار بھی اس خاندان کے قبضے سے نکل گیا۔ یہ بیش قیمت ہار ایک ہندو راجا کے ہاتھ سے ہوتا ہوا اودھ کے ایک نواب کے پاس پہنچ گیا جس نے اسے ایک انگریز لارڈ کے ہاتھ فروخت کر دیا جو اسے انگلستان لے گیا لیکن چند سال بعد ہی ایک مسلمان رئیس کے توسط سے دوبارہ ہندوستان واپس آگیا۔ مسلمان رئیس نے اسے انگلستان کے ایک جوہری سے خریدا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک یہ ہار اس رئیس کے خاندان کے قبضے میں رہا۔ اس وقت تک یہ ہار خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران یہ ہار چوری ہوگیا اور کئی سال تک اس کے بارے میں کچھ نہیں سُنا گیا۔ پھر یکایک لکھنؤ میں اس کے چرچے سُنائی دینے لگے۔ ان دنوں یہ ہار لکھنؤ کے ایک نواب میر حشمت علی کے قبضہ میں تھا جسے انہوں نے کلکتہ کے ایک جوہری سے برائے نام قیمت پر خریدا تھا۔ وہ جوہری یقیناً اس ہار کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ نہیں تھا بصورتِ دیگر یہ اس قدر آسانی سے میر حشمت علی کے ہاتھ نہ آتا۔ تقریباً سوا سو سال سے یہ تاریخی ہار اسی خاندان کی ملکیت چلا آرہا تھا اور میر خاندان کے موجودہ سربراہ میر آصف علی کو اس تاریخی ورثہ کی ملکیت پر بجا طور پر فخر تھا۔

لکھنؤ کے قیصر باغ میں واقع اس وسیع و عریض حویلی کی آبادی صرف چند افراد پر مشتمل تھی۔ میر آصف علی، ان کی بیگم عذرا اور تین چار ملازم۔ حویلی کی بیرونی دیواریں عدم توجہی کی وجہ سے خستہ حال ہو رہی تھیں جگہ جگہ سیاہ کائی جمی ہوئی نظر آرہی تھی جیسے برسوں سے چُونا وغیرہ نہ کیا گیا ہو۔ حویلی کی اندرونی حالت بھی کچھ اتنی اچھی نہیں تھی۔ در و دیوار سے برستی ہوئی حسرت مکینوں کی بے بسی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ وہ شان و شوکت برسوں پہلے رخصت ہوچکی تھی جو اس سے منسوب سمجھی جاتی تھی۔ میر آصف علی نجانے کس طرح اپنا بھرم قائم رکھے ہوئے تھا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ آمدنی محدود اور اخراجات لامحدود ہونے کے باعث حویلی میں بھرا ہوا تمام قیمتی ساز و سامان فروخت ہوچکا تھا۔ اسلاف کے زمانہ کے سونے چاندی کے وہ ظروف بھی بک چکے تھے جن میں کھانا کھاتے ہوئے حویلی کے مہمانوں پر ایک دبدبہ سا طاری رہتا تھا۔ ان دنوں میر آصف علی نہایت ناگفتہ بہ حالات سے دوچار تھا۔ گھر میں کوئی ایسی قیمتی چیز باقی نہیں رہی تھی جسے بیچ کر کچھ رقم حاصل کی جاسکتی۔ لے دے کر صرف وہ تاریخی ہار باقی رہ گیا تھا جس کی فروخت سے اتنی رقم تو مل سکتی تھی کہ وہ دو چار سال کے لیے فکرِ معاش سے بے نیاز ہو جائیں لیکن آصف علی مرتے دم تک اس ہار کو اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ ہار ہی سوسائٹی میں اس کی ساکھ کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ آصف علی کو یقین تھا کہ اگر یہ ہار اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو نوابین اور رؤسا کے طبقے میں اس کی حیثیت ختم ہو جائے گی اور عین ممکن تھا کہ اعلیٰ طبقے کا کوئی فرد اسے منہ لگانا بھی پسند نہ کرتا۔ گویا یہ تاریخی ہار ہی اس کے اور اونچے طبقے کے درمیان رابطہ قائم رکھے ہوئے تھا۔

میر آصف علی اور اس کی بیگم عذرا نے چھوٹی موٹی تقریبات میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ اگر کبھی جاتے بھی تو عذرا کوئی معمولی سا زیور پہن لیتی لیکن سال میں تین چار مرتبہ کسی نہ کسی ایسی تقریب میں ضرور جانا پڑتا جہاں اپنی امارت کی نمائش ضروری سمجھی جاتی۔ ایسے ہی موقعوں پر وہ ہار بیگم عذرا کے گلے کی زینت بنتا۔ تقریب میں موجود طبقۂ امرا کی خواتین سب کچھ بھول کر مکھیوں کی طرح بیگم عذرا کے گرد بھنبھنانے لگتیں۔ ان کی حسرت بھری نظریں بار بار جگمگاتے ہوئے ہار سے ٹکراتیں۔ انہیں بیگم عذرا کی قسمت پر رشک آتا۔ بعض خواتین تو ایسی بھی تھیں جو حسد و رقابت کی آگ میں جل بھُن کر کوئلہ ہو جاتیں۔ وہ اپنے شوہروں کو اکساتی رہتیں جو وقتاً فوقتاً میر آصف علی کو یہ ہار ان کے ہاتھ فروخت کر دینے کی ترغیب دلاتے رہتے۔ ایسے موقع پر آصف علی کا خون کھول اٹھتا۔ بعض نوابین و رؤسا کی پیشکش اگرچہ خاصی معقول ہوتی لیکن آصف علی بھوکا رہ کر بھی اس تاریخی ورثہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ بعض لوگوں کے بارے میں اسے یہ بھی شبہ تھا کہ وہ ہار حاصل کرنے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کریں گے۔ ایسی ہی کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے آصف علی اس ہار کو گھر پر رکھنے کے بجائے بنک کے لاکر میں محفوظ رکھتا تھا۔ ضرورت کے وقت ہار کو لاکر سے نکال لیا جاتا لیکن دوسرے ہی روز اسے پھر بنک میں پہنچا دیا جاتا۔

اس روز بھی کوئی ایسی ہی تقریب تھی۔ ہندوستان کے ایک سابق انگریز وائسرائے کی بیٹی ہندوستان کے غیر سرکاری دورے پر آئی ہوئی تھی۔ اسے دو دن کے لیے لکھنؤ میں رُکنا تھا۔ امرا اور نوابین نے اس کی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ ریذیڈنسی میں منعقد ہونے والی اس تقریب میں شرکت کے لیے میر آصف علی کو بھی دعوت نامہ مل چکا تھا۔ صبح بنک کھلتے ہی آصف علی وہ ہار لے آیا اور شام کو جب وہ ریذیڈنسی کے ہال میں داخل ہوئے تو وہاں پر موجود ہر شخص کی نظر بیگم عذرا کا طواف کرنے لگیں۔ خواتین کی نظریں تو گویا اس قیمتی ہار

Farrukh Malik

چمک کر رہ گئی تھیں جو برقی قمقموں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ ہار میں جڑے ہوئے بارہ ہیروں سے خارج ہونے والی رنگ برنگی شعاعیں آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھیں۔ یوں بھی حسن و رعنائی میں بیگم عذرا کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ عمر تیس سے کم ہی تھی۔ لانبا قد، گداز جسم، ہرن جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں اور لمبی سیاہ ریشمی زلفیں۔ اسے بلاشبہ ایک حسین ترین خاتون قرار دیا جاسکتا تھا لیکن جب وہ ہار پہن لیتی تو واقعی ہندوستان کی ملکہ نظر آتی۔ اس کے ملکوتی حسن اور اس خوبصورت ہار نے شہر کی بیشتر خواتین کو اس کا دشمن بنا دیا تھا۔ اس تقریب میں بھی وہ نہ صرف سب میں نمایاں نظر آ رہی تھی بلکہ ہر نگاہ کا مرکز بھی وہی تھی جس سے وہاں موجود دوسری خواتین احساس کمتری کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور جب مہمان خصوصی مسز لنڈا نے بیگم عذرا سے ہاتھ ملایا اور بہت دیر تک ہار کے بارے میں اس سے گفتگو کرتی رہی تو حاسد خواتین کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے۔

اس تقریب میں میر آصف علی کی خوشی بھی قابل دید تھی۔ وہ پہلے ہی اپنی بیگم کے حسن و جمال کا دیوانہ تھا۔ اس وقت ہر شخص سے عذرا کی تعریف سن کر اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا۔ اور پھر مسز لنڈا کو عذرا سے باتیں کرتے دیکھ کر تو اس کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ عذرا اس تقریب کی واحد عورت تھی جس سے مسز لنڈا نے نہ صرف اتنی بے تکلفی سے بات کی تھی بلکہ ہر آدھے گھنٹے بعد وہ کسی نہ کسی طرح مہمانوں کے جھرمٹ سے نکل کر اس کے پاس پہنچ جاتی اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگتی۔ آدھی رات کے وقت جب یہ تقریب اختتام کو پہنچی تو اس وقت بھی مسز لنڈا نے بڑی گرمجوشی سے ان سے رخصتی مصافحہ کیا تھا۔

قیصر باغ، ریذیڈنسی سے اگرچہ زیادہ دور نہیں تھا لیکن انہیں گھر پہنچتے ہوئے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ بیگم عذرا خوابگاہ میں داخل ہوتے ہی قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔ حالانکہ تقریب میں جانے سے پہلے بھی اس نے آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا تھا لیکن یہ اس کی عادت ثانیہ بن چکی تھی کہ ہر تقریب سے واپس آنے کے بعد بھی وہ دیر تک آئینے کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو دیکھتی رہتی۔ لیکن آج تو بات ہی کچھ اور تھی۔ محفل میں موجود ہر شخص بار بار اسی کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ کتنی حسین ہے؟ اس کا اندازہ غالباً اسے آج پہلی بار ہوا تھا۔ اس خیال سے ہی اس کے رخسار تمتما اٹھے۔ اس کی نظریں آئینے میں اپنے چہرے سے پھسلتی ہوئی گلے پر جم گئیں جہاں وہ ہار جگمگا رہا تھا۔ یہ ہار ہی اس کے حسن میں چار چاند لگا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کبھی اسے گلے سے نہ اتارے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے ہار گلے سے اتار کر قریب کھڑے ہوئے آصف علی کی طرف بڑھا دیا جو چمکتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہار ہاتھ میں آتے ہی آصف علی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے گہری نظروں سے ہار کو دیکھا پھر محتاط نگاہوں سے آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے پلنگ کی پائینتی کی طرف دیوار کے ساتھ استادہ الماری کھول کر ایک سرخ مخملی ڈبا نکال لیا۔ ہار کو ڈبے میں رکھنے کے بعد اس کے دونوں ڈھکنے دبائے اور الماری کے ایک خانے میں بکھرے ہوئے کپڑے باہر نکالنے لگا۔ مخملی ڈبے کو ایک کپڑے میں لپیٹنے کے بعد اسے الماری کے خانے میں رکھ کر اس طرح کپڑے ٹھونس دیے کہ یہاں اس قیمتی ہار کی موجودگی کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ الماری مقفل کر کے اس نے چابی جیب میں ڈالی اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے عذرا کی طرف دیکھتے ہوئے مسہری پر دراز ہو گیا۔ آصف علی کے خیال میں اس حویلی میں ہار کی حفاظت کے لیے اس الماری سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

آصف علی نے اس تاریخی ہار کو ایک رات سے زیادہ کبھی بھی اپنے گھر میں نہیں رکھا تھا۔ اگر بنک رات کو بھی کھلا کرتا تو وہ ہار کو چند گھنٹوں کے لیے بھی گھر میں رکھنے کا خطرہ مول نہ لیتا لیکن دشواری یہ تھی کہ بنک رات کو نہیں کھلتا تھا جس کی وجہ سے اسے یہ خطرہ مول لینا ہی پڑتا تھا۔ البتہ صبح ہوتے ہی وہ بلاتاخیر ہار کو بنک کے لاکر میں پہنچا دیتا۔ اس روز بھی وہ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا جبکہ عذرا بارہ دری میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ایک ملازمہ بھی تھی جو اس کے بال سنوارنے لگی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آہٹ پا کر عذرا نے گردن گھمائی۔ آصف علی تیز تیز قدموں سے بارہ دری کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر عذرا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ملازمہ کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خیریت! کیا بات ہے؟ یہ آپ کے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟" اس نے آصف علی کی طرف دیکھتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

"سوچا تھا اسے واپس چھوڑ آؤں۔" آصف علی نے کن انکھیوں سے ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ ہار کی طرف تھا۔ "لیکن .... لیکن وہ وہاں نہیں ہے۔ تم نے تو نہیں نکالا؟"

"میں نے!" عذرا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! آپ جانتے ہیں کہ آپ کی اجازت کے بغیر میں نے اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔"

"ممکن ہے اس خیال سے نکال لیا ہو کہ دوبارہ بنک میں رکھوانے سے پہلے ایک مرتبہ پہن کر دیکھ لو۔" آصف علی اسے ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا خوابگاہ کی طرف بڑھ گیا۔

عذرا بھی تیز تیز قدم اٹھانے کی کوشش کرتی ہوئی اس کے پیچھے خوابگاہ میں پہنچ گئی۔ اس کی کیفیت بھی اب آصف علی سے مختلف نہیں رہی تھی۔ خوابگاہ میں پہنچتے ہی وہ الماری میں بھرے ہوئے کپڑے نکال نکال کر باہر پھینکنے لگی۔ اس کے بعد اس نے الماری کے دوسرے خانے بھی دیکھ ڈالے لیکن سرخ مخملی ڈبا برآمد نہیں ہوا۔ وہ سراسیمہ نگاہوں سے آصف علی کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ کو یقین ہے کہ ڈبا یہیں رکھا تھا؟" اس نے خوفزدہ سے لہجے میں پوچھا۔

"اس میں شبہے کی کون سی بات ہے۔ ڈبا میں نے تمہارے سامنے یہاں کپڑوں کی تہہ میں رکھا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہاں غائب ہوگیا۔" آصف علی نے جواب دیا۔

"رات کو ریذیڈنسی میں غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ آپ نے بھی شراب پی تھی اور میرے خیال میں ضرورت سے زیادہ ہی چڑھا لی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہار والا ڈبا اس الماری میں رکھنے کے بعد آپ نے پھر نکال کر کہیں اور رکھ دیا ہو؟ یا ممکن ہے سوتے میں آپ کو خیال آیا ہو کہ ہار اس الماری میں محفوظ نہیں، اس خیال سے آپ نے اسے یہاں سے نکال لیا ہو۔"

"کیا لغویت ہے؟" آصف علی نے اسے جھڑک دیا۔ "تم جانتی ہو شراب نے مجھے کبھی زیر نہیں کیا۔ اور پھر ہار کو ہمیشہ اسی الماری میں رکھا جاتا ہے کیونکہ میرے خیال میں اس سے زیادہ محفوظ اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ڈبا میں نے اس خانے میں رکھا تھا اور اس کے بعد اسے نہیں نکالا۔"

"تو پھر حیرت ہے کہ وہ ڈبا یہاں سے کہاں غائب ہوگیا۔ وہ کوئی سوئی تو ہے نہیں کہ کسی کونے کھدرے میں گھس گئی ہو۔" عذرا نے کہتے ہوئے الماری کے دوسرے خانوں میں بھری ہوئی چیزیں بھی نکال کر فرش پر ڈھیر کر دیں۔ ایک ایک کپڑے کو جھاڑ پھٹک کر دیکھا گیا۔

عذرا نے صرف الماری کی تلاشی پر ہی اکتفا نہیں کیا، اس نے بستر کی چادر اور گدے تک اٹھا کر جھاڑ ڈالے۔ کمرے میں کوئی ایسی جگہ نظر انداز نہیں کی جہاں ڈبے کے حجم کی کوئی چیز رکھی یا چھپائی جا سکتی ہو لیکن مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ ان دونوں کی حالت دیدنی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ الماری میں رکھا ہوا مخملی ڈبا کہاں غائب ہوگیا۔ یہ تاریخی ورثہ تقریباً سوا سو سال سے ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا اور محض اس ہار کی بدولت ہی طبقۂ امراء میں ان کی ساکھ قائم تھی۔ اس ہار کے بغیر تو وہ ایک کوڑی کے نہیں تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر تک رنجیدہ سی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس طرح چپکے بیٹھے رہنے کے بجائے پولیس کو اطلاع دے دی جائے، ممکن ہے ہار کا کوئی سراغ مل جائے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی آصف علی اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگیا اور فون پر پولیس کو اس ہار کی گمشدگی کی اطلاع دینے لگا۔

انسپکٹر محمد خان کو حویلی پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس نے آتے ہی جرح شروع کر دی "ہار الماری میں بند کرنے کے بعد آپ دروازہ کھلا چھوڑ کر کمرے سے باہر تو نہیں گئے یا ممکن ہے کوئی چور کمرے میں داخل ہوا ہو اور گہری نیند کی وجہ سے آپ کو پتا نہ چل سکا ہو؟"

"پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ ہار کو الماری میں رکھنے کے بعد ہم نے کمرے سے باہر قدم نہیں رکھا۔" آصف علی نے جواب دیا۔ "رہا کسی چور کے کمرے میں داخل ہونے کا سوال تو یہ ناممکن ہے۔ میں بہت ہوشیار نیند سوتا ہوں۔ اگر بلی بھی قریب سے گزر جائے تو میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ مزید برآں کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ صبح جب ملازم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میں نے دروازہ خود اندر سے کھولا تھا۔"

"آپ کی بیگم؟" انسپکٹر محمد خان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ان کی خوابگاہ الگ ہے، رات ان کو اپنے کمرے سے رخصت کر کے میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔"

"اس کمرے میں آمد و رفت کا کوئی اور راستہ؟ غالباً وہ کھڑکی اس مقصد کے لیے کام میں آسکتی ہے۔" انسپکٹر نے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"کھڑکی بھی اندر سے بند تھی۔ جس رات ہار مجبوراً گھر میں رکھنا پڑتا ہے میں بہت محتاط رہتا ہوں اور سونے سے پہلے ہر چیز چیک کر لیتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو اپنے اطمینان کے لیے کھڑکی دیکھ سکتے ہیں۔"

وہ دونوں کھڑکی کے قریب آگئے۔ وہاں ایک پرانی بھاری الماری بھی اس طرح ایستادہ تھی کہ کھڑکی کا آدھا حصہ اس کے پیچھے دب گیا تھا اور الماری کو ہٹائے بغیر کھڑکی کو کھولنا ممکن نہیں تھا۔ کھڑکی اور الماری کا معائنہ کرنے کے بعد انسپکٹر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"اس راستے کسی کا کمرے میں داخل ہونا اگرچہ ناممکن نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔ بہرحال، اس کھڑکی کے دوسری طرف کیا ہے؟"

"عقبی آنگن ہے جہاں حویلی کے ملازمین کی رہائش کے لیے ایک دو منزلہ مکان بنا ہوا ہے۔ مکان کی دوسری منزل پر اس طرف ایک چھوٹی سی بالکونی ہے جس کے سامنے لوہے کی سلاخوں کا جنگلا لگا

ہوا ہے۔" آصف علی نے بتایا۔

انسپکٹر محمد خان چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے الماری ہٹوادی اور ایک بار پھر کھڑکی کا جائزہ لینے لگا جو واقعی اندر سے بند تھی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے رات کو کھڑکی کھلی رہ گئی ہو مگر آصف علی کو یاد نہ رہا ہو، چور اس کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوا اور ہار والا ڈبا لے کر چلتا بنا لیکن اپنے اس خیال کی اس نے خود ہی نفی کر دی۔ ایسی صورت میں کھڑکی کا اندر سے بند پایا جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ بیگم عذرا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیا گھر کے ملازموں کو علم تھا کہ گزشتہ شام تقریب میں جانے سے پہلے آپ نے وہ ہار پہنا تھا؟"

"جی ہاں!" بیگم عذرا نے جواب دیا۔ "تمام نوکروں کو معلوم ہے کہ جب بھی کسی خاص تقریب میں جانا ہوتا ہے، میں وہ تاریخی ہار ضرور پہنتی ہوں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس رات ہار گھر پہ ہی رہتا ہے لیکن یہ تو بہرحال وہ نہیں جانتے کہ ہار رکھا کہاں جاتا ہے اور میں آپ کو یہ بھی بتاتی چلوں کہ ہمارے تمام ملازمین برسوں پرانے اور قابلِ اعتماد ہیں۔ ان سے کسی ایسی حرکت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔"

"کسی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔" انسپکٹر کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔ "یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے کہ کوئی شخص ایسی حرکت کر سکتا ہے یا نہیں۔ ذرا سوچ کر جواب دیجیے کہ کیا آپ کے کسی ملازم یا ملازمہ کو یہ علم تھا کہ ہار اس الماری میں رکھا جاتا ہے؟"

"ایک مرتبہ شاید باتوں کی روانی میں، میں نے شمس النساء سے اس کا ذکر کر دیا تھا۔" عذرا نے کن اکھیوں سے آصف علی کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میرے خیال میں اس بیچاری پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔"

"یہ شمس النساء کون ہے؟" انسپکٹر نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ہماری ایک جاننے والی ہے۔" عذرا کے بجائے آصف علی نے جواب دیا۔ "غریب شوہر کے انتقال کے بعد بے آسرا ہو گئی تھی۔ نو دس سال کا ایک بیٹا بھی ہے۔ عذرا نے ترس کھا کر اسے اپنے ہاں رکھ لیا تھا۔ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹا دیتی ہے۔"

"اس کی رہائش حویلی میں ہے یا ملازمین کے لیے مخصوص اس مکان میں جس کا آپ نے ابھی ذکر کیا تھا؟"

"وہ ملازمین والے مکان کی دوسری منزل پر رہتی ہے۔ اس کے ایک کمرے کی کھڑکی میری اس خواب گاہ کی کھڑکی کے عین سامنے ہے۔ لیکن میں بھی عذرا کے اس بیان کی تائید کروں گا کہ شمس النساء پہ اس معاملے میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔" آصف علی نے جواب دیا۔

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے کہ کون مشکوک ہے اور کون نہیں۔ بہرحال، میں اس خاتون سے ملنا چاہتا ہوں۔" انسپکٹر نے کہا۔

وہ تینوں حویلی کے عقبی صحن میں اس مکان کی دوسری منزل پر پہنچ گئے جو ملازمین کی رہائش کے لیے مخصوص تھا۔ شمس النساء اس وقت مشین کے سامنے بیٹھی کپڑے سی رہی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ زیادہ سے زیادہ پینتیس سال تک کا لگایا جاسکتا تھا۔ اگر وہ خوشحال ہوتی تو یقیناً حسین ہوتی لیکن دکھ اور افلاس نے اس کا سارا حسن نچوڑ لیا تھا۔ اس کے قریب ہی نو دس سال کی عمر کا ایک بچہ فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا سلیٹ پر حساب کا کوئی سوال حل کر رہا تھا۔ اس کی کتابیں اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ شمس النساء آصف علی اور عذرا کے ساتھ پولیس انسپکٹر کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔ عذرا نے جب اسے بتایا کہ اس کا ہار کھو گیا ہے تو ایک لمحے کو وہ اس طرح بے حس و حرکت ہو کر رہ گئی جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

"آخری مرتبہ تم نے وہ ہار کب دیکھا تھا؟" انسپکٹر محمد خان نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"کل شام کو۔ جب بیگم صاحبہ تقریب میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ وہ ہار میں نے ہی ان کے گلے میں پہنایا تھا۔" شمس النساء نے جواب دیا۔

"تمہارے خیال میں یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں جناب! آج تک تو اس گھر میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ چور اس کمرے سے گزر کر میر آصف علی کی خوابگاہ تک پہنچا ہو؟" انسپکٹر نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہاں سے آصف علی کی خوابگاہ کی کھڑکی صاف نظر آرہی تھی۔

"گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس ہار کی گمشدگی یا چوری میں میرا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے؟" شمس النساء نے پہلی مرتبہ براہِ راست اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"نہیں خاتون! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں نے تو...."

"آپ کا مطلب جو کچھ بھی تھا، میں اسے بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔" شمس النساء نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس گھر نے مجھے ایسے وقت پہ سہارا دیا تھا جب میرا ہر سہارا چھن چکا تھا۔ میں نمک حرامی نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کو یہ شبہ ہے کہ کوئی اس کمرے سے گزر کر آصف علی صاحب کی خوابگاہ تک پہنچا ہو گا تو خود دیکھ لیجیے، دونوں کمروں کی کھڑکیوں کے درمیان تقریباً آٹھ فٹ کا فاصلہ ہے اور کم از کم کوئی انسان تو یہ خلا عبور

نہیں کرسکتا۔" شمس النساء نے کہتے ہوئے کھڑکی کھول دی۔

انسپکٹر محمد خان نے کھڑکی کے سامنے پہنچ کر باہر جھانکا۔ دوسری منزل پر واقع دونوں کھڑکیوں میں واقعی اتنا فاصلہ تھا کہ چھلانگ لگا کر بھی ایک طرف سے دوسری طرف نہیں پہنچا جا سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک شمس النساء سے ہار کے بارے میں مختلف نوعیت کے سوال کرتا رہا پھر وہ عذرا اور آصف علی کے ساتھ دوبارہ اس کی خوابگاہ میں پہنچ گیا۔

"مجھے آپ لوگوں کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ شمس النساء اس معاملے میں ملوث نہیں ہو سکتی۔ ہار کی چوری کا سُن کر اس نے جس کیفیت کا اظہار کیا تھا اس میں تصنع یا بناوٹ کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس اطلاع سے اسے یقیناً گہرا صدمہ پہنچا تھا۔"

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ بہت شریف اور دیانتدار عورت ہے۔ اسے یہاں رہتے ہوئے تقریباً چھ سال ہو چکے ہیں لیکن اس عرصے میں ہم نے اس میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جو قابلِ اعتراض ہو۔" عذرا نے جواب دیا۔

انسپکٹر محمد خان چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر حویلی کے تمام ملازموں کو بُلا کر ان سے پوچھ گچھ کی جانے لگی۔ لیکن کوئی ڈھنگ کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ انسپکٹر نے ملازمین سے فارغ ہو کر ایک بار پھر گہری نظروں سے الماری اور کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آ سکی۔ اس کی عقل حیران تھی کہ بند کمرے سے ہار والا ڈبا کہاں غائب ہو گیا۔ اگر وہ ضعیف العقیدہ ہوتا تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ کسی بھوت کا کارنامہ رہا ہو گا۔

کئی روز گزر گئے۔ انسپکٹر کوئی خاطر خواہ نتیجہ اخذ نہ کر سکا۔ یہ کیس ایک ایسے پیچیدہ معمے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جس کا بظاہر کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی تفتیش کی گاڑی ہر مرتبہ شمس النساء کے دروازے پر آ کر رک جاتی۔ عذرا اور آصف علی کے بعد ملازمین میں وہ واحد ہستی تھی جسے نہ صرف اس رات گھر میں ہار کی موجودگی کا علم تھا بلکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ہار کس جگہ رکھا جاتا ہے۔ یہی ایک دلیل تھی جو شمس النساء کو انسپکٹر محمد خان کی نظروں میں مشکوک بنا رہی تھی۔ اس نے شمس النساء کے بارے میں تحقیقات شروع کر دی لیکن کئی روز بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر یہ ہار اس نے خود نہیں چرایا تو اس جرم میں کسی کی شریک ضرور ہے لیکن یہاں بھی اسے اپنے سامنے بہت بڑا سوالیہ نشان نظر آ رہا تھا۔ اس کا وہ ساتھی کون ہو سکتا ہے؟ اس کے خلاف تحقیقات میں یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ آصف علی کی حویلی میں گزشتہ چھ سال کے قیام کے دوران وہ صرف تین چار مرتبہ حویلی سے باہر نکلی تھی۔ اس کے کسی سے تعلقات نہیں تھے اور نہ کبھی کوئی اس سے ملنے آیا تھا۔ ایسی صورت میں اس کے کسی ساتھی کا سراغ لگا لینا ممکن نہیں تھا۔ ایک مرتبہ انسپکٹر کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شمس النساء کو ہار کی چوری کے شبے میں گرفتار کر لیا جائے۔ ممکن ہے پولیس کے تشدد کے سامنے وہ سب کچھ اگل دے لیکن اس خیال کو بھی اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ عدالت کے سامنے یہ ثابت کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ بند کمرے میں کس طرح داخل ہوئی تھی، بالفرض وہ کسی طرح کمرے کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گئی تھی تو باہر آنے کے بعد اس نے دروازے کو اندر سے کس طرح بند کیا تھا۔

بند کمرے کے خیال سے دفعتاً انسپکٹر محمد خان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہار سرے سے چوری ہی نہیں ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ میر آصف علی مالی لحاظ سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اپنی نوابی ساکھ کو سہارا دینے کے لیے اسے روپے پیسے کی ضرورت تھی۔ آمدنی کے تمام ذرائع ختم ہو چکے تھے لیکن اخراجات جوں کے توں تھے۔ یہ تاریخی ہار ان کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھال سکتا تھا۔ اگر وہ کھُلے عام ہار فروخت کرتا تو رسوائی ہوتی۔ شرفا میں ان کا بھرم کھُل جاتا۔ اس طرح اونچے طبقے میں اسے وہ مقام نہ ملتا جو اَب تک بھی جیسے تیسے موجود تھا۔ چنانچہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اس نے نہایت رازداری کے ساتھ وہ ہار بیچ ڈالا اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے ہار کی گمشدگی کا یہ افسانہ گھڑ لیا۔

انسپکٹر محمد خان کو حیرت تھی کہ پہلے اس کے ذہن میں یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ اس نے مزید وقت برباد کرنے کے بجائے کیس فائل کر دیا۔

ہار کی گمشدگی کی خبر پورے شہر میں پھیل چکی تھی۔ عام طبقہ تو محض حیران تھا کہ کیا کسی کے قبضے میں کوئی ایسا قیمتی ہار بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے خیال میں نوادرات صرف عجائب گھروں میں رکھے جاتے تھے۔ یہ تو کوئی عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہنشاہ ہمایوں کا اپنے کسی مصاحب کو بخشا ہوا ہار کسی ایک عام آدمی کے قبضے میں ہو گا لیکن طبقۂ امراء میں لوگوں کو ایک دلچسپ موضوع ہاتھ آ گیا تھا۔ ہر محفل میں یہی تذکرہ ہوتا۔ آصف علی کے اس ہار کی وجہ سے جو لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا تھے انہیں بھی بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ حاسدوں اور رقیبوں میں خواتین کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ ہمدردی جتانے کے بہانے نواب آصف علی کی حویلی میں آتیں اور ان میاں بیوی کے زخموں پر نمک پاشی کر کے چلی جاتیں۔ جب تک ہار کی گمشدگی کی خبر دبی رہی تھی کوئی ہنگامہ نہیں اٹھا تھا لیکن یہ خبر عام ہوتے ہی وہ ایک ایسی مصیبت میں پھنس گئے تھے جس سے نجات کا

کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل چکی تھی۔ ستم یہ ہوا کہ آصف علی نے اس ہار کی ملکیت کی بنیاد پر جن لوگوں سے لمبی لمبی رقمیں قرض لے رکھی تھیں وہ بھی سامنے آ گئے اور اپنے قرضوں کی ادائیگی کا تقاضہ کرنے لگے۔ میر آصف علی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ کبھی وہ بیوی پر غصہ دکھاتا اور کبھی نوکروں کی شامت آجاتی لیکن نزلہ بالآخر بیچاری شمس النسار پر گرا۔ ایک روز صبح سویرے اس نے ماں بیٹے کو کھڑے کھڑے حویلی سے نکال دیا۔

شمس النسار اپنے بیٹے بدرالدین کا ہاتھ تھامے آنسو بہاتی خاموشی سے حویلی سے چلی گئی۔ اس نے بچے کی اسکول کی کتابوں کے سوا گھر سے ایک تنکا تک ساتھ نہیں لیا تھا۔ کندھے پر بستہ لٹکائے پھاٹک سے نکلتے ہوئے بدرالدین نے بڑی حسرت آمیز نگاہوں سے حویلی کی طرف دیکھا تھا۔

طوفان گزر چکا تھا۔ اس واقعے کو کئی ماہ بیت گئے۔ لوگ تقریباً بھول چکے تھے کہ ان کے شہر سے کوئی تاریخی ہار چوری ہوا تھا۔ میر آصف علی اور اس کی بیوی عذرا بھی اس واقعے کو بھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے ہر جگہ آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ زیادہ وقت حویلی کی چار دیواری ہی میں گزرتا۔ ایک روز ملازمہ نے جب ڈاک میں آنے والا ایک لفافہ عذرا کو دیا تو لفافے پر اپنا نام دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ آصف علی کے نام تو خطوط آتے ہی رہتے تھے لیکن عذرا کے نام پہلی مرتبہ کوئی خط آیا تھا جس پر اسے حیرت بھی تھی کہ اسے خط لکھنے والا کون ہوسکتا ہے۔ اس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور اندر سے برآمد ہونے والی تحریر پڑھنے لگی۔ وہ جیسے جیسے خط پڑھتی گئی اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا گیا۔

وہ شمس النسار کا خط تھا جس نے اس کے بھیجے ہوئے تحفے پر ان دونوں میاں بیوی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا کہ لفافے پر اگرچہ تحفہ بھیجنے والے کا نام نہیں تھا لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کسمپرسی کے عالم میں ان دونوں میاں بیوی کے علاوہ اس کا خیال رکھنے والا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ یوں بھی ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص اس کے پتے سے آگاہ نہیں تھا۔ آخر میں اس نے اپنی نادانستہ کوتاہیوں کی معافی بھی مانگی تھی۔

عذرا نے کئی مرتبہ اس خط کو پڑھا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ شمس النسار نے کسی تحفے کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا تھا مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب سے شمس النسار حویلی سے گئی تھی اس سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ تحفہ بھیجنا تو دور کی بات تھی۔ اس نے سوچا ممکن ہے آصف علی نے ازراہ ہمدردی کوئی چیز بھیج دی ہو۔ لیکن جب آصف علی سے بات ہوئی تو اس نے بھی صاف انکار کر دیا۔ اصل صورت حال معلوم کرنے کے لیے شمس النسار کو خط لکھا گیا جہاں سے فوراً ہی جواب آیا کہ چند روز پہلے اسے رجسٹری لفافے میں پانچ ہزار روپے کے نوٹ ملے تھے جن کے ساتھ کوئی تحریر نہیں تھی۔ لامحالہ اس نے یہی سمجھا کہ یہ رقم انہوں نے بھیجی ہوگی۔ اس نے وہ لفافہ بھی بھیج دیا تھا جس پر لکھنؤ کے خادم رسول ڈاکخانے کی مہر تھی۔ رجسٹری بھیجنے والے نے اپنا کوئی نام نہیں لکھا تھا۔ آصف علی یہ لفافہ لے کر انسپکٹر محمد خان کے پاس پہنچ گیا جس نے متعلقہ ڈاکخانے سے رابطہ قائم کرکے رجسٹری بھیجنے والے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ لفافے کی پشت پر بھیجنے والے کا جو پتا لکھا ہوا تھا وہ جعلی تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں تحقیقات میں وقت ضائع کرنا بیکار ہی ہوتا۔ اس طرح بات آئی گئی ہوگئی۔

اس بات کو ایک سال بیت گیا۔ آصف علی اور عذرا اس خط کو بھول چکے تھے لیکن ایک روز پھر عذرا کو شمس النسار کی طرف سے ایک اور خط ملا جس میں پانچ ہزار روپے بھیجنے کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ شمس النسار نے یہ بھی لکھا تھا کہ رقم کے ساتھ انہوں نے اگرچہ اپنا نام اور کوئی خط وغیرہ نہیں بھیجا تھا لیکن وہ سمجھ گئی کہ یہ خطیر رقم ان کے علاوہ اور کوئی نہیں بھیج سکتا۔

اس بار آصف علی نے پولیس سے رابطہ قائم کرنے کے بجائے اپنے طور پر تحقیقات کی کوشش کی لیکن رجسٹری بھیجنے والے کا ماچھی بھون کا وہ پتا بھی فرضی ثابت ہوا اور اس نے خط پھاڑ کر پھینک دیا۔

سال گزرتے رہے اور عذرا بیگم کو شمس النسار کی طرف سے شکریے کے خطوط ملتے رہے۔ کوئی پراسرار شخص ہر سال اسے پانچ ہزار کی رقم بھیج رہا تھا۔ دسویں سال تو پانچ کے بجائے دس ہزار کی رقم بھیجی گئی تھی اور اس مرتبہ بھیجنے والے نے لفافے کی پشت پر اپنا نام بھی لکھا تھا۔ پولیس فوراً اسکندر باغ کے اس پتے پر پہنچ گئی لیکن انکشاف ہوا کہ اس نام کا شخص آٹھ سال پہلے انتقال کر چکا ہے اور اس کے گھر والے مکان فروخت کر کے انہی دنوں بٹھور چلے گئے تھے۔ اس صورت حال نے پولیس کو چکرا کر رکھ دیا۔ پچھلے لفافوں کے پتوں پر از سر نو تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ وہ لوگ تھے جو کئی سال قبل انتقال کر چکے تھے۔

رجسٹری کے ذریعے شمس النسار کو رقوم عام طور پر جنوری کے پہلے ہفتے میں ملا کرتی تھیں۔ گویا اگلی رجسٹری بھیجے جانے میں ابھی پورا ایک سال باقی تھا۔ پولیس نے یہ طے کر لیا کہ محکمۂ ڈاک کے تعاون سے دسمبر کے آخری ہفتے سے شہر کے تمام ڈاکخانوں کی نگرانی شروع کر دی جائے اور ڈاکخانے کے کلرکوں کو ہدایت کر دی جائے کہ جو بھی شخص شمس النسار کے نام خط رجسٹری کرانے آئے اسے

Farrukh Malik

روک لیا جائے۔ لیکن چند ہی روز بعد شمس النساء کے انتقال کی خبر ملی اور اس طرح یہ راز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو کر رہ گیا کہ اسے لمبی لمبی رقمیں بھیجنے والا کون تھا۔

شمس النساء کو ملنے والی پُراسرار رقوم کے بارے میں اخبارات کو بھی اطلاع تھی۔ وہ رقوم بھیجنے والے اس پُراسرار شخص کا سلسلہ ہار کی گمشدگی والے معاملے سے ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شمس النساء کے انتقال کے بعد اخبارات کو ایک نیا موضوع ہاتھ آگیا اور اس کے ساتھ ہی گڑے مُردے اکھاڑے جانے لگے۔ بعض اخبارات نے ہار کی گمشدگی کے سلسلے میں طویل مضامین لکھے تھے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ آصف علی نے ہار فروخت نہیں کیا تھا بلکہ واقعی چوری ہوا تھا۔ اگر ہار فروخت کیا گیا ہوتا تو دس سال کے اس طویل عرصے میں کہیں نہ کہیں اس کے دیکھے جانے کی اطلاع ضرور ملتی۔ ظاہر ہے جس نے بھی ہار خریدا ہوگا اس نے اسے چھپا کر رکھنے کے لیے اتنی بڑی رقم خرچ نہیں کی ہوگی۔ کسی قیمتی چیز کے حصول کا مقصد اپنی امارت اور شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے جبکہ ابھی تک وہ ہار سامنے نہیں آیا تھا۔ اخبارات نے کھُل کر پولیس کے خلاف بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔

اخبارات میں اس ہنگامہ آرائی کا سب سے زیادہ فائدہ عذرا اور آصف علی کو پہنچا تھا۔ طبقۂ امرا میں ان کا وقار ایک بار پھر بحال ہونے لگا اور لوگ ان کے پاس آکر اظہارِ ہمدردی کرنے لگے۔ ان دنوں میر آصف علی کا ستارہ گردش سے نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ طویل عرصے سے اس کی اراضی کا مقدمہ چل رہا تھا۔ وہ حالات سے اس قدر دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ اسے اب اس معاملہ میں بھی کوئی مثبت امید باقی نہیں رہی تھی لیکن اس روز آخری پیشی پر عدالت نے جب اس کے حق میں فیصلہ دیا تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ زمینوں کا قبضہ ملتے ہی اس نے آدھی زمین بیچ دی اور اپنی حالت سدھارنے لگا۔

پیسہ ہاتھ آتے ہی آصف علی کے دماغ میں کیڑے سے کلبلانے لگے۔ تقریبات میں آمد و رفت کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ مقدمہ جیتنے کی خوشی میں اس نے اپنے احباب کو بھی ایک شاندار دعوت دے ڈالی۔ اس دعوت میں صرف ان امراء کو مدعو کیا گیا تھا جو واقعی اس کے خیر خواہ تھے۔ ان کی تعداد بھی بیس سے کم نہیں تھی اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں خواتین بھی تھیں جنہوں نے اپنی امارت کے اظہار کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ مہمانوں میں لکھنؤ کے ایک مجسٹریٹ اسد اللہ اور اشرف علی نام کا ایک نوجوان بھی شامل تھا۔ اس کی عمر چھبیس، ستائیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چھریرا بدن، دراز قد، خوبرو، مسکراتا ہوا چہرہ اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔

اشرف سے آصف علی کی ملاقات چند ماہ قبل فیض آباد میں ہوئی تھی۔ وہ اس نوجوان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ جب بھی کسی کام سے فیض آباد جاتا اس سے ملاقات ضرور کرتا۔ دو دن قبل اس نے خط کے ذریعے اشرف کو اس دعوت میں مدعو کیا تھا اور اس وقت وہ مرکزِ نگاہ بنا ہوا تھا۔

کھانے کے بعد چائے کا دَور چلا۔ اس دوران خواتین اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے بغیر یہ محفل سُونی سُونی سی لگنے لگی تھی پھر خواتین نے اس شرط پر انہیں اپنے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دی کہ ہر شخص اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سنائے گا۔ ان کی یہ شرط مان لی گئی اور سب سے پہلے مجسٹریٹ اسد اللہ نے اپنا ایک واقعہ سنایا۔ وہ چھٹیوں میں شکار کے لیے گئے تھے۔ رات انہیں جنگل میں واقع ایک ویران ڈاک بنگلے میں گزارنی پڑی جہاں ایک بھوت کا بھی بسیرا تھا۔ اسد اللہ کی باتوں سے کبھی تو محفل پر سناٹا طاری ہو جاتا اور کبھی کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ ان کے بعد اشرف علی نے اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنایا کہ کس طرح چھ سات سال کی عمر میں ان کے والد کی طلائی انگوٹھی چوری ہو گئی تھی پولیس بھی چور کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی لیکن اس بچے نے چٹکی بجاتے میں چور کو پکڑ لیا تھا۔ اشرف کے بعد نواب سلیم الدین کی باری آئی تو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے موضوع میر آصف علی کے گمشدہ ہار کی طرف موڑ دیا۔ لوگ انہیں بھول کر ہار کی اس پُراسرار گمشدگی کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے لگے۔ ہر شخص اس لاحاصل بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا لیکن اشرف خاموش بیٹھا ایک ایک کے چہرے کو تک رہا تھا۔

"ارے! آپ بھی تو کچھ بولیے۔ آپ نے تو چھ سات سال کی عمر میں اپنے والد کی گمشدہ انگوٹھی کا سراغ لگا لیا تھا۔ دیکھیں اس معاملے میں آپ کی ذہانت کیا کہتی ہے؟" عذرا نے اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو محض اتفاق تھا۔ لیکن اس معاملے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔" اشرف نے انکساری سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے بھئی! کچھ تو کہیے۔ واقعات سننے کے بعد آپ کی کوئی رائے تو ہوگی؟" اس مرتبہ اسد اللہ نے زبان کھولی۔

"میں اس کیس کی تفصیلات سے آگاہ نہیں ہوں۔ اگر آصف علی صاحب ایک بار پھر اس واقعہ کو دہرانا پسند فرمائیں تو ممکن ہے کوئی ایسا رخ میرے سامنے آجائے جس پر ابھی تک آپ لوگوں میں سے کسی کی نظر نہ پڑی ہو۔" اشرف نے کہا۔

سب لوگوں کی نظریں آصف علی کی طرف اٹھ گئیں جو آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھا غالباً بیتے ہوئے واقعات کی کڑیاں

Farrukh Malik

ہلا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور وہ اس تاریخی ہار کی گمشدگی کے بارے میں شروع سے اب تک کی تفصیلات دُہرانے لگا۔ اشرف علی بیچ میں اس سے کوئی سوال بھی کر ڈالتا جس کے جواب میں وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر رہ جاتا۔

"حیرت انگیز!" اس کے خاموش ہونے پر اشرف بولا۔ "یہ کیس اگرچہ انتہائی پیچیدہ ہے لیکن میرے خیال میں اس گتھی کو سلجھایا جاسکتا ہے۔"

"کیا واقعی؟" بہت سی نگاہیں بیک وقت اس کی طرف اُٹھ گئیں۔ کچھ لوگوں کی نگاہوں میں طنز تھا۔ ان کے خیال میں جب پولیس ہی ہار کا کوئی سراغ نہ لگا سکی تھی تو یہ اجنبی نوجوان کیا کر سکتا تھا جبکہ وہ اس ہار یا اس کے بارے میں حقائق سے پوری طرح آگاہ بھی نہیں تھا۔

"کیا.... کیا واقعی.... میرا ہار مل سکتا ہے؟" عذرا نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

"جی ہاں!" اشرف مسکرا دیا۔ "تفصیلات سُننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چور کے لیے کمرے میں آمد و رفت کے دو ہی راستے تھے۔ عقبی سمت والی کھڑکی اور دروازہ!"

"لیکن میں بتا چکا ہوں کہ اس رات سونے سے پہلے کھڑکی اور دروازہ میں نے خود بند کیا تھا۔" آصف علی نے اعتراض کیا۔

"میں نے آپ کی اس بات کو نظر انداز نہیں کیا۔" اشرف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور تھی۔ "چور کے لیے چونکہ دروازہ کھولنا ممکن نہیں تھا لہٰذا اس نے کھڑکی والا راستہ استعمال کیا' اس میں اسے قدرے سہولت رہی ہوگی۔ ایک منٹ! کوئی اعتراض کرنے سے پہلے مجھے بات پوری کر لینے دیجیے۔ خوابگاہ کی کھڑکی کے سامنے ملازمین کی رہائش والے مکان کی دوسری منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی اس کھڑکی کے عین سامنے کھلتی ہے۔ دونوں کھڑکیوں کے درمیان تقریباً آٹھ فٹ کا فاصلہ ہے اور یہ فاصلہ کسی تختے کے ذریعے عبور کیا جاسکتا ہے۔"

"چلیے مان لیا کہ چور اس کھڑکی تک پہنچ گیا لیکن یہ اعتراض اپنی جگہ موجود ہے کہ کھڑکی بند ہونے کے باوجود وہ اندر کیسے داخل ہوا۔؟" اس مرتبہ اسد اللہ نے سوال کیا۔

"آصف علی صاحب کے کہنے کے مطابق کھڑکی صبح کو بھی اندر سے بند پائی گئی تھی۔ لیکن یہ شاید اس بات کو بھول رہے ہیں کہ کھڑکی کے اندر کی سمت لکڑی کا ایک چھوٹا سا کھٹکا بھی لگا ہوا ہے جسے دائیں یا بائیں کسی بھی طرف گھما کر کھڑکی کو کھولا یا بند کیا جاسکتا ہے۔" اشرف نے آصف علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آصف علی اپنی جگہ سے اس طرح اُچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ چند لمحے متوحش نگاہوں سے اشرف کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ "تت.... تم کیا جانو کہ کھڑکی کے اندر ایسا کوئی کھٹکا بھی لگا ہوا ہے؟"

"یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔" اشرف مسکرایا۔ "اس حویلی کا تعلق جس دور سے ہے اس زمانے میں کھڑکیوں میں اندر کی طرف اس قسم کے گھومنے والے کھٹکے ضرور لگائے جاتے تھے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔" آصف علی نے گویا اعتراف کر لیا۔ "لیکن الجھن تو یہی ہے کہ اگر چور اس کھٹکے کے ذریعے کھڑکی کھول کر اندر آنے میں کامیاب ہوگیا تھا تو اسے باہر نکلنے کے بعد اندر سے بند کیسے کیا گیا؟"

"کھڑکی کو اندر سے بند کرنے کے لیے بھی وہی ٹیکنیک استعمال کی گئی تھی۔ اگر آپ لوگ اس وقت اس بات کو نظر انداز نہ کرتے تو معاملہ اتنا پیچیدہ ثابت نہ ہوتا۔" اشرف خاموش ہو کر باری باری سب کے چہرے دیکھنے لگا۔ ہر چہرے پر الجھن اور آنکھوں میں تجسس کے آثار نمایاں تھے۔ غالباً ہر شخص جلد سے جلد یہ جاننا چاہتا تھا کہ کھڑکی کھولی کیسے گئی اور پھر اسے بند کیسے کیا گیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اشرف علی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں کسی قسم کی سنسنی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں جو کچھ بھی بتا رہا ہوں اسے ذرا غور سے سنیے! اس قسم کے کھٹکے عام طور پر کسی تار سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ تار کے سرے پر ایک چھوٹا سا چھلا بھی ضرور لگا ہوتا ہے تاکہ اسے کھینچ کر کھٹکے کو حرکت دی جاسکے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ چور نے کسی باریک سی تار کا آنکڑا کھڑکی کی جھری میں داخل کرکے اس چھلے کو باہر کھینچ لیا جس سے کھٹکے میں حرکت پیدا ہوئی اور کھڑکی کھل گئی۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ کھڑکی میں کوئی جھری موجود ہو....؟" آصف علی نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ بات میں نے محض اندازے کی بنا پر کہی تھی لیکن آپ میری باتوں سے جس طرح جُز بُز ہو رہے ہیں اس سے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ چاہیں تو اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔" اشرف نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"میں اس حویلی کا مالک ہوں۔ اس کی ایک ایک اینٹ سے واقف ہوں لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں آپ کی طرح یقینی انداز اختیار نہیں کرسکتا۔ پولیس بھی مہینوں کی تفتیش کے بعد ایسا کوئی سراغ دریافت نہیں کرسکی تھی۔ وہ کمرہ گزشتہ دس سال سے بند پڑا ہے۔ وہاں کی ہر چیز جوں کی توں ہے۔ ہم ابھی

Farrukh Malik

آپ کے اندازوں کی تصدیق کر لیتے ہیں۔" آصف علی کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ مجسٹریٹ اسداللہ بھی اس کے ساتھ چل دیا۔

ان کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ آصف علی کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ بار بار سوالیہ نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ آصف علی کچھ دیر تک عجیب سی نگاہوں سے اشرف کی طرف دیکھتا رہا پھر مدھم لہجے میں گویا ہوا۔

" اشرف کا خیال درست ہے۔ اس نے کھڑکی کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے میں اس کی تصدیق کر چکا ہوں۔"

" حیرت انگیز!" نواب سلیم الدین بولے۔" آپ کی ذہانت کی داد دینا پڑتی ہے اشرف صاحب۔ لیکن یہ بات اب بھی صاف نہیں ہوئی کہ چور نے وہ ہار کس طرح اڑایا؟"

" سیدھی سی بات ہے۔" اشرف کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ آگئی۔" چور کو معلوم تھا کہ بیگم عذرا وہ تار یخی ہار پہن کر تقریب میں جائیں گی چنانچہ اس نے پہلے ہی سے اپنا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ آپ لوگوں کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ دونوں کھڑکیوں کے درمیان ایک لمبا تختہ رکھ چکا تھا جس پر چل کر نہایت آسانی سے ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی تک پہنچا جا سکتا تھا۔ آپ لوگوں کے آنے کی آواز سن کر وہ فوراً تختے کے ذریعے خوابگاہ کی کھڑکی کے قریب پہنچ گیا اور جھری سے جھانک کر دیکھتا رہا کہ ہار کہاں رکھا گیا تھا۔ پھر آصف علی جیسے ہی نیند کی آغوش میں پہنچے اس نے کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو کر الماری میں سے ہار والا ڈبا نکالا اور چلتا بنا۔"

" ایک منٹ!" مجسٹریٹ اسداللہ نے اسے ٹوک دیا۔" میں ابھی خوابگاہ کا جائزہ لے کر آ رہا ہوں۔ وہ کھڑکی آدھی سے زیادہ الماری کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ اسے پوری طرح نہیں کھولا جا سکتا۔ میرا مطلب ہے جس حد تک وہ کھڑکی کھلتی ہے اس میں سے کوئی آدمی اندر داخل نہیں ہو سکتا۔"

" میرا خیال ہے ابھی تک میں نے کسی آدمی کا حوالہ نہیں دیا۔" اشرف معنی خیز انداز میں مسکرایا۔" ہار چرانے والا کوئی آدمی نہیں بچہ تھا۔"

" بچہ!" سب لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

" آصف علی صاحب نے ہار کی گمشدگی کے واقعہ کی تفصیل بتلاتے ہوئے شمس النساء نامی عورت کے ایک بیٹے کا بھی ذکر کیا تھا۔" اشرف بولا۔

" وہ بدرو!" آصف علی چونک گیا۔" لیکن وہ دس سال کا وہ سیدھا سادہ سا لڑکا اتنا بڑا کام نہیں کر سکتا۔"

" آپ کا ہار اسی سیدھے سادے لڑکے نے چرایا تھا۔ اس نے آپ کی خوابگاہ کی کھڑکی تک پہنچنے کے لیے وہ تختہ استعمال کیا تھا جو برتن سجانے کے لیے شمس النساء کے ایک کمرے کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ایسے تختے عام طور پر لکڑی یا لوہے کی بریکٹوں پر لگائے جاتے ہیں۔ اگر شمس النساء کو نکالنے کے بعد آپ نے وہ مکان کسی اور ملازم کو نہیں دیا تھا تو آپ میرے اس اندازے کی تصدیق بھی کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اس کمرے میں آپ کو تار کا وہ ہک بھی مل جائے جس سے کھڑکی کا کھٹکا ہٹایا گیا تھا۔" اشرف نے کہا۔

آصف علی کوئی جواب دینے کے بجائے اشرف کو گھورتا ہوا اُٹھ گیا۔ اس کا ذہن بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ اشرف جس انداز سے یہ سب کچھ بتا رہا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے یہ محض قیاس آرائی نہیں، آنکھوں دیکھے واقعات دہرا رہا ہو۔ وہ ہال سے نکل کر عمارت کے اوپر سے گھومتا ہوا اس مکان میں پہنچ گیا جہاں اس زمانے میں شمس النساء کی رہائش تھی۔ شمس النساء کو حویلی سے نکالنے کے بعد مکان کا وہ حصہ مقفل کر دیا گیا تھا اور اسے کبھی کھولنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اندر داخل ہو کر اس نے بتی جلائی تو شمس النساء کا سامان جوں کا توں بکھرا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں برتن رکھنے کے لیے نیچے اوپر دو تختے لگے ہوئے تھے۔ ہر تختہ تقریباً دس فٹ لمبا تھا۔ ایک تختہ تو بریکٹ میں جڑا ہوا تھا لیکن دوسرا اکھڑا ہوا تھا۔ آصف علی کو یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ یہ تختہ اکھاڑنے کے بعد اسے دوبارہ بریکٹوں پر رکھ دیا گیا تھا۔ اسے تختے پر وہ ہک بھی نظر آ گیا جو ایک باریک تار کو موڑ کر بنایا گیا تھا۔

واپس آ کر اس نے مہمانوں کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے تار کا بنا ہوا وہ ہک بھی دکھایا جو تختے پر پڑا ہوا ملا تھا۔

" اشرف علی کی قیاس آرائی اگرچہ حیرت انگیز حد تک درست ہے لیکن میں اب بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ ہار کی چوری کا منصوبہ بدرو نے بنایا ہو گا۔ اس کے پیچھے یقیناً اس کی ماں کا ہاتھ رہا ہو گا۔"

" لیکن مجھے آپ کی رائے سے اختلاف ہے۔" اشرف بولا۔ " ماں کا اس منصوبے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ یہ سارا منصوبہ تو اس کمزور سے دس سالہ لڑکے کے ذہن کی پیداوار تھا۔"

" یہاں میں آپ سے اختلاف کروں گا اشرف علی۔" نواب سلیم الدین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔" وہ لڑکا یقیناً اپنی ماں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہائش پذیر تھا۔ میرے خیال میں یہ ممکن نہیں کہ ماں کے علم میں آئے بغیر کمسن لڑکے نے اتنا بڑا کام کر دکھایا ہو۔"

" درست کہا لیکن آصف علی صاحب اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جس رات یہ لوگ کسی تقریب سے واپس آتے تھے، شمس النساء وہ رات بیگم عذرا کے کمرے میں گزارتی تھیں۔ اس رات بھی لڑکے نے ماں کی عدم موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔"

Farrukh Malik

"لیکن — ہار کہاں گیا؟ پولیس نے شمس النساء کے کمرے کی تلاشی بھی لی تھی مگر ہار برآمد نہیں ہوا تھا۔" عذرا نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"پولیس سے کوتاہی اسی مرحلے پر ہوئی تھی۔ اگر لڑکے کے بستے کی تلاشی بھی لے لی جاتی تو ہار برآمد ہو جاتا۔" اشرف علی مسکرایا۔

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پُراسرار شخص کون تھا جو شمس النساء کو پُراسرار طریقے سے لمبی لمبی رقمیں بھیجا کرتا تھا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ شمس النساء ہی نے بیٹے کے ذریعے ہار چرایا ہو پھر یہاں سے جانے کے بعد اس نے ہار اپنے کسی اور شریکِ کار کے حوالے کر دیا جو وقتاً فوقتاً اسے رقمیں بھیجتا رہا۔" آصف علی نے کہا۔

"وہ پُراسرار شخص بھی اس کا بیٹا بدرو ہی تھا۔" اشرف علی مسکرایا۔ "حویلی سے نکالے جانے کے بعد شمس النساء بیٹے کو لے کر فیض آباد چلی گئی۔ وہ بیٹے کے پاس ہار کی موجودگی سے اب بھی بے خبر تھی۔ بدرو ذہین لڑکا تھا۔ وہ ہر سال لکھنؤ آتا اور ایک لالچی جوہری کے ہاتھ ہار کا ایک آدھ ہیرا فروخت کر دیتا۔ جوہری کو ہیرے بہت سستے مل رہے تھے اس لیے اس نے کسی سے تذکرہ تک نہیں کیا۔ بدرو ہیروں کی قیمت وصول کر کے رجسٹری کی صورت میں اپنی ماں کو بھیج دیتا۔ بے چاری شمس النساء آخر تک یہی سمجھتی رہی کہ ہر سال اسے یہ رقم آپ لوگ بھیجتے رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ آپ کو شکریے کا خط بھی لکھ دیتی۔ میری باتوں سے آپ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ محض قیاس آرائی ہے۔ بلکہ میں نے واقعات اس طرح بیان کیے ہیں جس طرح یہ آج سے دس سال پہلے پیش آئے تھے۔"

"ایسی صورت میں، میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تمہیں ان واقعات کا علم کیسے ہوا اور تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟" غصے کی شدت سے آصف علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"کچھ دیر پہلے آپ ہی نے تفصیل بتائی تھی۔" اشرف نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "لیکن آپ نے شمس النساء اور اس کے کمسن بیٹے کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ انہیں اس طرح گھر سے نکال دینا کسی طرح بھی قابلِ تعریف نہیں کہلا سکتا۔ وہ در در کی ٹھوکریں کھاتے فیض آباد پہنچ گئے۔ جہاں شمس النساء محنت مشقت کر کے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالتی اور اسے زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتی رہی۔ لڑکے کا خیال تھا کہ وہ اس ہار کو تاریخی ورثہ سمجھ کر اپنے پاس محفوظ رکھے گا۔ وہ بہت حساس لڑکا تھا۔ بہت کچھ جاننا تھا اور بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن جب شمس النساء مستقل طور پر بیمار رہنے لگی تو وہ ہار کے ہیرے نکال نکال کر فروخت کرتا رہا۔ شمس النساء مر گئی۔ بدرو جوان ہو گیا۔ ایک دن اس کے دل میں اس حویلی کو دیکھنے کی خواہش مچلی جہاں سے اس کی ماں کو چوری کے شبے میں دھکے دے

ایک کروڑ پتی کا چیک اس اعتراض کے ساتھ بینک سے واپس آ گیا کہ اکاؤنٹ میں رقم کم ہونے کی وجہ سے اس چیک پر درج بھاری رقم کی ادائیگی نہیں ہو سکتی۔ چیک سے منسلک بینک کی سلپ کے نیچے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ "آپ کا نہیں ہمارا اکاؤنٹ!"

کر نکالا گیا تھا۔ وہ لکھنؤ آیا۔ اس کے دل میں بہت کچھ تھا لیکن وہ حویلی کے مالکوں سے ملے بغیر واپس چلا گیا۔"

"میں نے پوچھا تھا تم کون ہو اور ان واقعات سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" آصف علی کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔

"معلوم ہوتا ہے میری باتیں آپ کو زیادہ پسند نہیں آئیں۔" اشرف معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "ہماری پہلی ملاقات کچھ عرصہ پہلے فیض آباد کے ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی اور اس کے بعد بھی ہم وقتاً فوقتاً ملتے رہے تھے۔"

"اس ڈرامے کا مقصد کیا ہے؟" آصف علی نے اسے گھورا۔

"ڈراما!" اشرف نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے مہمانوں کی طرف دیکھا جو گم صم سے بیٹھے باری باری ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "میں تو ابھی تک اس ڈرامے کا مقصد بھی نہیں سمجھ سکا جو آج سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے اس حویلی میں کھیلا گیا تھا۔"

"کیا بکتے ہو تم!" آصف علی دہاڑا۔ "اب .... اب میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ تم بدرو ہو.... شمس النساء کے بیٹے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ جن لوگوں کو مصیبت زدہ سمجھ کر سہارا دیا جائے گا وہی لوگ آستین کے سانپ ثابت ہوں گے۔ مجھے تمہاری جرأت پر حیرت ہے۔ یہاں آ کر کس ڈھٹائی سے اپنے جرم کا اعتراف کر رہے ہو۔ لیکن تمہیں شاید علم نہیں کہ مجرم خواہ کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ تم نے ان معززین اور ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں اپنے جرم کا اعتراف کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ مجسٹریٹ اسد اللہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں کسی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔"

"یہ آپ نے بالکل درست کہا کہ چالاک سے چالاک مجرم بھی قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔" اشرف کا لہجہ پُرسکون تھا۔ "لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ مجھے نہیں پہچان سکے۔ پہچان بھی کیسے سکتے ہیں جبکہ میری پیدائش کے بعد سے آپ نے مجھے دیکھا تک

Farrukh Malik

نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ میری اس حیثیت سے واقف ہی نہیں جس کا جاننا آپ کے لیے بہت ضروری تھا۔"

"تمہاری حیثیت واضح ہو چکی ہے۔ اب میں مزید کوئی بکواس نہیں سننا چاہتا۔" آصف علی غرّایا۔

"لیکن شاید یہ معزّزین میری بکواس سننا پسند کریں۔" اشرف نے مہمانوں کی طرف دیکھا۔ پھر آصف علی یا کسی اور کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ اپنے بڑے بھائی میر اوصاف علی کو یقیناً نہیں بھولے ہوں گے۔ وہ ذرا دل پھینک قسم کے واقع ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ شکار پر گئے تو ایک چھوٹے سے گاؤں میں قیام کے دوران ایک لڑکی کو پسند کرکے شادی کرلی اور اسی گاؤں میں سکونت اختیار کرلی۔ خدا نے انہیں ایک بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ بیٹا چند ماہ کا تھا کہ انہیں حویلی کی یاد ستانے لگی۔ اس وقت تک انہوں نے بیوی سے اپنی حیثیت کو چھپائے رکھا تھا لیکن پھر سب کچھ بتا دیا اور جائیداد کا بٹوارہ کرنے کے لیے حویلی واپس آگئے۔ اوصاف علی ساری جائیداد چھوڑ کر صرف وہ تاریخی ہار لینا چاہتے تھے۔ اِدھر ان کی طویل عرصے کی گمشدگی سے آپ نے انہیں مردہ تصوّر کرلیا تھا لیکن اس رات جب وہ اچانک ہی حویلی واپس پہنچ گئے اور ساری جائیداد سے دستبردار ہونے کا اعلان کرتے ہوئے ہار کا مطالبہ کیا تو بات نے جھگڑے کی صورت اختیار کرلی جس کے نتیجے میں میر اوصاف علی آپ کے ہاتھوں مارے گئے۔ آپ نے لاش کو حویلی ہی میں کسی جگہ دفن کردیا۔ یہ اتفاق تھا کہ کسی نے میر اوصاف علی کو حویلی میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا ورنہ یہ راز اُسی وقت کھل جاتا۔"

اشرف خاموش ہوکر ایک بار پھر مہمانوں کی طرف دیکھنے لگا جو پتھر کے بتوں کی طرح بے حس و حرکت اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی نظریں ایک بار پھر آصف علی کے چہرے پر جم گئیں جس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "شمس النسا ایک سال تک شوہر کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ نجانے اسے یہ یقین کیوں ہوتا جارہا تھا کہ اس کا شوہر اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ وہ اپنے بچے کو لیے شوہر کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی اور دردر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی لکھنؤ پہنچ گئی۔ اسی دوران اس کی ملاقات بیگم عذرا سے ہوئی اور شمس النسا اپنے آپ کو بیوہ اور بے سہارا ظاہر کرکے اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ عذرا ترس کھا کر اسے حویلی میں لے آئی اور اس طرح شمس النسا کو پتا چل گیا کہ اس کا شوہر اب واقعی اس دنیا میں نہیں رہا۔ شمس النسا کو یقین تھا کہ اسے محض اس ہار کی وجہ سے قتل کردیا گیا تھا جس کا وہ اکثر ذکر کیا کرتا تھا۔ وہ حویلی میں رہتے ہوئے اپنے شوہر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس کا راز کھل گیا تو اسے بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کمسن بیٹے کے ذہن میں بھی یہ بات بٹھانے کی کوشش کررہی تھی کہ اس کے باپ کو محض ایک ہار کے لیے قتل کیا گیا ہے اور اسے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینا ہے۔ بدرالدین بہت ذہین اور حسّاس بچہ تھا۔ اس کا ننھا سا ذہن ہر وقت مختلف منصوبے بناتا رہتا۔ اور پھر ایک روز موقع پاتے ہی اس نے ہار چرا لیا جس کی پاداش میں انہیں حویلی سے نکال دیا گیا۔ ہار کے بیشتر ہیرے اس نے بیمار ماں کا علاج کرانے کے لیے اونے پونے فروخت کر دیے لیکن اس کی منزل صرف ہار ہی نہیں تھی۔ وہ تو اپنے باپ کے قاتل کو اس کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا اور آج بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔"

"یہ بکواس ہے.... جھوٹ ہے۔" اس کے خاموش ہوتے ہی آصف علی چیخا۔ "تم مجھ پر الزام تراشی کرکے اپنے جرم کی سزا بھگتنے سے نہیں بچ سکتے۔"

"کیسا جرم؟" اشرف نے حیرت کا اظہار کیا۔

"آج سے دس سال پہلے تم نے میری خوابگاہ سے ہار چرایا تھا جس کا تم ان معززین کی موجودگی میں اعتراف کرچکے ہو۔" آصف علی [illegible]

"وہ ہار میرے باپ کی ملکیت تھا جسے میں نے اپنی تحویل میں لے کر کوئی جرم نہیں کیا تھا۔" اشرف نے جواب دیا۔ "بہرحال فیض آباد میں ڈاک سے آپ کا دعوت نامہ ملتے ہی میں لکھنؤ آگیا تھا۔ کل سارا دن اور آج سہ پہر تک بھی میں پولیس کے اعلیٰ افسران کے ساتھ موجود رہا تھا۔ پولیس کے دو انسپکٹر اس وقت بھی حویلی کے باہر موجود ہوں گے اور میرا خیال ہے وہ آپ سے پوچھ گچھ کے بعد آج رات ہی حویلی میں اس جگہ کی کھدائی شروع کردیں گے جہاں آپ نے میرے والد میر اوصاف علی کو قتل کرکے دفن کیا تھا۔" اشرف چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر جیب سے ایک ڈبیا نکالتے ہوئے بولا۔ "میں اب جارہا ہوں اور جانے سے پہلے ایک تحفہ بیگم عذرا کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ گمشدہ ہار ہے جو میرے باپ سمیت نہ جانے کتنے انسانوں کی موت کا باعث بنا ہوگا۔ لیکن اب اس ہار کے لیے کوئی قتل نہیں ہوگا۔ میرا باپ اس کا آخری شکار تھا۔" اس نے ڈبیا بیگم عذرا کی طرف اچھال دی۔

بیگم عذرا نے کپکپاتے ہاتھوں سے ڈبیا کھولی۔ اس میں ہیروں سے محروم شہنشاہ ہمایوں کا وہ ہار موجود تھا جو اس نے اپنے ایک مصاحب کو اس کی خدمات کے عوض تحفے میں دیا تھا لیکن اس وقت اس ہار کو دیکھ کر کسی بیوہ کی اُجڑی ہوئی مانگ کا تصوّر ذہن میں اُبھرتا تھا۔

نوآموز

عبدالقیوم شاد

کبھی کبھی کسی کُند ذہن کو بھی یُوں کوئی تدبیر سوجھ جاتی ہے جیسے اندھیرے میں بجلی کوند جائے۔ مگر انجام سے بے پرواہ ہو کر انجانے راستوں پر بڑھنے والے عموماً گھاٹے میں رہتے ہیں۔ زیاں کا سودا کرنے والے ایک سہل پسند کا قصّہ جس نے کسی کی محنت پر
—— شب خوں مار لیا تھا ——

وہ دن میں خواب دیکھنے والا ایک سہل پسند شخص تھا۔ اس کی زندگی کا زیادہ حصّہ یہ سوچتے ہوئے گزرتا تھا کہ مفت کا مال کہاں اور کہاں سے حاصل کیا جائے؟ اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ کبھی کبھی بے ایمانی اور چھوٹا موٹا فراڈ بھی کر لیتا تھا لیکن ڈرپوک ہونے کی وجہ سے کبھی اسے بڑا ہاتھ مارنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا پورا نام مارک کراسکن تھا لیکن دفتر میں سب کراس کہتے تھے۔ یہ لفظ احمق وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس لفظ کی برائی سے بخوبی آگاہ تھا مگر اس نے اپنی ناپسندیدگی کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر کوئی نام مشہور ہو جائے تو اسے ختم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے اگر اس نے اس نام پر ناگواری کا اظہار کیا تو لوگ اُسے زیادہ چڑائیں گے۔

ایک روز وہ اپنے خاص دوستوں پیٹر ہوپ اور شیری کے ہمراہ فرانسیسی ریستوران میں کافی پی رہا تھا۔ اس ریستوران کے ہر گوشے میں ایک آرٹسٹ کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ ان سب کے اُوپر برائے فروخت کی چٹ لگی ہوئی تھی۔ ریستوران کی انتظامیہ نے آرٹسٹ کی حوصلہ افزائی کے لیے ان تصویروں کو وہاں لگانے کی اجازت دے رکھی تھی۔

وہ اس آرٹسٹ سے کوئی کمیشن وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ انہیں صرف اتنا فائدہ تھا کہ ان تصویروں کی وجہ سے ریستوران کی آرائش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جب کوئی تصویر فروخت ہو جاتی تو آرٹسٹ اس کی جگہ پر نئی تصویر آویزاں کر دیتا تھا۔

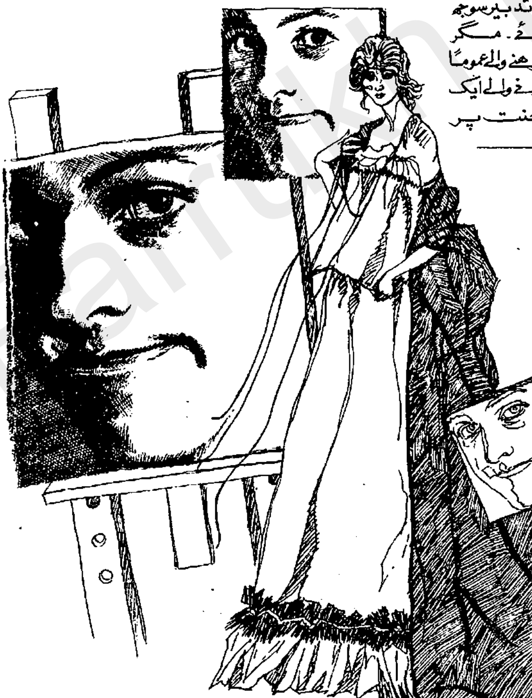
باتوں باتوں میں کراس نے کہا۔ "آج میں ایک انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔"

پیٹر نے پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم تو روز ہی ایک انکشاف کرتے ہو۔"

"جلدی سے بتا ڈالو۔" شیری نے کہا۔ "ورنہ میرے پیٹ میں بل پڑنا شروع ہو جائے گا۔ میں سسپنس کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔"

کراس ان کے مذاق سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "میں عنقریب آرٹسٹ کی حیثیت سے مشہور ہونے والا ہوں۔"

شیری نے اپنی خوبصورت سیاہ آنکھیں پھیلا کر اس کی طرف دیکھا۔ "آرٹسٹ! تمہارا مطلب ہے کہ تم پینٹنگز وغیرہ بنانے کا پروگرام بنا رہے ہو؟"



"ایسا کرو، پہلے رنگوں کی پہچان کا کورس کر لو۔" پیٹر نے کہا۔

"میں کام شروع کر چکا ہوں۔" کراس نے کہا۔ پھر ریستوران کی دیواروں کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "یہ سب میری پینٹنگز لگی ہوئی ہیں، میرے فن پارے۔"

"بہت خوب۔" پیٹر نے کہا۔ "آرٹسٹ بننے کا اس سے سہل طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

شیری اپنی کرسی سے اٹھی اور اس کاروباری کارڈ کو دیکھنے لگی جو پینٹنگ کے دائیں کونے میں پن سے لگا ہوا تھا۔ "اوہ، کتنے افسوس کی بات ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ کسی ای آر ونیکار نے اپنا کارڈ یہاں لگا رکھا ہے۔ نیچے فون نمبر بھی ہے۔ یہ شخص تمھاری محنت سے اپنا نام چمکانے کی فکر میں ہے۔"

"کوئی مسئلہ نہیں۔" کراس نے کہا اور جیب سے پین نکال کر کارڈ پر اپنا فون نمبر لکھ دیا۔ پھر ای آر ونیکار کے فون نمبر پر خطِ تنسیخ پھیرتا ہوا بولا۔ "غلطی ٹھیک ہو گئی — اب آرڈر براہِ راست میرے پاس آئیں گے۔"

پیٹر اور شیری نے اس بات کو مذاق سمجھ کر نظر انداز کر دیا لیکن کراس کے سہل پسند ذہن نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ چند روز بعد جب پیٹر اور شیری اس کے خستہ حال اپارٹمنٹ میں پہنچے تو اس کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ چند پینٹنگز رکھی تھیں اور وسط میں ایک ایزل استادہ تھا۔ کراس کے کپڑوں پر جا بجا پینٹ کے دھبے لگے ہوئے تھے، ایک برش اس کے کان میں اڑسا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

شیری نے آنکھیں جھپکائیں۔ "کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟"

کراس مسکرایا۔ "بعض حقیقتیں خواب سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ تمھیں یہ سن کر مزید حیرت ہوگی کہ مجھے آرڈر بھی ملنا شروع ہو گئے ہیں۔"

پیٹر دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی پینٹنگز کا جائزہ لیتا ہوا بولا۔ "کیا یہ تمھارے شاہکار ہیں؟"

"میرے ہی سمجھو۔" کراس نے کہا۔ "ویسے آپس کی بات یہ ہے کہ انہیں میں نے ایک مفلوک الحال آرٹسٹ سے خریدا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میری وجہ سے اس کی زندگی بچ گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آرٹسٹ میں سب سے بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ وہ کاروباری نہیں ہوتا۔ اپنے فن کو بیچنے کا فن نہیں جانتا، سوائے چند ایک کے۔ یہ مفلوک الحال آرٹسٹ ایک تنگ و تاریک اپارٹمنٹ میں رہتا ہے اور پینٹنگز بنا کر انہیں جمع کرتا رہتا ہے۔ تین روز پہلے جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ تین روز سے بھوکا تھا اور سیالِ سیاہ پر گزارا کر رہا تھا۔"

"سیالِ سیاہ!"

"میرا مطلب ہے کہ کافی پر۔ اگر اس کا اپارٹمنٹ دوسری منزل کے بجائے ساتویں یا آٹھویں منزل پر ہوتا تو وہ اب تک خودکشی کر چکا ہوتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دوسری منزل سے چھلانگ لگانے پر ہاتھ پیر تو ٹوٹ سکتے ہیں، پر موت واقع نہیں ہو سکتی اور نقاہت کی وجہ سے ساتویں یا آٹھویں منزل پر جانا اس کے لیے محال تھا۔ بہرحال، میں نے اسے اتنی رقم دے دی ہے کہ وہ بقائے زندگی کا سامان کر سکتا ہے۔"

"لیکن اس سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"تمھیں یقین نہیں آئے گا کہ میں ایک پینٹنگ فروخت بھی کر چکا ہوں۔"

"فروخت کر چکے ہو!"

"تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے فرانسیسی ریستوران میں آویزاں پینٹنگ پر اپنا فون نمبر نوٹ کر دیا تھا۔ اس کے تین روز بعد ایک خاتون نے مجھے فون کیا اور کہا کہ اس نے فرانسیسی ریستوران میں میری پینٹنگز دیکھی ہیں اور وہ میرا کوئی تازہ ترین فن پارہ خریدنا چاہتی ہے۔ میں سمجھا کہ وہ تم ہو۔" اس نے شیری کی طرف دیکھا۔ "اور آواز بدل کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے پینٹنگ پر اپنا فون نمبر لکھا تھا۔ میں نے خاتون کو دو روز بعد کا وقت دیا اور بھاگ دوڑ کر کے اس مفلوک الحال آرٹسٹ سے پینٹنگز خرید لیں۔"

شیری نے کہا۔ "کیا تم یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ وہ تمھارے پاس آئی اور تمھیں ای آر ونیکار سمجھ کر پینٹنگ خرید کر لے گئی؟"

"یہ امر واقع ہے اور معلوم ہے، میں نے وہ پینٹنگ ... میں فروخت کی ہے۔ خاتون خاصی مالدار تھی۔ اس نے ایک پینٹنگ کی جو قیمت ادا کی ہے وہ ان تمام پینٹنگز کی مجموعی قیمت سے زیادہ ہے۔"

"کراس تم پاگل ہو گئے ہو۔" شیری نے کہا۔ "یہ سراسر دھوکا ہے۔ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"دھوکا کیسے ہوا! میں نے چیز دکھا کر فروخت کی ہے۔ اس میں دھوکے کی کیا بات ہے؟"

"دھوکا یہ ہے کہ تم ای آر ونیکار کا نام استعمال کر رہے ہو اور جعلی آرٹسٹ بنے ہوئے ہو۔"

"یہ بھی ایک فن ہے۔" کراس نے کہا۔ "اور میں اس فن کو فروغ دینے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ آج کل دنیا میں ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔ جو یہ طریقے نہیں جانتا وہ ساتویں منزل سے چھلانگ لگانے کی باتیں سوچتا ہے۔ بیٹھو، آج میں تمھیں پہلی کامیابی کی خوشی میں کافی پلاتا ہوں۔"

کافی کے دوران تینوں زیادہ تر پینٹنگز کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر شیری رخصت ہو گئی اور پیٹر، کراس کے "فن" میں حصے دار بننے کی باتیں کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد کراس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا "ایک بات تو میں تمھیں بتانا بھول ہی گیا۔ آج ایک اور گاہک آنے والا ہے۔ اس نے کل فون کیا تھا۔"

پیٹر نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں "واقعی؟"

"یہ صرف ایک فون نمبر کا کمال ہے" کراس نے کہا۔

"اگر ہم اس کام کو وسیع پیمانے پر شروع کر دیں تو بہت فائدہ ہو گا۔" پیٹر نے کہا۔ اس نے خود کو کراس کا پارٹنر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ شہر کے دس بیس اعلیٰ قسم کے ریستورانوں میں اس مفلوک الحال آرٹسٹ کی پینٹنگز آویزاں کر دیتے ہیں اور خوبصورت کاروباری کارڈ چھپوا کر ہر پینٹنگ کے کونے پر لگا دیتے ہیں۔"

"اسکیم تو اچھی ہے۔ مگر اس کے لیے سرمائے کی ضرورت ہو گی۔"

"فی الحال تھوڑی رقم سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔" پیٹر نے کہا۔ "کچھ رقم میں ڈال دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ چند مہینوں کے اندر ہم ایک آرٹ گیلری کے مالک بن جائیں گے۔ تم ایسا کرو کہ اس مفلوک الحال آرٹسٹ کو کچھ اور رقم دے دو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سچ مچ ساتویں منزل سے چھلانگ لگا دے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں۔"

"تم ان فن کاروں کی ذہنیت نہیں سمجھتے۔" کراس نے کہا۔ "یہ تھوڑے سے بھوکے رہیں تو اچھا کام کرتے ہیں اور مرہونِ منت بھی رہتے ہیں۔ اگر ان کی جیب میں زیادہ پیسہ آ جائے تو انہیں ہرا ہرا سوجھنے لگتا ہے۔"

"پھر بھی اسے مرنا نہیں چاہیے۔"

"تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ یہ شہر ایسے فن کاروں کے معاملے میں خاصا زرخیز ہے۔ ہر کھنڈر میں تمھیں ایک فنکار مل جائے گا۔ تلاش کرنے کا فن آنا چاہیے۔ یعنی آدمی کا ماہرِ آثارِ قدیمہ ہونا شرط ہے۔ دو چار آرٹسٹوں کے مرنے سے آرٹ گیلریاں بند نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ ایک اور راز کی بات سنو۔ جب آرٹسٹ مرحوم ہو جاتا ہے تو اس کے فن کی قیمت ایک دم آسمان کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔"

اسی لمحے کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"آ گیا۔" کراس نے کہا اور جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر ایک پستہ قد اور دبلا پتلا شخص کھڑا تھا۔ اس نے تنکوں کا ہیٹ اور ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ کوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس جسم نے کسی زمانے میں اچھے دن دیکھے تھے۔

اس نے سوالیہ نظروں سے کراس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مسٹر میکار؟"

"یہ میں ہوں۔" کراس نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "اندر آ جاؤ، غالباً تم کوئی پینٹنگ خریدنا چاہتے ہو۔"

"میں نے فرانسیسی ریستوران میں تمھاری تصاویر دیکھی ہیں۔" نووارد نے کہا۔ "کیا وہ سب کی سب برائے فروخت ہیں؟"

"وہ بھی اور یہ سب بھی۔" کراس نے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی پینٹنگز کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرا نیا شاہکار ہے۔ اس میں ایک قدیم گرجے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔"

نووارد ملاقاتی نے مذکورہ پینٹنگ اٹھائی اور کھڑکی کے قریب جا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ غالباً وہ اطمینان سے فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

پیٹر نے پوچھا۔ "کیا تم اس شہر میں نئے ہو؟"

"نہیں۔" ملاقاتی نے تصویر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ "مجھے یہاں آئے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔" اس نے پینٹنگ واپس رکھ دی اور کہا۔ "یہ اس اسٹائل کی پینٹنگ نہیں ہے جو ریستوران میں لگی ہوئی ہیں۔"

کراس نے اندازہ لگایا کہ نووارد آرٹ کی شناخت میں ماہر تھا۔ لہٰذا اس سے محتاط انداز میں بات کرنا ضروری تھا۔ اس نے کہا۔ "میں ہمیشہ مختلف اسٹائل استعمال کرتا ہوں۔ اس سے انسان یکسانیت کا شکار نہیں ہوتا۔"

ملاقاتی نے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے اور بولا۔ "میں اپنی معلومات میں اضافے کے لیے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ ریستوران میں تمھاری جو تصویریں لگی ہوئی ہیں ان میں تم نے کون سا میٹیریل استعمال کیا ہے؟"

کراس نے آنکھیں جھپکائیں۔ "کیا مطلب؟"

"کیا وہ آئل ہیں یا ٹمپیرا؟ یا واٹر کلر؟ ان میں تم نے کون سی چیز استعمال کی ہے؟"

"آں ہاں . . . مختلف قسم کی چیزیں . . . زیادہ تر آئل پینٹنگز ہیں۔"

پیٹر، کراس کی مدد کرتا ہوا بولا۔ "دراصل یہ ایک قسم کا بزنس سیکرٹ ہے۔ کوئی آرٹسٹ میٹیریل اور کلر اسکیم کے بارے میں بتانا پسند نہیں کرتا۔"

ملاقاتی نے ہولے سے کہا۔ "حیرت انگیز!"

"دو تصویریں؟"

"مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ تم خود کو آرٹسٹ ظاہر کر رہے ہو۔" ملاقاتی نے کہا۔ "حالانکہ تم آرٹ کی اے بی سی بھی نہیں جانتے۔"

کراس کے چہرے پر ہلکا سا رنگ آ کر چلا گیا۔ "میں تمھیں تصویر خریدنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ تم بخوشی واپس جا سکتے ہو۔ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔"

"تم خاصے مضبوط اعصاب کے مالک معلوم ہوتے ہو۔" ملاقاتی

نے کہا۔" ایک آرٹسٹ برسوں کی محنت کے بعد اپنے نام اور کام کو منظرِ عام پر لانے کے قابل ہوتا ہے اور تم۔" اس نے انگلی سے کراس کی طرف اشارہ کیا۔" قزاق بن کر راتوں رات اس کی محنت سے دولت مند بننا چاہتے ہو۔ تف ہے تمھاری شکل پر۔"

کراس نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا۔ اس نے سوچا کہ اس کام میں وقتاً فوقتاً ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ لہٰذا تحمل سے کام لینا ضروری تھا۔" میں دراصل آرٹسٹ کا ایجنٹ ہوں۔" اس نے کہا۔" میں آرٹ کی باریکیاں نہیں جانتا۔ صرف پینٹنگز فروخت کرتا ہوں اور اپنا کمیشن وصول کرتا ہوں۔"

" خوب! تم وینکار کے ایجنٹ ہو؟ یہ نئی کہانی غالباً ابھی تمھارے ذہن میں آئی ہے۔"

" اس سے قبل میں نے تمھیں کوئی کہانی نہیں سنائی۔"

" تم دوبارہ جھوٹ بول رہے ہو۔" ملاقاتی نے کہا۔" اتفاق سے میں ای آر وینکار کو جانتا ہوں۔ اس کا کوئی ایجنٹ نہیں ہے۔"

کراس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس نے ملاقاتی کا بازو پکڑ لیا اور بولا۔" نکل جاؤ یہاں سے تمھارے ساتھ کاروبار نہیں ہو سکتا۔"

ملاقاتی اپنا بازو چھڑاتا ہوا بولا۔" تم دونوں بہت بڑی مصیبت میں پھنس سکتے ہو۔ غالباً تم نے وینکار کو نہیں دیکھا۔ وہ خاصا لحیم شحیم آدمی ہے اور اگر غصے میں آجائے تو بالکل وحشی بن جاتا ہے۔ جب میں اسے بتاؤں گا کہ تم کس طرح اس کی شہرت سے فائدہ اٹھا رہے ہو تو وہ یہاں آکر ہر چیز کو تہس نہس کر دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تم دونوں کو اسپتال جانے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے۔"

کراس غصے سے کھولنے لگا۔ اس نے دوبارہ ملاقاتی کا بازو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" تم ابھی جاؤ اور اس لکڑ ہارے کو ہمارے بارے میں بتا دو۔ پیٹر، ادھر آؤ ذرا میری مدد کرو۔ میں اس کمینے شخص کو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔"

" میرا خیال ہے کہ اب یہ خود بھی یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرے گا۔" پیٹر نے کہا۔

" نہیں، میں اسے دھکے دے کر نکالنا چاہتا ہوں۔" کراس نے کہا۔" ادھر سے اس کا بازو پکڑو۔"

بعض اوقات شکست اور ندامت کا احساس انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ کراس اپنے ملاقاتی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اسے پرے دھکیل رہا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر پیٹر بھی اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ انہوں نے دونوں طرف سے اس کے بازو پکڑ لیے اور اسے کھینچتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف لے چلے۔ ملاقاتی ان کی گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر انہوں نے اسے جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ ملاقاتی چونکہ مسلسل ہاتھ پیر چلا رہا تھا اس لیے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ ان سیڑھیوں کے کناروں پر لوہے کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ملاقاتی، ہالی ووڈ کے کسی اسٹنٹ مین کی طرح لڑھکتا ہوا گیا تھا۔ اس کا تنکوں والا ہیٹ اوپر ہی رہ گیا تھا۔

کراس نے ہیٹ کو ٹھوکر مار کر نیچے پھینک دیا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا بولا۔" دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرنا۔"

ہیٹ ملاقاتی کے اوپر جا کر گرا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور سیڑھیوں پر ہلکی سی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ پیٹر اور کراس چند لمحوں تک اوپر کھڑے ملاقاتی کے اٹھنے کا انتظار کرتے رہے مگر اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ جہاں گرا تھا وہیں پڑا تھا۔

" شاید بے ہوش ہو گیا ہے۔" پیٹر نے کہا۔

" مکر کر رہا ہے۔" کراس نے کہا۔ پھر نیچے کی طرف آواز لگائی۔" اے مسٹر، یہاں ڈراما نہیں کرو۔ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

پیٹر نے فکر مندی سے کہا۔" نیچے جا کر دیکھنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے کوئی مہلک چوٹ آگئی ہے۔"

کراس بھی پریشان نظر آنے لگا۔ دونوں جلدی سے نیچے پہنچے اور ملاقاتی کو سیدھا کر کے اس کا معائنہ کرنے لگے۔ کراس نے اس کے دل پہ ہاتھ رکھ کر دیکھا، نبض دیکھی، پلکوں کو ہٹا کر کے دیکھا۔ پھر بولا" معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ ہو گیا ہے۔"

پیٹر نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بولا۔" اسے جلدی سے اوپر لے چلو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی آجائے۔ پتا نہیں یہ زندہ ہے یا مر گیا۔"

انہوں نے اسے اٹھا کر سیدھا کیا اور اس کے بازوؤں کو اپنے کندھوں پر ڈال کر اوپر پہنچ گئے۔" شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔" کراس نے کہا اور بے حرکت ملاقاتی کا معائنہ کرنے لگا۔

پیٹر نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور احتیاط کے ساتھ ملاقاتی کا معائنہ کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے سر اٹھایا اور پریشانی سے بولا۔" یہ مر چکا ہے۔"

کراس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بولا۔" ذرا اچھی طرح دیکھو۔"

" تم خود دیکھ لو۔" پیٹر نے کہا۔" اس میں زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں رہی۔"

" شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔" کراس نے دوبارہ کہا۔" اس کم بخت کو یہیں آکر مرنا تھا۔"

" یہ قتل کا کیس ہے کراس! ہمیں عمر قید بھی ہو سکتی ہے۔"

" لیکن ہم پولیس کو پتا نہیں چلنے دیں گے۔"

" کیا تم لاش کو ٹھکانے لگانے کی بات کر رہے ہو؟"

" ظاہر ہے، ہم اسے اپنے اپارٹمنٹ میں تو نہیں رکھ سکتے۔"

"لیکن کیسے؟" پیٹر نے پوچھا۔ "لاش کو کیسے ٹھکانے لگاؤ گے؟ میرا تو خیال ہے کہ پولیس کو اطلاع کر دینی چاہیے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا سیڑھیوں سے پیر پھسل گیا تھا۔"

"نہیں نہیں، ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے۔" کراس نے کہا۔ "پولیس ایک ہزار سوالات کرے گی۔ ان کے لیے معاملے کی تہہ تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ذرا تاریکی ہو جانے دو پھر ہم اسے یونیورسٹی کیمپس میں ڈال آئیں گے۔ صبح جب لاش دریافت ہوگی تو پولیس یہی سمجھے گی کہ کسی اُچکے نے اسے لوٹنے کے لیے قتل کر دیا ہے۔"

"شیری نے ٹھیک ہی کہا تھا۔" پیٹر نے کہا۔ "تم واقعی پاگل ہو گئے ہو۔ تم نے آرٹسٹ بننے کے چکر میں ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔"

"اس احمق نے ہمیں آرٹ کے اسرار و رموز سمجھانے شروع کر دیے تھے۔" کراس نے کہا۔ "بلکہ دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں۔"

"یہ اس کا نہیں تمہارا قصور ہے تمہیں آرٹسٹ بننے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

"اس کی موت میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔" کراس نے کہا۔ "ہم اسے نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اور ڈیئر، یہ مت بھولو کہ اصل دھکا تمہاری طرف سے دیا گیا تھا۔ میں نے تو اسے ایسے ہی چھوڑ دیا تھا۔"

پیٹر کو اس کی بات پر غصہ تو بہت آیا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ان میں جھگڑا ہو گیا تو پھر دونوں کی خیر نہیں۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے کہا۔ "اصل قصور میرا ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کیا کیا جائے۔ ذرا سی غلطی ہمیں بہت بڑی مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔"

کراس چونک کر بولا۔ "حیرت ہے، ہمیں ابھی تک یہ بھی نہیں پتا کہ یہ ہے کون۔ اس کی جیبیں تو دیکھو، شاید کوئی دولت ہی ہاتھ آجائے۔"

اس کی جیبوں سے ایک بٹوا، چابیوں کا گچھا اور تھوڑی سی ریزگاری برآمد ہوئی۔ پیٹر نے بٹوا کھول کر دیکھا۔ اس میں سے صرف چھیالیس ڈالر برآمد ہوئے۔ اس کے علاوہ بٹوے میں کریڈٹ کارڈ، ملاقاتی کارڈ اور ایک شناختی کارڈ تھا۔ جب پیٹر نے شناختی کارڈ دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"جانتے ہو یہ کون ہے؟" اس نے کہا۔ "یہ بذاتِ خود ای آر ونیکار ہے۔ ایڈگر آر ونیکار!"

"اوہ، میرے خدا! اس احمق کو چاہیے تھا کہ آتے ہی اپنا تعارف کرا دیتا۔"

"تمہارے کام کی بنیاد ہی غلط تھی۔" پیٹر نے کہا۔ "تمہیں کم از کم یہ تو سوچ لینا چاہیے تھا کہ یہ شخص ہفتے میں ایک آدھ بار ضرور اپنی پینٹنگز چیک کرتا ہوگا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ تم اس کی برسوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی پینٹنگ پر اپنا فون نمبر لکھنا سب سے بڑی غلطی تھی۔"

"فلاسفر نہیں بنو۔" کراس نے کہا۔ "اس کی موت اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔ ایسا کرو یہ ڈالر مجھے دو اور بٹوا اس کی جیب میں ڈال دو۔ کیمپس میں جا کر یہ بٹوا اس کی لاش کے پاس پھینک دیں گے۔"

پیٹر نے نوٹ کراس کو دے دیے اور بٹوا متوفی کی جیب میں ڈال دیا۔

"ایک منٹ۔" کراس نے کہا۔ "بٹوا نکالو ذرا۔"

"کیا ہوا؟"

"احمق، بٹوے پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دو۔"

پیٹر نے حیرت اور خوف سے آنکھیں پھیلائیں۔ "واقعی، یہ تو بڑی خطرناک غلطی ہونے لگی تھی۔" اس نے بٹوا نکال کر اسے اپنے رومال سے اچھی طرح صاف کیا اور واپس جیب میں ڈال دیا۔ "ہمیں بڑی باریکی سے سوچ کر ہر کام کرنا ہوگا۔ مثلاً یہ چابیاں کس چیز کی ہیں؟ اوہ ... یہ تو کار کی چابیاں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کار نیچے کھڑی ہے۔"

"یہ کار ہمارے لیے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔" کراس نے کہا۔ "لاش کو کار میں ڈال کر لے جائیں گے۔ تم ایسا کرو کہ مارکیٹ جاؤ اور دو جوڑی دستانے خرید لاؤ۔ اب ہم کسی چیز کو دستانوں کے بغیر ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ان چابیوں کو بھی رومال سے صاف کر دو۔"

رات کے گیارہ بجے پیٹر نے گلی میں جا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ گلی بالکل سنسان پڑی تھی۔ وہ ونیکار کی شیوی کو دروازے کے قریب لے آیا اور انجن بند کر کے اوپر پہنچ گیا۔ اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔

"گلی بالکل سنسان پڑی ہے۔" پیٹر نے سرگوشی میں کراس کو بتایا۔ "آس پاس کوئی نہیں ہے۔ گاڑی کو میں دروازے کے بالکل سامنے لے آیا ہوں۔"

دونوں نے ونیکار کی لاش کو سیدھا کھڑا کیا، اس کے بازو اپنے کندھوں پر ڈالے اور اس طرح نیچے لے چلے جیسے کسی بیمار آدمی کو لے جایا جاتا ہے۔ دونوں نے دستانے پہن رکھے تھے اور اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی پولیس کا آدمی نہ ادھر آنکلے۔ انہوں نے لاش کو پچھلی سیٹ پر بٹھانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ لاش اکڑ چکی تھی۔ مجبوراً اسے سیٹ پر لٹانا پڑا۔ پیٹر لاش کے ساتھ پچھلی سیٹ کے کنارے پر بیٹھ گیا اور کراس نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔

چند منٹوں کے اندر وہ کیمپس کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر

Farrukh Malik

رک گئے۔ نیم تاریک کیمپس سنسان پڑا تھا۔ کراس نے بتیاں بجھا دیں اور انجن بند کر دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ پہلے ہمیں آگے جا کر ایک نظر اندر ڈال لینی چاہیے۔“

”اس وقت کیمپس میں کون ہوگا۔“ پیٹر نے کہا۔ ”ہمیں جلد از جلد اس بوجھ سے جان چھڑانی چاہیے۔ آؤ، میری مدد کرو۔“

”جلدی نہیں کرو۔ ذرا سی غلطی ساری زندگی کے پچھتاوے کا باعث بن سکتی ہے۔“

”ابھی ہمیں گاڑی کو بھی ٹھکانے لگانا ہے۔“ پیٹر نے یاد دلایا۔ ”اور مجھ پر اس لاش کے قرب سے دہشت طاری ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اس کے منہ سے عجیب سی آواز برآمد ہوئی تھی۔“

”ایک منٹ صبر کرو، میں دیکھ کر آتا ہوں۔“ اس نے دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا، پھر رک گیا۔ ”ذرا دیکھنا تو وہ سامنے کون آ رہا ہے، دو آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“

پیٹر نے اشارے کی سمت دیکھا۔ گیٹ سے تقریباً سو قدم اندر دو پولیس آفیسر گیٹ کی طرف آ رہے تھے۔ ”جلدی سے نکل چلو۔“ پیٹر نے سرگوشی کی۔ ”یہ وہ پولیس آفیسر ہیں۔“

کراس نے گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔ ”دیکھا تم نے۔“ اس نے کہا۔ ”اگر ہم جلد بازی سے کام لیتے تو دھر لیے گئے تھے۔“

وہ سیدھے آگے نکل گئے اور پھر ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ پیٹر بار بار پیچھے دیکھ رہا تھا کہ کوئی پولیس کی گاڑی تو ان کے پیچھے نہیں لگ گئی۔

”پیٹر، میرا خیال ہے کہ ہماری عقل سلیم رخصت ہو چکی ہے۔“ کراس نے چونک کر کہا۔ ”ہمارے حواس صحیح کام نہیں کر رہے۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“ پیٹر نے کہا۔ ”مجھے اس لاش سے سخت وحشت ہونے لگی ہے۔ کیا تمھارے ذہن میں کوئی نیا منصوبہ آیا ہے؟“

”کیوں نہ کار کو لاش سمیت کہیں کھڑا کر کے رخصت ہو جائیں۔“

”بات تو ٹھیک ہے، لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے۔ پولیس یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی کہ قتل کسی اور جگہ پہ ہوا ہے۔ کار اور لاش الگ الگ رہے تو زیادہ بہتر ہوگا۔“

دس منٹ بعد وہ ایک پارک کے قریب پہنچ گئے۔ پارک بالکل سنسان پڑا تھا اور دور و نزدیک کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد انہوں نے لاش کو باہر نکالا اور پارک میں لے جا کر ایک بنچ کے قریب ڈال دیا۔ جب وہ واپس کار کے قریب پہنچے تو بارش شروع ہو گئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کار کو کسی ایسی جگہ پہ جا کر چھوڑیں گے جہاں سے انہیں بس یا ٹیکسی مل سکے۔ یہ موزوں جگہ انہیں ریلوے اسٹیشن کے پاس مل گئی۔ کار سے اترنے سے پہلے انہوں نے اطمینان کر لیا کہ آس پاس کوئی شخص کار کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ جب وہ کار سے اترے تو بارش تھم چکی تھی،

لہٰذا دونوں پیدل چل پڑے۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں بس یا ٹیکسی میں سفر کرنے کے بجائے پیدل ہی گھر جانا چاہیے۔“ پیٹر نے کہا۔ ”یہ زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔ اس طرح کوئی بس کنڈکٹر یا ٹیکسی ڈرائیور یہ گواہی نہیں دے سکتا کہ ہم رات کے ساڑھے گیارہ بجے ریلوے اسٹیشن کے قریب، جہاں مقتول کی کار کھڑی تھی، دیکھے گئے تھے۔“

کراس دستی گھڑی پر نظر ڈالتا ہوا بولا۔ ”گیارہ بج کر ستائیس منٹ ہوئے ہیں۔ ستائیس منٹ میں سارا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔“ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”آؤ کسی بار میں چلتے ہیں۔ ایک ایک ڈرنک ہو جائے۔“

پیٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرے ذہن پر لاش سوار ہے۔ اگر میں نے کچھ کھایا تو مجھے الٹی ہو جائے گی۔“

”تو پھر میرے ساتھ چلو۔ مجھے تنہا اپنے اپارٹمنٹ میں جاتے ہوئے خوف سا آ رہا ہے۔“

پیٹر اپنے ماتھے اور گردن پر ہاتھ لگاتا ہوا بولا۔ ”میرا خیال ہے مجھے بخار ہو رہا ہے۔ میں اس لاش کے تصور سے دور ہو جانا چاہتا ہوں۔“

کراس نے مڑ کر پیچھے دیکھا لیکن فٹ پاتھ پر ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ”آہستہ بات کرو۔“ اس نے ہولے سے کہا۔ ”تم بار بار لاش کا ذکر کر رہے ہو۔ ہمیں قتل کا خیال اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ جو کچھ ہوا وہ محض ایک حادثہ تھا۔ پولیس یہی خیال کرے گی کہ کسی نے اسے لوٹنے کے لیے قتل کر دیا ہے۔ اوہ...“ وہ چونکا۔ ”ہم سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ ہم اس کا بٹوا جیب میں ہی چھوڑ آئے ہیں، حالانکہ پروگرام کے مطابق ہمیں اس کا بٹوا اس کے قریب زمین پر پھینکنا تھا۔“

پیٹر، جو چلتے چلتے رک گیا تھا، دوبارہ چل پڑا۔ بولا۔ ”تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ بٹوے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس اب جو چاہے سوچتی رہے۔ کم از کم وہ ہمارے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں جوڑ سکتے۔ اخبار میں چار لائنوں سے بڑی خبر نہیں چھپے گی۔“

چلتے چلتے دونوں ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے پیٹر کا راستہ الگ ہو جاتا تھا۔

کراس نے کہا۔ ”آج رات میرے ساتھ گزار لو، کل چلے جانا۔“

”نہیں میں گھر جا رہا ہوں۔“

کراس نے بھوئیں سکیڑیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں تلخی پائی جاتی تھی۔ ”کل ملاقات ہوگی؟“ اس نے پوچھا۔

”اسے آخری ملاقات سمجھو۔“ پیٹر نے کہا۔ ”تمھاری حماقت کی وجہ سے میں قتل کے چکر میں پھنس چلا تھا۔ آئندہ مجھ سے دور

"بھول جاؤ پیٹر، دوست کبھی ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے۔ او کے۔ خدا حافظ۔۔۔ امید ہے کہ جلد ملاقات ہوگی۔"

پیٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں اپنے اپنے راستے پر ہو لیے۔ دس منٹ بعد کراس اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ونیکار کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگرچہ اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا مگر وہ ذرا بھی بھوک محسوس نہیں کر رہا تھا۔ جب وہ سونے کے لیے اپنا بستر ٹھیک کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ غیر شعوری طور پر کانپ رہے تھے۔ اس کے تصوّر میں ایڈگر ونیکار کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ شاید وہ شادی شدہ تھا۔ اس کے بیوی بچّے اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ بستر پر لیٹنے کے بعد کراس کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ اس نے سوچا کہ اگر ونیکار کے بیوی بچّے ہوئے تو وہ اپنے جرم کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ضرور ان کی مدد کرے گا۔

اگلی صبح دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھلی، کوئی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو اسے پتا چلا کہ وہ کافی دیر تک سوتا رہا تھا۔ اس وقت صبح کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر کی چمک میں آنکھیں جھپکاتا ہوا ان دو اشخاص کو دیکھنے لگا جو پولیس کی یونیفارم میں تھے۔ کراس کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ اتنی جلدی پولیس اس کے دروازے تک کیسے پہنچ گئی؟

ایک پولیس آفیسر نے اپنا نام سارجنٹ مائیکل گارڈنر بتایا اور کراس سے اس کا نام پوچھا۔

"مم۔۔۔ میرا نام مارک کراسکن ہے۔"

مسٹر کراسکن! کیا تم آرٹسٹ ہو؟

"میں آرٹسٹ؟ نن۔۔۔ نہیں۔ میں آرٹسٹ تو نہیں ہوں۔"

کراس نے پولیس آفیسروں کے پیچھے دیکھا تو سیڑھیوں میں اسے کچھ اور وردیوں والے نظر آئے۔ ان میں سے ایک جھک کر سیڑھیوں کا معائنہ کر رہا تھا۔

"کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟" سارجنٹ نے کہا۔ "ہم تم سے چند سوالات کرنا چاہتے ہیں۔"

کراس تامّل کرتا ہوا دونوں آفیسروں کو اندر لے گیا۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی ایزل اور پینٹنگز اسے مشکل میں ڈال سکتی تھیں۔

سارجنٹ پُرخیال نظروں سے پینٹنگز کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "مسٹر کراسکن، کیا تمھارے ساتھ کوئی آرٹسٹ رہتا ہے؟"

"آرٹسٹ؟ نن۔۔۔ نہیں، میں اکیلا رہتا ہوں۔ دراصل میں آرٹ سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"کیا یہ تصویریں تمھاری بنائی ہوئی ہیں؟" سارجنٹ نے پوچھا اور آگے بڑھ کر ایزل پر لگی ہوئی تصویر کو گھورنے لگا۔ "بہت خوب! بہت عمدہ تصویر ہے۔ تمھارے ہاتھ میں خاصی پختگی ہے۔ انکساری کی بات اور ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ تم نو آموز ہو۔"

کراس نہ انکار کر سکتا تھا اور نہ اقرار۔ اگر انکار کرتا تو یہ بتانا پڑتا کہ ان تصویروں اور ایزل کی وہاں موجودگی کا کیا جواز تھا۔ اگر اقرار کرتا تو ایک معمولی ٹیسٹ اس کے بیان کو غلط ثابت کر سکتا تھا۔

"مسٹر کراسکن، کیا تم ای آر ونیکار نامی آرٹسٹ کو جانتے ہو؟"

"نن۔۔۔ نہیں، مم۔۔۔ میں اسے نہیں جانتا۔"

"گزشتہ رات ہمیں اس کی لاش ایک پارک میں پڑی ہوئی ملی ہے۔ میڈیکل ایگزامینر کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق اسے کسی دوسری جگہ پر قتل کر کے لاش وہاں ڈال دی گئی تھی۔ قاتل یا قاتلوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسے لوٹنے کے لیے قتل کیا گیا ہے جبکہ میڈیکل رپورٹ کے مطابق وہ کسی بلند اور سخت جگہ پر سے گرنے کی وجہ سے ہلاک ہوا ہے۔ غالباً سیڑھیوں پر سے۔"

کراس صوفے پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ "تت۔۔۔ تم مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

سارجنٹ نے جیب سے ایک کاروباری کارڈ نکالا۔ "یہ کارڈ ہمیں متوفی کے بٹوے سے ملا ہے۔ یہ اس کا کاروباری کارڈ ہے۔ اس پر تمھارا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمھارا فون نمبر اس کارڈ پر کیوں لکھا ہے؟"

اسی لمحے ایک باوردی ڈیٹیکٹو ایک سوٹ والے شخص کے ہمراہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ ڈیٹیکٹو نے سارجنٹ سے کہا۔ "متوفی نہ یہی سیڑھیوں سے گرا تھا یا گرایا گیا تھا۔ ہمیں سیڑھیوں سے چپکے ہوئے اس کے بال مل گئے ہیں۔"

"مسٹر کراسکن، تم زیرِ حراست ہو۔" سارجنٹ نے کہا۔ "کیا تم نے تنہا ونیکار کو سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا یا تمھارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟"

کراس کو پیٹر کی گزشتہ رات والی بے رخی یاد آگئی۔ اس نے سوچا کہ اگر جیل میں ایک دوست ساتھ ہوگا تو وقت اچھا گزر جائے گا۔ جو کچھ ہوا اس میں دونوں شریک تھے۔ لہٰذا اس نے کہا۔ "میرے ساتھ میرا دوست پیٹر بھی تھا۔"

سارجنٹ نے کراس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور اسے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا۔ نصف گھنٹے بعد دو آفیسروں نے پیٹر کو بھی گرفتار کر کے وہاں پہنچا دیا۔

NICE ONE
William Bankier.



لبنان پر اسرائیلی حملے کے دوران کوڑھی کا بھیس بھر کے میں بیروت کے نزدیک پہنچا اور اپنے چار ساتھیوں کی مدد سے اسرائیلی اسلحے کے کئی ذخائر تباہ کر دیے۔ اس مہم کے بعد صرف میں ہی زندہ بچا اور گرفتار ہو گیا۔ اسرائیلی افسران یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے کہ میں کون ہوں؟ مجھے کرہ نمبر آٹھ میں ڈال دیا گیا۔ انہیں میری اصلیت کا پتا چل جاتا تو اسرائیل میں خوشیاں منائی جاتیں۔ یہودیوں کے لیے علی یار خان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ میں ٹیپو شاہ کے شہر قصور میں پیدا ہوا۔ حصولِ تعلیم کے لیے سان فرانسسکو میں مقیم تھا کہ ایک حادثے نے میری زندگی بدل دی۔ اپنے دوست ہربنس سنگھ کے ہمراہ میں ایک صیہونی تقریب میں شریک تھا کہ ایک یہودی کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شرانگیز تقریر سن کر مشتعل ہو گیا۔ میری جوابی تقریر نے ہنگامہ کر دیا۔ اس طرح میرے اور یہودیوں کے درمیان ہنائے عداوت پڑ گئی۔ دو یہودی غنڈوں نے میری ایک پاکستانی دوست اور پرستار شہناز کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا۔ اس کی لاش کے ساتھ میرے لیے ایک پیغام بھی تھا۔ "ایبرن ہال کے ہیرو کے لیے پہلا تحفہ۔" اس اذیت ناک واقعے نے مجھے مزید مشتعل کر دیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی زندگی صیہونیت کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف کر دوں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے میں نے اپنی تعلیم بھی ادھوری چھوڑنا گوارا کر لیا۔ ابتدائی منصوبہ بندی کے بعد میں نے اپنی چینی دوست لوئی شی، اس کے بھائیوں اور والد کو ہمراز بنا لیا اور موقع ملتے ہی ان یہودی غنڈوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ پھر فلسطین کے ایک بڑے سے نقشے پر ان کی لاشیں پھیلا کر جوہن نامی غنڈے کے سینے پر ایک کارڈ رکھ دیا جس پر تحریر تھا۔ "وہ وقت دور نہیں جب اسرائیل خون میں ڈوبا ہو گا اور فلسطین آزاد ہو جائے گا۔ یہ ہیرو کی پیشین گوئی ہے۔" اس جوابی کارروائی کے بعد میرا سان فرانسسکو میں ٹھہرنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ میں لوئی شی کے والد اور بھائیوں کی مدد سے ہوا اور ہالی ووڈ پہنچا مگر اس سے پہلے کہ لوئی شی کے والد کی نشاندہی پر مسٹر جوشو سے ملوں، ایک جرائم پیشہ یہودی گین ملر کے شکنجے میں پھنس گیا۔ اس نے دھوکے سے ایک تحریر پر دستخط لے لیے جو مجھے پاکستانی تخریب کار ثابت کرتی تھی پھر میرے خون کے پیاسے یہودیوں کے ہاتھ مجھے لاس اینجلس میں فروخت کر دیا۔ مجھے خریدنے والے یہودی وِدیان کا چینی ملازم ادشویا، مسٹر جوشو کا شاگرد نکلا۔ اس کی مدد سے میں وِدیان کو قتل کر کے واپس ہالی ووڈ مسٹر جوشو کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جوشو نے میری ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا اور پھر مجھے گین ملر کی اقامت گاہ تک پہنچا دیا۔ خوش قسمتی سے وہ کاغذات مجھے فوراً ہی مل گئے جن پر گین ملر نے دستخط لیے تھے اور گین ملر بھی میرے ہاتھوں مارا گیا۔ مسٹر جوشو میری اس کامیابی سے مطمئن اور خوش ہو گئے اور مجھے امریکہ سے باہر نکالنے کے لیے ایک نہایت پیچیدہ طریقہ اختیار



آزمائش کی کڑی دھوپ میں ایک پاکستانی جانباز کا سفر

سیاست کدۂ دھر میں ایثار و وفا کی رقصاں چنگاری
ہوس کے تپتے ہوئے ریگزار میں نغمۂ بادِ بہاری
موت کے سائے میں زندہ رہنے والوں کی داستان کا ایک گلابی ورق
مشتعل امنگوں کی دھنک، سلگتے جذبوں کی شفق
ایک شعلہ بہ لب، آتش بہ دل، ایک شر بہ جاں کا قصۂ جاں گداز
ایک آشفتہ سر، ایک سرکشیدہ، ایک سر بہ کف کے جینے کا انداز
شہر شہر، قریہ قریہ، کوچہ کوچہ، ہنگامۂ دار و گیر
وقت کی پیشانی پر نوکِ سناں سے لکھی ہوئی تحریر

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
جب خونِ جگر برفاب ہوا

جاسوسی ڈائجسٹ کا نیا سلسلہ

جانباز

علی یار خان کی سرگزشت

سوال کا جواب دینا پسند کریں گے؟" میں نے سوالیہ انداز میں ... ہاورڈ کو دیکھا۔ اولیو ہاورڈ رات کی نسبت اس وقت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ پھر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "وہ شخص کون تھا جو آپ کے ساتھ مفلوج کیفیت میں یہاں تک پہنچا تھا اور اسی اسپتال میں زیرِ علاج تھا؟" میں خاموشی سے اولیو ہاورڈ کی شکل دیکھتا رہا۔ تب وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ "مجھے آپ لوگوں کی پلاننگ کا کسی حد تک اندازہ ہوچکا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کیا چاہتے تھے۔ اگر وہ شخص مفلوج نہیں تھا تو آپ بھی مفلوج نہیں ہیں مسٹر علی یار خان۔ کیونکہ وہ اسپتال کے اس کمرے سے نکل بھاگا ہے اور بھاگتے ہوئے اس نے دو ڈاکٹروں کو شدید زخمی کر دیا ہے مجھے یقین ہے کہ وہ بھی گریلوالز سے بھاگا ہوا کوئی قیدی ہی تھا لیکن وہ کون ہے، یہ آپ کو بتانا ہوگا، یہ بہت ضروری ہے۔" اولیو ہاورڈ کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

میرے بدن میں ایک لمحے کے لیے مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مجھے چرن سنگھ کے فرار کی اطلاع سن کر خوشی ہوئی تھی۔ کم از کم بے چارہ چرن سنگھ تو نکل جانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "کیا گریلوالز سے بھاگنے والے تمام قیدیوں کے بارے میں مجھے معلوم ہونا ضروری ہے مسٹر ہاورڈ؟"

"وہ کون تھا؟ کیا نام تھا اس کا؟ یہاں سے وہ کہاں جائے گا، تم سے اس کا کیا تعلق تھا؟" اولیو ہاورڈ کرخت لہجے میں بولا۔

"بڑے اہم سوالات ہیں مسٹر ہاورڈ! آپ کے اختیارات لامحدود ہیں۔ آپ وہاں، میرا مطلب ہے گریلوالز میں ہر طرح کی چھان بین کرسکتے ہیں۔ یہ سوال مجھ سے کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟ لیکن خیر، اس شخص کا نام اوڈے تھا۔ وہ بہت خطرناک فطرت کا مالک تھا۔ فرار کی پوری اسکیم اسی نے بنائی تھی اور ہمارے ساتھ کچھ افراد اور بھی تھے۔ وہ راستے میں ہلاک ہوگئے۔ صرف میں اور وہ یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکے۔" میں نے اطمینان سے کہا، جانتا تھا کہ بالآخر، ہاورڈ گریلوالز سے تفصیلات معلوم کرلے گا لیکن اسے یہ نہیں معلوم ہوسکے گا کہ دوسرا بچ جانے والا چرن سنگھ تھا۔ کرنل کیرالنو اور پولیس گریتھر آرٹن بھی اس بارے میں اسے کچھ نہیں بتا سکیں گے۔ جب تک چرن سنگھ کو ان کے سامنے شناخت کے لیے پیش نہ کیا جائے۔

"اوڈے" اولیو ہاورڈ نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ پھر کسی قدر مطمئن ہوکر بولا۔ "یہ شخص یہاں سے فرار ہوکر کہاں جائے گا؟"

"سیدھا امریکہ۔ اس کا خیال ہے کہ یہاں اسے مسٹر ہاورڈ کی جگہ مل جائے گی کیونکہ بوڑھا اور ذہنی طور پر علیل اولیو ہاورڈ اب اپنے منصب کے لیے موزوں نہیں رہا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ میرے الفاظ پر اولیو ہاورڈ کی آنکھیں سُرخ ہوگئی تھیں۔

چند لمحے وہ مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ "او کے مسٹر علی یار خان! اس بات کا تمھیں معقول جواب دیا جائے گا۔" وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میری گفتگو نے اسے مشتعل کر دیا تھا لیکن وہ ابھی میرے خلاف کوئی سخت کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نئی جگہ میں نے تقریباً اڑتالیس گھنٹے گزار لیے تھے جس وقت تک برداشت کرسکتا تھا، بھوکا رہا اور جب محسوس کیا کہ اب بھوک حواس چھین لے گی تو جو کچھ ملا، کھا لیا، تمام خدشات سے بے نیاز ہوکر لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی جس کے خدشے سے ابھی تک کھانا پینا چھوڑا ہوا تھا۔ البتہ اب بدن کو مسلسل مفلوج رکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کہیں اعضا کام کرنا ہی نہ چھوڑ دیں اور سچ مچ اپاہج ہوجاؤں۔ فی الحال یہی اندازہ ہورہا تھا کہ ہاورڈ کے چنگل سے نہیں نکل سکوں گا۔ اس کی گرفت کمزور نہیں تھی۔ اب حالات کے رخ پر بہنا ہوگا۔ اگر موقع مل گیا تو ٹھیک ورنہ جو بھی تقدیر میں لکھا ہو۔ خود ہاورڈ نے بھی میرے مفلوج ہونے پر یقین نہیں کیا تھا۔ کوئی علاج نہیں ہوا تھا اس دن سے۔

غالباً پانچواں دن تھا، شام کے پونے چھ بجے تھے۔ جب ہاورڈ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

"گریلوالز سے تمام رپورٹ موصول ہوگئی ہے اور آج رات تمھارے دوست کرنل کیرالنو اور گریتھر آرٹن بھی یہاں آرہے ہیں۔ واقعی تانڈوز کے خلاف مہم میں حصہ لے کر تم نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں اور نتیجے میں ان کی ہمدردیاں حاصل کرکے یہاں تک پہنچ جانا بھی ایک کارنامہ ہے۔ ان سارے کارناموں کے انعامات وصول کرنے کے لیے ...."

ہاورڈ نے اتنا ہی کہا تھا کہ عمارت ایک خوفناک دھماکے سے ہل گئی۔ تقریباً ساری عمارت کے دروازے کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے ہوں گے۔ ہاورڈ نے گرنے سے بچنے کے لیے میری مسہری کا سہارا لیا تھا اور میں بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ہاورڈ نے مجھے دیکھا اور . . . .

△

سرفروشانہ جدوجہد کی اس تحیر خیز داستان کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں

Farrukh Malik

غلطی

بلال احمد

اس فتنہ ساز و شعلہ بہ داماں لڑکی نے اپنے محبوب کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کر دے لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ واردات اس سے پہلے بھی کسی پر بیت چکی ہے۔ بیوی یا شوہر کے قتل کی کہانیاں آپ نے بہت سی پڑھی ہوں گی مگر یہ ان سے ذرا مختلف کہانی ہے

اپنے انجام سے بے خبر انسانوں میں سے ایک کی کہانی

ہیری کوبر کی اندرونی کیفیت کسی ایسے شخص سے قطعی مختلف نہیں تھی جو زندگی میں پہلی بار قتل کے ایک بھیانک منصوبے پر عمل کرنے والا ہو۔ کسی پیشہ ور قاتل کے لیے تو کسی انسان کو زندگی سے محروم کر دینا کچھ زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوتا لیکن ایک ایسا آدمی جس نے کبھی چیونٹی کو بھی نقصان نہ پہنچایا ہو، اس کے نزدیک کسی انسان کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنانا اور پھر اس منصوبے پر عمل کرنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔ پھر جب اسے یہ معلوم ہو کہ منصوبے کے آخری مرحلے کو عملی شکل دینے میں چند منٹ باقی رہ گئے ہیں تو اس کی دلی کیفیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ہیری بھی اس وقت ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اپنی بیوی کے ساتھ بتدریج بلندی کی طرف، تنگ سے پہاڑی راستے پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ کئی مرتبہ کپکپائے تھے۔ کئی بار اس نے کن انکھیوں سے پہلو میں بیٹھی ہوئی بیوی کی طرف دیکھا۔ بالآخر یہ پُرپیچ اور دشوار گزار راستہ ختم ہو گیا۔ اس نے غار کے سامنے کشادہ جگہ پر کار روک کر انجن بند کر دیا اور بیوی کی طرف دیکھے بغیر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا۔

"میں اب تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ تمھیں اس غار سے یکایک کیا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے ہیری!" اس کی بیوی ناگوار سے لہجے میں کہتی ہوئی نیچے اُتر آئی۔ یہ اسپورٹس کار اس نے دو ہفتے پہلے



خرید کر ہیری کو تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔ ہیری کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ غار ہمارے مکان سے دس میل سے زیادہ دور نہیں اور ہمیں وہاں رہتے ہوئے تقریباً دو سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں تم نے کبھی اس غار کا تذکرہ نہیں کیا لیکن اب تمھیں اچانک ہی اس غار سے اتنی دلچسپی محسوس ہونے لگی کہ مجھے پہلے سے بتائے بغیر یہاں آنے کا پروگرام بنا لیا۔ سچی بات تو یہ ہے ہیری کہ میں تمھیں اب تک نہیں سمجھ سکی ہوں۔"

"تمھیں شاید میری یہی بات تو پسند تھی کہ میں ایسے دلچسپ پروگرام اچانک ہی بنا لیا کرتا ہوں۔" ہیری نے خفیف سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ وہ عمر میں اپنی بیوی سے چودہ سال چھوٹا تھا۔ توانا اور خوبرو ہونے کے باعث عورتوں کے لیے اس میں بڑی کشش تھی۔

"لیکن ایسی بھی کیا ترنگ کہ کسی کو سوچنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔" بیوی نے جواب دیا۔

وہ دونوں اس طرف چل دیے جہاں غار کی سیر کے لیے آنے والے بہت سے لوگ گائیڈ کو گھیرے ہوئے تھے۔ غار کے دہانے پر ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں تھا جس پر "لورز کیو" .... (LOVER'S CAVE) کے الفاظ نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔

"محبت کرنے والوں کا غار!" وہ بڑبڑائی۔ "اوہ خدا! یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟ کیا تفریح کے لیے اور کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی؟"

"غار کے اندر داخل ہونے کے بعد تم ساری کوفت بھول جاؤ گی ڈارلنگ!" ہیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم ان لوگوں کے پاس پہنچو، میں داخلے کے ٹکٹ لے آؤں۔"

"داخلے کے ٹکٹ؟" بیوی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا اس غار میں داخل ہونے کے لیے ٹکٹ بھی خریدنا پڑتے ہیں، جبکہ میرے خیال میں ہونا تو یوں چاہیے کہ یہاں کی انتظامیہ یہاں آنے والے سیاحوں کو کچھ ادائیگی کرے۔ میں نے سنا ہے کہ یہ غار بہت خطرناک ہے۔"

"اگر انسان محتاط رہے تو اسے کہیں بھی کوئی خطرہ پیش نہیں آ سکتا۔" ہیری نے کہا۔

"کیا....؟"

"کچھ نہیں ڈیئر! وہ لوگ غار کے اندر داخل ہونے ہی والے ہیں۔ مجھے جلدی سے ٹکٹ لے آنے چاہئیں، ورنہ دوسرے گروپ کا انتظار کرنا پڑے گا۔" ہیری یہ کہتا ہوا ٹکٹ گھر کی طرف بڑھ گیا۔

ٹکٹ گھر کے قریب ہی ایک چھوٹا سا اسٹال تھا جہاں اس غار سے متعلق معلومات پر مشتمل کتابچے دستیاب تھے۔ ٹکٹ خریدتے ہوئے ہیری کن انکھیوں سے اسٹال کے مالک کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ تین روز پہلے جب وہ اپنے اس منصوبے کی تفصیلات کا جائزہ لینے کے لیے اپنی محبوبہ ماڈ کے ساتھ یہاں آیا تھا تو کچھ دیر کے لیے اس اسٹال پر بھی رکا تھا۔ اسٹال کا مالک گہری نظروں سے ماڈ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نظریں ہیری کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ نجانے اس کی نظروں میں ایسی کیا بات تھی کہ ہیری زیادہ دیر تک اس کی تاب نہ لا سکا تھا اور اس نے غیر محسوس انداز میں اپنا رُخ بدل لیا تھا۔

یہاں آنے میں انھوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ دونوں الگ الگ کاروں میں آئے تھے۔ غار کی سیر کے دوران بھی دونوں ایک دوسرے سے دُور ہی رہے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں تھا۔ لیکن جب الف[illegible] وہ اکٹھے ہی اسٹال پر پہنچے تھے تو اسٹال کے مالک نے بڑی گہری نظروں سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔ آج بھی [illegible] اسٹال پر وہی موجود تھا اور ہیری کو یقین تھا کہ اس نے اسے ٹکٹ خریدتے ہوئے یا بیوی کے ساتھ کار سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ غار کے دہانے پر پہنچ کر ہیری نے ٹکٹ گیٹ [illegible] کو دکھائے۔ اس نے لالٹین کی طرز کے بنے ہوئے دو لیمپ [illegible] کے حوالے کر دیے۔ ہیری لیمپ سنبھال کر اپنی بیوی کے سا[تھ] اندر داخل ہونے والے گروپ کے آخر میں جا ملا اور ایک لیمپ بیوی کو دے دیا۔

"یہ کیا ہے؟" بیوی تعجب سے بولی۔ "اوہ سمجھی، یہ لیمپ دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ غار کے اندر لائٹ نہیں [ہے۔"]

"ہاں، اور یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ بڑا دلچسپ [رہے گا۔"] [illegible] رہے گا۔" ہیری نے جواب دیا۔

"بعض اوقات تو تم بالکل بچوں جیسی باتیں کرنے [لگتے] ہو۔" بیوی نے جواب دیا پھر سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "اس وقت کوئی اور بھی تم میں دلچسپی لے رہا ہے۔"

"مجھ میں تم سے زیادہ کون دلچسپی لے سکتا ہے؟ [illegible] وہ کون ہے؟"

"سُرخ بالوں والی وہ لڑکی۔" بیوی نے آنکھ سے [illegible]

"اوہ، وہ! واقعی کمال کی چیز ہے! میرا خیال [ہے] میری اس رائے سے اختلاف نہ ہوگا۔" ہیری معنی خیز انداز [illegible]

"وہ شیشے کے شوکیس کے پاس اکیلی کھڑی [illegible] دس منٹ سے تم پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔" بیوی [illegible]

"میرا خیال ہے تمھارے لیے اس میں پریشانی کی [کوئی بات] نہیں ہے۔ مجھے تو عورتیں حسرت بھری نگاہوں سے [دیکھتی] رہتی ہیں۔ ان کی اس حرکت سے بعض اوقات بیزاری سی [محسوس] کرنے لگتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں تم بھی اس وقت [illegible]

کر رہی ہو۔"

"تم ایسی باتوں سے بیزار نہیں، لطف اندوز ہوتے ہو۔ بہرحال شیشے کے اس شوکیس میں کیا ہے؟" بیوی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"لاش۔" ہیری نے جواب دیا۔ "تقریباً دس سال پہلے اس غار کے اندر ایک آدمی نے ایک لڑکی کو قتل کر دیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے تھے۔ ان کی محبت کا آغاز تو نجانے کہاں سے ہوا تھا لیکن اختتام یہیں پہ ہوا۔ لڑکی کا باپ اس غار کا مالک ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کی لاش حنوط کر کے شیشے کے بکس میں سجا دی۔ یوں کہو کہ یہاں آنے والوں کی دلچسپی کا ایک نیا سامان پیدا کر دیا۔"

"ہاں یاد آگیا۔ ایسی کوئی بات سُنی تو تھی۔ کیا یہ سفاکی کا مظاہرہ نہیں؟ کتنا ظالم ہے وہ شخص؟" بیوی نے کہا۔

"کون ظالم ہے؟ لڑکی کا محبوب یا اس کا باپ؟" ہیری نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ دونوں ہی ظالم ہیں۔"

"بہرحال یہ ماضی کی بات ہے۔ اب ہم غار کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ راستہ بہت خطرناک ہے۔ ذرا محتاط ہو کے قدم اٹھانا۔" ہیری نے اسے خبردار کیا۔

"میں اس غار کے متعلق بہت کچھ سُن چکی ہوں۔ اوہ، وہ خوبصورت ناگن اب بھی تمھاری ہی طرف دیکھ رہی ہے۔" بیوی نے کہا۔

ہیری نے پہلی مرتبہ کچھ اضطراب سا محسوس کیا۔ اس نے ایک نظر اپنی بیوی، پھر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اب وہاں سے ہٹ رہی تھی۔ اس کے سرخ ہونٹوں کے گوشوں پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں پُراسرار سی چمک تھی۔ وہ ماڈ تھی۔ اسی کے کہنے پر ہیری نے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔

ماڈ سے ہیری کی ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یوں تو بہت سی لڑکیاں ہیری پر مرتی تھیں مگر اس نے کبھی کسی پر خصوصی توجہ نہیں دی تھی۔ اس لڑکی میں نجانے ایسی کیا بات تھی کہ ہیری خودبخود اس کی طرف کھنچتا چلا گیا اور اب ان دونوں کے تعلقات اس انتہا کو پہنچ گئے تھے کہ جدائی کا تصور ہی محال تھا۔ ادھر ہیری کی بیوی راستے کی دیوار بنی ہوئی تھی اور جس دن بیوی نے اسے نئی اسپورٹس کار خرید کر دی تھی، اسی شام کو وہ ماڈ کے ساتھ اس کار میں تفریح کے لیے نکلا تھا۔

"تمھیں اسے چھوڑنا ہوگا ہیری۔" ماڈ نے کہا تھا۔ "میں تمھیں صرف اور صرف اپنا دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمھارے لیے کسی دوسرے کی شراکت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ تم میرے ہو اور میں تمھیں حاصل کر کے رہوں گی۔"

"وہ طلاق کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوگی اور نہ ہی میرے پاس کوئی ایسی ٹھوس وجہ موجود ہے کہ میں اس سے طلاق لے سکوں۔" ہیری نے جواب دیا۔

"وہ وجہ پیدا کی جاسکتی ہے اور ہمیں ایسا کرنا ہوگا۔ ہم ہمیشہ تو اس طرح چھپ کر نہیں مل سکتے۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو ڈارلنگ۔" ہیری نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم جانتی ہو میرا تمام تر انحصار اسی پر ہے۔ میں نے محض دولت کے لیے اس سے شادی کی تھی۔ یہ شاندار کار، یہ عیش و عشرت سب اسی کی وجہ سے ہے۔ اگر میں اسے چھوڑ دوں تو ایک بار پھر قلاش ہو جاؤں گا۔ تم خود سوچو کہ ایسی صورت میں ہم کیا کریں گے؟"

"مت بھولو کہ میں ملازمت کر رہی ہوں۔" ماڈ نے اُسے گھورا۔

"ہاں، جانتا ہوں اور اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوں کہ تمھاری معمولی سی تنخواہ ایک دن کے اخراجات کے لیے بھی کافی نہیں ہوگی۔" ہیری نے جواب دیا۔

"کسی بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں پالینے کا عہد کر چکی ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت میرے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی۔"

"تم سطحی انداز میں سوچ رہی ہو۔" ہیری نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میرے سوچنے کا انداز کیا ہے، اس سے تمھیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تمھیں حاصل کرنا ہے۔" ماڈ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جب وہ دوبارہ بولی تو اس کے لہجے میں عجیب سا تاثر تھا۔ "یہ بات ذہن نشین کر لو ہیری کہ میں تمھیں حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر کے ہی رہوں گی۔"

"کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہی ہو کہ..." ہیری نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"تم ٹھیک سمجھ رہے ہو ہیری۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمھاری بیوی کو قتل بھی کر سکتی ہوں۔" ماڈ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ...؟"

"میرا دماغ ٹھیک ہے لیکن تم خود کچھ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو۔" اس نے ہیری کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میری زندگی کی یہ رونقیں صرف اسی کے دم سے ہیں۔ اس کی موت کے بعد میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ شادی سے پہلے ہم دونوں میں ایک تحریری معاہدہ ہوا تھا کہ اس کی موت کے بعد میں اس کی وراثت کا دعویدار نہیں ہوں گا۔ اس معاہدے کی ایک نقل اس کے وکیل کے پاس ہے۔" ہیری نے کہا۔

Farrukh Malik

"تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، سب کچھ میں خود کرلوں گی۔"

"میرا خیال ہے اب واپس گھر چلنا چاہیے۔" ہیری نے یہ کہتے ہوئے کار کا انجن اسٹارٹ کرنا چاہا مگر ماڈ نے اس کی کلائی پر اس طرح مضبوطی سے گرفت جمائی کہ اسے چونک جانا پڑا۔

"مجھے افسوس ہے ہیری!" وہ نرم لہجے میں گویا ہوئی۔ "اب صرف ایک ہی راستہ ہے، تمہاری بیوی کا قتل! ہم دونوں مل کر اسے قتل کریں گے۔"

"تم اس وقت شدید ذہنی انتشار میں مبتلا ہو۔ میں ایک ماہر نفسیات کو جانتا ہوں اور تمہیں اس کے پاس ....."

"میری الجھن صرف تم ہو ہیری!" ماڈ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "گزشتہ دو ہفتوں سے میں صرف تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی ہوں۔ میں نے تمہاری بیوی کو قتل کرنے کا ایک منصوبہ بھی بنا لیا ہے جس میں کوئی جھول نہیں۔ اگر تم میرا ساتھ نہ دو گے تو یہ سب کچھ میں خود کرلوں گی۔"

ہیری چونک گیا۔ اب تک کی ملاقاتوں میں وہ اسے اچھی طرح سمجھ چکا تھا اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس پر عمل کرنے میں بھی نہیں ہچکچائے گی۔

"اگر تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں تمہیں بھی نہیں بخشوں گی۔" ماڈ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں اپنے اور تمہارے تعلقات کے بارے میں سب کو بتادوں گی۔ ہم دونوں کی تصویریں، مختلف ہوٹلوں کے کاؤنٹر کلرک اور دیگر ملازمین ہمارے تعلقات کی گواہی دیں گے۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے افسوس ہوگا اور تم خود بھی سوچ سکتے ہو کہ پھر تمہاری پوزیشن کیا ہوگی؟"

ہیری کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ یہ دھمکی خطرناک تھی۔ اگر ماڈ اس پر عمل کر ڈالے تو وہ برباد ہوجائے گا۔ اس کے ہونٹ بھینچ گئے اور وہ اس طرح اینٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اس کے جسم کی لچک ختم ہوچکی ہو۔

"تم خاموش کیوں ہوگئے ہو ہیری؟" ماڈ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری کہی ہوئی بات کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" ہیری نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ! شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں نے تمہاری بیوی کو ٹھکانے لگانے کا کیا منصوبہ بنایا ہوگا؟"

ہیری نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ کہنے لگی۔ "کیا تم نے کبھی کوربیٹ کے پہاڑی سلسلے میں واقع محبت کرنے والوں کے غار کے بارے میں کچھ سنا ہے؟"

"نہیں۔ نہ ہی مجھے کبھی اس طرف جانے کا اتفاق ہوا ہے۔" ہیری نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

"میرے منصوبے کا آخری مرحلہ اس غار کے اندر پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ تم جانتے ہو کہ اس قسم کے غاروں کے مختلف حصوں کے مختلف نام رکھ دیے جاتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کے غار میں بھی ایسے ہی نام ہیں۔ مثلاً کرسٹل بال روم، ملکی وے، سالومن تھرون وغیرہ۔ غار کا آخری حصہ جواہرات والا زینہ کہلاتا ہے۔ یہیں سے باہر نکلنے کا راستہ ہے اور ہمارے منصوبے کا آخری مرحلہ بھی اسی جگہ پورا ہوگا۔ ہمارے مقصد کے لیے اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ اس تنگ و تاریک اور خطرناک راستے پر معمولی سا دھکا اس کہانی کو اختتام تک پہنچا دے گا۔" ماڈ نے یہ کہتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور جھکی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔



غار کے اندر اپنی بیوی کے پیچھے چلتے ہوئے ہیری نے اپنے دماغ سے سب کچھ نکال دیا۔ اب اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ اپنے خیالات میں اتنا مگن تھا کہ بیوی کی آواز بھی نہ سن سکا۔

"ہیری!" بیوی نے دوبارہ آواز دی۔

"یس ڈارلنگ!" ہیری تنگ راستے پر اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ وہ ابھی ابھی غار کے "ملکی وے" والے حصے سے نکل کر آئے تھے۔

"ہم دوسروں سے اتنا پیچھے کیوں چل رہے ہیں؟" بیوی نے کہا۔

"اتنی عجلت کی ضرورت بھی کیا ہے؟ آرام سے سنبھل کر چلتی رہو۔" ہیری نے جواب دیا۔

"کم از کم اتنا تیز تو چلو کہ میں گائیڈ کی آواز سن سکوں۔ وہ اس غار کے بارے میں کچھ بتا رہا ہے۔" ہیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا ذہن غار کے ... پرپیچ اور خطرناک راستے کے بارے میں الجھا ہوا تھا۔

"ہیری ذرا تیز چلو!" بیوی نے پھر پکار کر کہا۔

"تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ راستہ بھی خطرناک ہے۔ احتیاط سے قدم اٹھاؤ۔" کہنے کے ساتھ ہی ہیری لڑکھڑا گیا۔ اگر وہ فوراً نہ سنبھل جاتا تو تاریک کھائی میں غائب ہوجاتا لیکن جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ اس کے ٹخنے میں جھٹکا آگیا تھا۔ اسے چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ تکلیف کی شدت سے اس کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ وہ اب لنگڑا کر چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بعض اوقات کوئی معمولی سی بات بھی کسی شاندار منصوبے کا ستیاناس کر دیتی ہے۔

Farrukh Malik

"تم تو اس غار میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہے تھے! اب سب سے پیچھے کیوں رہ گئے ہو؟" بیوی نے پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر کہا۔

ہیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹخنے کی تکلیف اب بڑھ گئی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے تھا لیکن وہ رُک بھی نہیں سکتا تھا۔ جواہرات والے زینے پر تو اسے ہر حالت میں پہنچنا تھا اور اس کے بعد سب کچھ ختم ہو جانے والا تھا۔ جواہرات کے زینے، پر پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ ماڈ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ دائیں بائیں گھومتی ہوئی چٹان کے ساتھ دو ڈھائی فٹ چوڑا راستہ تھا۔ اس کے دوسری۔۔۔۔ طرف گہرا کھڈ تھا۔ پاؤں کی معمولی سی لغزش کسی کو موت کے منہ میں پہنچانے کے لیے کافی تھی۔ تمام سیاح اب ایک قطار کی صورت میں آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ سب اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اس خطرناک راستے کے ایک موڑ پر دیوار کی آڑ میں ماڈ گھات لگائے کھڑی ہے۔ منصوبے کے مطابق ہیری کی بیوی جیسے ہی اس جگہ پہنچتی وہ اسے دھکا دے دیتی۔ چالیس فٹ گہرے اور تاریک کھڈ میں گر کر اس کی ہڈیوں کا سُرمہ بن جاتا، اس کی موت کو ایک حادثہ قرار دیا جاتا اور ہیری بھی ہر قسم کے شبے سے بالاتر رہتا۔ ہیری کے گھٹنے کا درد اب پوری ٹانگ میں پھیل گیا تھا۔ وہ چلنے کے بجائے گھسٹ رہا تھا لیکن یہ اپنی تکلیف پر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وقت نکل گیا تو دوبارہ ایسا سنہرا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ تیز تیز چلنے کی کوشش کرتا ہوا اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا۔

"اوہ! کیسا خوفناک راستہ ہے۔" بیوی بڑبڑائی۔ ہیری نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے روک لیا۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ کیا بات ہے؟" بیوی خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"میرا خیال ہے اب مجھے تم سے آگے چلنا چاہیے۔" ہیری نے کہا اور اسے جواب کا موقع دیے بغیر اُس کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس منصوبے کے آخری مرحلے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس کے پاس صرف پانچ سیکنڈ تھے۔

چٹانی دیوار کے پاس ۔۔۔۔۔ پہنچ کر وہ رُک گیا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا لیمپ دیوار سے ٹکرا دیا۔ کوئی دیکھنے والا ہوتا تو یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ توازن سنبھالنے کے لیے اس کا لیمپ والا ہاتھ غیر ارادی طور پر دیوار سے ٹکرا گیا ہوگا مگر وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیمپ ٹوٹتے ہی غار کے اس حصے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اس کے صرف دو سیکنڈ بعد ہیری دیوار کا موڑ گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے پوری قوت سے ہاتھ گھما دیا جو وہاں چھپی ہوئی ماڈ کی گردن پر لگا اور وہ منہ سے آواز نکالے بغیر بیسیوں فٹ گہرے کھڈ کی تاریکی میں غائب ہوگئی۔ اس جگہ شاید زیادہ گہرائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے نیچے گرنے کی آواز بھی سُنائی نہ دے سکی تھی۔

کچھ دیر بعد موڑ پر مدھم روشنی دکھائی دی۔ یہ اس کی بیوی تھی جو سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

"تم ٹھیک ہو نا ہیری! تمھارا لیمپ کیسے ٹوٹ گیا؟" بیوی نے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

"توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں ہاتھ دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ میں ٹھیک ہوں، فکر کی کوئی بات نہیں۔" ہیری نے خفیف سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"تم بہت بے پروا ہوتے جا رہے ہو ہیری! کسی دن نقصان اٹھاؤ گے۔"

"نہیں۔ میں نے اب احتیاط کرنا سیکھ لیا ہے۔ اب مجھے کبھی پریشانی نہیں ہوگی۔ اور تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ہر اس چیز پر قابو پا سکتا ہوں جسے اپنے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔"

"جیسے میں؟" بیوی نے مسکرا کر کہا۔

"یقیناً۔" ہیری بھی جواب میں مسکرایا۔

اس کی ٹانگ کا درد اب کسی حد تک کم ہو رہا تھا۔ جب وہ غار کے آخری حصے سے گزر کر شیشے کے شوکیس والے کمرے میں داخل ہوئے تو اس کی چال میں بہت معمولی سی لنگڑاہٹ تھی۔ اس کی بیوی شوکیس کے قریب رُک گئی اور اس کے اندر رکھی ہوئی لڑکی کی حنوط شدہ لاش دیکھ کر کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم نے بتایا تھا کہ اس لڑکی کو اس کے محبوب نے قتل کیا تھا، مگر کیوں؟"

"سننے میں آیا ہے کہ لڑکی نے اپنے محبوب کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے اس سے شادی نہ کی تو وہ اس کی زندگی برباد کر دے گی۔ محبوب نے اس کی دھمکی سے مرعوب ہونے کے بجائے اسی کو قتل کر دیا جس طرح ......" ہیری کہتے کہتے یکدم خاموش ہو گیا۔

"بیچاری!" بیوی نے تاسف کا اظہار کیا۔

"ہاں، وہ واقعی بدقسمت تھی۔" ہیری نے جواب دیا اور ماڈ کے بارے میں سوچنے لگا جس نے وہی غلطی کی تھی جو شیشے کے شوکیس میں بند لڑکی کی موت ثابت ہوئی تھی۔



POOR MAUDE
Jonathan Craig.

ظفر اعجاز

زہرِ محبت

اندیشے، وسوسے اور غلط فہمیاں زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہیں۔ اس شخص کا قصہ جس کی جھولی میں محبت آن گری تھی لیکن وہ اپنے آپ کو اس کی حفاظت کا اہل محسوس نہیں کر رہا تھا اور اس نے زندگی کا قرض اتارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ایک چھوٹی سی شیشی کی داستان جس نے دلوں کے شکستہ شیشے جوڑ دیے ——————

—————— اس ماہ کے سرورق کی پہلی کہانی

فرزاں سے میری پہلی ملاقات پروفیسر عزت مہر کے انتقال کے موقع پر ہوئی۔

مجھے کالج میں آئے صرف دو برس ہوئے تھے اور پروفیسر عزت میرے آنے سے قبل ریٹائر ہوچکے تھے۔ اس لیے مجھے اُن سے ملاقات کا موقع کبھی نہ ملا اور کبھی جب کامن رُوم میں ان کا ذکر آیا بھی تو مجھے تجسس نہ ہوا۔ یہ تدریس کا پیشہ ہی ایسا ہے، لوگ جانے والوں کو بہت جلد بھلا دیتے ہیں۔ کوئی نہیں سوچتا کہ معمولی سی تنخواہ کے عوض ساری زندگی علم کے چراغ روشن کرنے والے کی زندگی کتنی تاریکیوں میں گھری ہوتی ہے۔ وہ جو مایوس ذہنوں کو امید کی کرنوں سے منور کرتا ہے، وہ جو بھٹکے ہوئے قدموں کو شاہراہِ حیات کی منزلوں پر گامزن کرتا ہے، جس کے ہاتھوں مستقبل کی نسلوں کی زندگی سنورتی اور جس کی رہنمائی میں انسانیت کی راہ تعمیر ہوتی ہے خود اس کی زندگی کتنی محرومیوں اور کٹھنائیوں کا شکار ہوتی ہے۔

اس روز مجھے بڑی شدت سے اس تلخ حقیقت کا احساس ہُوا تھا۔ وہ معمولی سا گھر جہاں پروفیسر عزت نے زندگی کی آخری سانس لی۔ افلاس کی جھلکتی ہوئی تاریکیاں جو وہاں کی ہر چیز سے نمایاں تھیں اور کس مپرسی کا وہ عالم کہ اُن کو کفن بھی کالج کے چندے سے ملا۔ ایک نیک، لائق اور روشن دماغ اُستاد کے اس انجام پر دل خون کے آنسو رو دیا۔ یہ بڑا عبرت کا مقام تھا۔ ہم تجہیز و تکفین سے فارغ ہوکر آئے تو گھر میں فرزاں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ سب نے رسمی تعزیت کی اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کر کے واپس چلے گئے۔ میں بھی بوجھل قدموں سے اپنے فلیٹ میں واپس چلا آیا تھا۔

زندگی کی بے ثباتی کے شدید احساس نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ ایک دن میں بھی اسی طرح رخصت ہو جاؤں گا۔ میری میّت پر تو کوئی آنسو بہانے والا بھی نہیں ہوگا۔ والدین بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ ایک بہن تھی جو ہزاروں میل دور ایک اسکول میں ملازمت کرتی تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی اتنے برسوں کی مدّت گزر چکی تھی کہ کچھ پتا نہ تھا وہ زندہ ہے یا مر گئی۔ میری طرح اس نے بھی شادی نہ کی تھی۔ مرد کے نام سے نفرت کرتی تھی۔ چھ سات برس پہلے اس کا ایک مختصر سا خط آیا تھا لیکن اس کے بعد جب میرا تبادلہ ہُوا تو اسے اطلاع دینا بھی بھول گیا تھا۔

میری نظروں میں فرزاں کا سوگوار چہرہ گھوم رہا تھا۔ عمر تیس بتیس سال کی ہوگی۔ چمپئی رنگ جو افلاس اور محرومی کی دھوپ میں جھلس کر رہ گیا تھا۔ دراز قد اور انتہائی دل کش

Farrukh Malik


POIS

خال لیکن زندگی، تلخیوں اور تکالیف نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اتنی عمر میں وہ پچاس برس کی لگ رہی تھی۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ سوگوار چہرے پر غم و یاس کی جھریاں نظر آ رہی تھیں۔ جھیل جیسی گہری آنکھوں میں صرف رنج و الم کے سائے لہریں لے رہے تھے۔ خشک لبوں پر فریاد مچل رہی تھی۔ ایسا حزن و ملال تھا کہ میرا دل تڑپ کر رہ گیا تھا۔ معلوم نہیں اب کیسے گزارا ہوگا بے چاری کا، کون سرپرستی کرے گا؟ ممکن ہے کوئی رشتہ دار ہو۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو اس المناک لمحے میں وہ تنہا کیوں ہوتی؟ باپ کو چندے کا کفن کیوں دیا جاتا ہے؟

میرا دم گھٹنے لگا۔ میں جو اس کا کچھ نہ تھا۔ جس کو اس کے وجود کا علم بھی آج ہوا تھا، اس کے لیے اتنا پریشان کیوں تھا۔ لیکن ایک رشتہ تھا ہمارے درمیان، پروفیسر عزت اور میں ہم پیشہ تھے۔ علم کا رشتہ تھا ہمارے درمیان۔ ایک اور رشتہ بھی تھا، زمانے کی بے ثباتی کا، مفلسی اور بے چارگی کا۔ محرومیوں اور مایوسیوں کا۔ میری عمر بھی پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ میرا بھی کوئی نہ تھا۔ اگر آج مر جاؤں تو اسی کس مپرسی کے عالم میں منزلِ آخر کو پہنچوں گا۔ اس رشتے سے مجھ پر کچھ فرض عائد ہوتا تھا۔ کچھ ذمہ داریاں تھیں جن کو پورا نہ کیا تو طبیعت کو قرار نہ آئے گا۔

دستک کے جواب میں دروازہ فروزاں ہی نے کھولا تھا۔ وہ اب تک روتی رہی تھی۔ پلکوں کی نمی اور آنکھوں کی سرخی سے دل کا غم عیاں تھا۔ ایک لمحہ کھوئی کھوئی سوگوار آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر شاید پہچان لیا، دروازے کو کھول کر ہٹ گئی۔ میں کمرے کے واحد بوسیدہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ کشمکش کے عالم میں کھڑی تھی۔

”میں پروفیسر اخلاق احمد ہوں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اسی کالج میں پڑھاتا ہوں۔ یہاں سے جانے کے بعد دیر تک سوچتا رہا۔ ہم اساتذہ کی زندگی کتنی بے سہارا ہوتی ہے، یہ آج محسوس ہوا۔“

وہ خاموش کھڑی رہی۔

”یہ پروفیسر عزت کا ذاتی مکان ہے؟“

”جی نہیں، کرایہ پر ہے۔“

”اوہ۔ تمھارا کوئی رشتے دار تو ہوگا بی بی؟“

وہ سسکیاں لینے لگی۔ غم کا دھارا ٹوٹ پڑا تھا۔ پھر اچانک اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ نقاہت سے چکرا کر گر پڑتی، میں نے لپک کر سہارا دیا۔ ایسا لگا آگ کو چھو لیا ہے، اسے بہت تیز بخار تھا۔ میں نے جلدی سے اسے صوفے پر بٹھایا، کونے میں رکھی صراحی سے پانی لاکر پلایا۔ اس نے بیزار نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”شکریہ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

زندگی میں پہلی مرتبہ کسی غیر کا سہارا پاکر شاید اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔ میں ایک لمحہ سوچتا رہا پھر اس کی سمت دیکھا۔ ”ٹھہرو۔ میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ پلیز سنیے۔“ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ”میں۔۔۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔“

وہ جانے کب سے بھوکی تھی۔ کون تھا جو موت کے گھر میں کھانا بھیجتا۔ میں کانپ اٹھا۔ خدایا یہ کیسا ظلم ہے۔ تیری دنیا سے انسانیت، ہمدردی اور اخلاقی اقدار کہاں چلی گئیں۔ میں ڈاکٹر کو لے کر آیا تو وہ بے سدھ پڑی تھی۔ آہٹ پر آنکھ کھول کر دیکھا لیکن اٹھ نہ سکی۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھنے کے بعد میری سمت بڑی ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔ نسخہ لکھ کر اٹھا اور مجھے کونے کی سمت لے جا کر کہا۔ ”ان کی طبیعت تو بہت خراب ہے۔ کمزوری بے انتہا ہے۔ آپ نے تو بے پروائی کی حد کر دی، کب سے یہ حالت ہے؟“

میں اسے کیا بتلاتا۔ کیسے بتلاتا؟ اس نے میری خاموشی سے کچھ اندازہ کر لیا۔ ”کیسے شوہر ہیں آپ۔ اگر ٹھیک سے علاج نہ کیا تو مر جائیں گی۔“ اس نے مجھے تنبیہہ کی۔ ”ان کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔“

دوائیں لکھ کر اس نے بہتر غذا اور مسلسل خبر گیری کی ہدایت کی اور فیس لے کر چلا گیا۔ میں زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ تھا بھی کیا کہنے کے لیے، مجھے فروزاں کے دکھوں سے ہمدردی تھی۔ میں خاموشی سے ساتھ باہر نکلا۔ دوائیں خریدنے کے بعد کچھ کھانے پینے کا سامان اور پھل خریدے۔ واپس پہنچا تو وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اسے اٹھایا اور سہارا دے کر بستر تک لے گیا۔ کچن میں جا کر چائے کی کیتلی میں پانی ڈال کر چولھے پر رکھا لیکن تلاش کرنے کے باوجود شکر نہ مل سکی۔ دبے پاؤں باہر نکلا، اسٹور سے شکر اور چائے لے کر واپس آیا۔ چائے کے ساتھ چند توسٹ تیار کر کے اس کے پاس کمرے میں پہنچا۔ وہ بخار کی تپش سے نڈھال تھی، بمشکل اسے اٹھایا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونک اٹھی۔ اور پھر رونے لگی۔

میرے بے حد اصرار پر اس نے ایک توسٹ کھا کر چائے اور دوا پیتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ شاید مرحوم پروفیسر عزت کو آخری لمحات میں دوا بھی نصیب نہ ہو سکی تھی۔

جلد ہی وہ پھر غنودگی میں ڈوب گئی۔ شاید ڈاکٹر نے کوئی مسکن دوا دی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی، رات کے [illegible] رہے تھے۔ گھر میں کوئی نہ تھا، اسے تنہا چھوڑ کر جانے کی ہمت نہ تھی اور اس کے گھر میں رات بسر کرنے میں پس و پیش

...تھی۔ جوان لڑکی تھی۔ میں اس کا کچھ لگتا بھی نہ تھا اور پھر زمانے کی زبان کون پکڑ سکتا تھا۔ عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گیا تھا۔ سوچتا رہا۔ پھر فیصلہ کیا کہ اس عالم میں اسے تنہا چھوڑ کر جانے سے بڑا کوئی گناہ نہ تھا اور پھر میں عمر رسیدہ اور معزز آدمی شمار ہوتا تھا۔

کچھ دیر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے شفاف ماتھے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ سانس کی تیزی میں کچھ کمی آ رہی تھی۔ میں آہستہ سے اٹھ کر کچن میں گیا۔ بچے ہوئے ٹوسٹ کھا کر چائے پی اور پھر وقت گزارنے کے لیے کسی کتاب کی تلاش میں برابر والے کمرے میں گیا۔ کتابوں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ الماری میں سجا ہوا تھا۔ پروفیسر عزت مرحوم تاریخ کے استاد تھے۔ علم کا یہ ذخیرہ وہ ورثے میں چھوڑ گئے تھے۔ دنیا کی بے ثباتی دیکھیے یہ خزانہ ان کا پیٹ بھر سکا نہ ان کا علاج کر سکا اور اب ان کی بیٹی بھی انھی حالات سے دوچار تھی۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا خزینہ روح کو تو سیراب کر سکتا ہے، ذہن کی تشنگی مٹا سکتا ہے لیکن انسان کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

میں نے ایک کتاب نکالی تو اس کے پیچھے رکھے ہوئے کاغذات گر پڑے۔ میں نے جلدی سے انھیں اٹھایا۔ تاریخ پر ایک کتاب کا مسودہ تھا۔ میں چند منٹ ان کو پڑھتا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر الماری میں بند کر دیا۔ اور کتاب لے کر فروزاں کے بستر کے قریب پہنچا، وہ پسینے میں تر ہو چکی تھی۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اس کا پسینہ صاف کیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو بخار میں خاصی کمی محسوس ہوئی۔ ہاتھ کا لمس محسوس کر کے وہ کراہی اور پھر خاموش ہو گئی۔ میں نے آرام کرسی اس کے سرہانے کے قریب رکھی اور اس پر دراز ہو کر کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ فروزاں بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے زرد چہرے پر بحالی اور سکون کے آثار نمایاں تھے۔ میں آہستہ سے اٹھا، منہ ہاتھ دھو کر چائے بنائی، انڈے ابالے اور ناشتا تیار کر کے اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ شاید آہٹ سے بیدار ہو گئی تھی۔ چند لمحے حیران اور کھوئی کھوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، میں نے لپک کر اسے سہارا دیا۔

"آپ۔۔۔ ساری رات جاگتے رہے؟" اس نے نحیف لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ بڑی گہری نیند سویا۔ تو پہلے تم ناشتا کر لو۔"

"لیکن۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی میری وجہ سے۔"

ایک بہن کا پیغام
اپنی بہنوں کے نام!

پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے ہندوستان میں میرے دادا (مرحوم) ایک ممتاز خاندان کے صاحب علم شخص تھے جنھیں طب مشرق و مغرب دونوں سے گہرا لگاؤ تھا اور مطلب فرماتے تھے۔ جس ضرورت مند مریض کو دیکھتے یونانی یا پھر انگریزی نسخوں کے ذریعے اس کا علاج کرتے۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت عبادت الٰہی میں ہی گزارتے۔ ایک دن انھیں ضرورت مندوں میں ایک ایسی بہن بھی اپنی شکایت لیکر پہنچی جو نسوانی بیماریوں میں مبتلا برسہا برس سے اولاد کیلئے ترس رہی تھی۔ دادا جان نے اس بہن کو ایک نسخہ دیا اور پابندی سے استعمال کی ہدایت کی اور کہا انشاء اللہ جلد ہی تمہاری گود ہری ہو جائے گی۔ میں نے خود دیکھا کہ وہ بہن جلد ہی اولاد کی نعمت سے مالا مال ہو گئی لہٰذا یہ بہن اپنی جیسی بہت سی بہنوں کو دادا جان سے ملانے لائی جن کے ہاں کئی کئی برس سے اولاد نہیں ہوئی تھی خدا نے ان کو بھی شفا بخشی۔ غرض کہ ہر وقت ایسی ہی بہنوں کا نہ صرف مطب میں تانتا بندھ گیا بلکہ ملحقہ ہمارے گھر میں بھی ایسی دکھی بہنیں آنے لگیں مجبوراً مجھے ان سے بات کرنا پڑتی، رفتہ رفتہ مجھ میں بھی خدمت کا جذبہ پیدا ہو گیا میں نے دادا جان سے اس نسخے کو جاننا چاہا مگر وہ ٹال دیتے۔ ہم سب پاکستان آ گئے۔ ۸۸ ویں سال میں وہ سخت بیمار پڑ گئے ایک دن کہنے لگے بیٹا! میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، میں تمہیں اپنے کئی نادر تجربات و پرہیز و ہدایات بتائے جا رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ میری طرح تم بھی دکھی عورتوں کی خدمت کرتی رہو گی۔ دادا جان نے بڑے وثوق سے فرمایا تھا کہ چاہے کتنے ہی عرصے سے اولاد نہ ہو رہی ہو اس نسخے کے استعمال سے اولاد کا ہونا یقینی ہے۔ چورانوے سال کی عمر میں دادا جان خالق حقیقی سے جا ملے۔

پاکستان میں مجھے بہت سی عورتیں ایسی نظر آئیں جو اولاد سے محروم تھیں۔ میں نے دادا جان کی ہدایت کے مطابق ان بہنوں کو یہ نسخہ تیار کر کے استعمال کرایا اور خدا نے انھیں شفا بخشی۔ شفا پانے والی بہنوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس نسخے کو عام کر دوں تاکہ ہر بہن تک یہ نسخہ پہنچ سکے۔ اس نسخے کے استعمال سے نہ صرف ایسی بہنوں کو اولاد کی نعمت حاصل ہوتی ہے (خواہ وہ کتنے ہی عرصے سے اولاد سے محروم رہی ہوں) بلکہ ایسی بہنیں خواہ وہ غیر شادی شدہ ہی کیوں نہ ہوں اور کسی بھی نسوانی شکایت میں مبتلا ہوں اب قطعی فکر نہ کریں ہزارہا بہنیں مستفید ہو چکی ہیں انشاء اللہ آپ کو بھی شفا حاصل ہوگی۔ اپنی مکمل کیفیت ہمراہ جوابی لفافے کے مجھے لکھ بھیجیں۔ آپ کی خدمت کر کے مجھے مسرت ہوگی۔

آتیہ خانم

پتہ:۔ پوسٹ بکس 2188 کراچی 18 پاکستان

"شکریہ بعد میں ادا کر لینا، پہلے ناشتا کرلو۔" میں نے اُسے بزرگانہ انداز میں نصیحت کی۔

ناشتے کے دوران وہ بار بار مجھے کن انکھیوں سے دیکھتی رہی۔ میں اُس کی الجھن اور پریشانی کو سمجھ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی کو ہمدردی اور توجہ نصیب ہو تو فکرمند ہونا قدرتی بات ہے۔

اس نے بمشکل سے چند سلائس اور ایک انڈا کھایا۔ میں دوا دینے لگا تو اُس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کیوں اتنی زحمت کر رہے ہیں؟"

"یہ زحمت نہیں فرزاں۔ ایک ادنیٰ سا فرض ہے ۔۔۔ آخر پروفیسر عزت میرے بزرگ ساتھی تھے۔"

"میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

اس ایک جملے میں اُس کی پوری داستان پوشیدہ تھی۔ اس کے دل کا سارا کرب چھپا ہوا تھا۔ اُس وقت آپ کہاں تھے؟ جب آپ کا بزرگ ساتھی افلاس اور بیچارگی کے عالم میں بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا۔ اُس وقت آپ کو کیوں خیال نہیں آیا، جب وہ علاج کے بغیر موت کی تاریکیوں میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ محبت اور ہمدردی اس وقت کہاں کھو گئی تھی؟

"میں شرمندہ ہوں فرزاں!" میں نے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ مجھے تمھارے والد سے ملاقات کا شرف کبھی نہ حاصل ہوا تھا۔ کل پہلی مرتبہ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کن حالات سے دوچار تھے۔ اور پھر میں دیر تک اُن کے بارے میں سوچتا رہا۔ تمھارے حالات اور مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہی سب کچھ دریافت کرنے میں یہاں آیا تھا۔"

اس کی آنکھیں پھر اشکبار ہو گئیں۔

"نہیں فرزاں ۔ میں نے تم پر رحم نہیں کھایا ہے ۔ احسان نہیں کیا ہے ۔ صرف ایک فرض ادا کیا ہے۔"

"میں آپ پر بار نہیں بننا چاہتی۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں بھی دنیا میں تنہا ہوں، بالکل تمھاری طرح۔ صرف ایک بہن ہے وہ بھی بہت دور۔ اور پھر کسی کو تو یہ احسان کرنا ہی چاہیے تھا۔"

"پاپا نے کبھی کسی کا احسان نہیں لیا۔ کسی پر اپنے حالات کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔"

"میں جانتا ہوں ۔ جو تمام زندگی دوسروں پر احسان کرتا رہا ہو وہ کیسے کسی کا مرہونِ منت ہو سکتا تھا۔" میں نے اُسے تسلی دی۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میں اس جواب پر حیران نہیں ہوا۔ باپ کی طرح وہ بھی کسی کی احسانمندی کو بار تصور کرتی تھی۔

"تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"جی ۔۔۔ کچھ نہیں ۔۔ یہ مکان خالی کرنا ہوگا۔ جو کچھ سامان ہے اُسے بیچ دوں گی اور کہیں ملازمت کر لوں گی۔"

مجھے دھچکا سا لگا۔ گھر میں تھا ہی کیا جو وہ بیچ دے گی اور اس حالت میں اسے ملازمت کون دے گا؟ شاید وہ میری خاموشی کو بھانپ گئی تھی۔

"پاپا کی ایک پرانی کار بھی ہے۔" اس نے کہا۔ "بہت مدت سے مرمت کے لیے گیراج میں پڑی ہے۔"

"اوہ۔" میں نے چونک کر کہا۔ "رات میں کتاب تلاش کر رہا تھا تو اُن کے چند مسودے دیکھے تھے۔"

"ہاں ۔ انھوں نے تین کتابیں لکھی تھیں۔" اس نے بتلایا۔ "ایک کتاب کا مسودہ کسی پبلشر کو دیا بھی تھا۔"

"اس نے کتاب شائع نہیں کی؟"

"پاپا نے اس کو خط لکھا تھا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔"

"میرا خیال ہے اُن کے مسودوں کا بہت معقول معاوضہ مل سکتا ہے ۔ میں ۔ میرا مطلب ہے اگر تم اجازت دو تو میں اس سلسلے میں کوشش کروں؟"

"آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

"نہیں فرزاں ۔ تم اس انداز میں نہ سوچو۔" میں نے کہا۔ "میں خود نہیں چاہتا کہ تم کسی کی دستِ نگر رہو ۔ ابھی تمھاری صحت ایسی نہیں کہ ملازمت کر سکو ۔ اگر تمھارے پاپا کی کتابوں کا پیشگی معاوضہ مل جائے تو تم اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکو گی۔"

"کیا... کیا یہ ممکن ہے؟" اس کی آنکھوں میں پہلی بار میں نے امید کی جھلک دیکھی تھی۔

"مجھے پورا یقین ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "دراصل اس چھوٹے سے شہر میں یہ کام دشوار ہے لیکن میں ایک پبلشر سے واقف ہوں۔ اس کو آج ہی لکھوں گا۔"

"میں آپ کی احسان مند ہوں گی۔"

"ہشت ۔۔ آئندہ یہ لفظ نہ کہنا۔" میں نے اسے بزرگوں کی طرح ڈانٹا۔ "میں عمر میں تم سے کافی بڑا ہوں اور بڑوں کے سلوک کو احسان نہیں کہتے۔"

وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ "میں کوئی بچی نہیں ہوں ۔ تیس سال کی ہوں۔" اس نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "پاپا زندہ تھے تو کچھ نہیں کرنے دیتے تھے ۔ جب بھی میں نے ان سے ملازمت کہا وہ غمزدہ ہو جاتے تھے۔ پھر وہ اتنے بیمار ہو گئے کہ میں اُن کو نہ چھوڑ سکتی تھی ۔ لیکن اب ملازمت کر سکتی ہوں۔"

"ہاں ۔ پوری طرح صحتیاب ہونے کے بعد۔"

"لیکن ۔"

"لیکن کا مطلب مجھے معلوم ہے۔ اس دوران جو کچھ اخراجات ہوں گے، تم اسے قرض تصور کر لو۔ پاپا کے مسودوں کے معاوضے یا اپنی تنخواہ سے مجھے ادا کر دینا۔"

اُس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔ "آپ کو اتنی زحمت کیونکر دے سکتی ہوں؟"

"پھر کیا کرو گی؟" ہم نے غصے میں پوچھا۔ "کوئی رشتہ دار ہے تمھارا؟"

"نہیں۔"

"تمھارے پاپا نے کوئی رقم چھوڑی ہے؟"

اس نے کرب بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"تم پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہو۔" میں نے کہا۔ "بولو پھر کیا کرو گی؟ کہاں سے اخراجات پورے کرو گی؟ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ تم بے حد کمزور ہو، خون کی کمی ہے، پرانی کھانسی ہے، اس حالت میں کیسے کرو گی ملازمت؟ میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہی ہو۔ میں کون لگتا ہوں تمھارا، کس لیے ہمدردی جتا رہا ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "آپ غلط نہ سمجھیے۔"

"تو پھر آئندہ اس سلسلے میں کچھ نہ کہنا۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے کالج جانا ہے لیکن وہاں سے ایک بجے تک آجاؤں گا، اس وقت آرام کرو۔ بھوک لگے تو یہ پھل رکھے ہوئے ہیں اور یہ جگ میں پانی بھی موجود ہے۔ اب سو جاؤ۔"

دن گزرتے رہے مسلسل علاج سے فروزاں کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ اب وہ چلنے پھرنے لگی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر پروفیسر عزت مرحوم کے مسودوں کے اوراق ترتیب دیے۔ میں نے مختلف پبلشروں کو خطوط لکھے لیکن مجھے معلوم تھا کہ علمی کتب کی اشاعت کتنا مشکل مرحلہ ہے۔ پبلشر ایسی کتابوں کی اشاعت پر تیار بھی ہوں تو معاوضہ ادا کرنے میں کتنی کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں لیکن اس ساری کوشش نے فروزاں کی آس ضرور بندھا دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں امید کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔

ایک دن پھر اُسے بخار آ گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے صاف بتلا دیا تھا کہ فروزاں کی کمزوری شدید بیماری کا سبب بن سکتی تھی۔ جسم میں خون نہیں تھا اور وہ ذہنی مریض بھی ہوتی جا رہی تھی۔ اسے خوش نہ رکھا گیا اور توجہ سے علاج نہ کیا گیا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس شام میں خوش خوش فروزاں کے پاس پہنچا اور ایک ہزار روپے اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "مبارک ہو فروزاں۔ یہ پہلے مسودے کا پیشگی معاوضہ ہے۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "کتاب کی اشاعت پر پبلشر نے معقول معاوضہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

وہ دیر تک میری آنکھوں میں جھانکتی رہی جیسے حقیقت تلاش کر رہی ہو۔ "پاپا کو کبھی کسی پبلشر نے پیشگی معاوضہ نہیں دیا۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا لیکن پھر بھی بات سنبھالنے کی کوشش کی۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا۔ یہ پبلشر میرا دوست ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اخلاق صاحب! کب تک آپ مجھے اس طرح تسلی دیں گے، میں بچی نہیں ہوں، سب سمجھتی ہوں۔"

"فروزاں! اگر تم سمجھتی ہو تو اسے قرض سمجھ کر قبول کر لو۔ معاوضہ ملے گا تو واپس کر دینا۔"

"میرے پاس اس کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں نے اپنے حالات پر بہت غور کیا ہے اخلاق صاحب! آپ سہارا نہ دیتے تو اب تک جانے میرا انجام کیا ہوتا لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ آخری رقم ہے جو میں آپ سے قبول کر رہی ہوں۔ فی الحال اس سے گزارا ہو جائے گا۔ اس دوران خواہ کچھ بھی ہو، میں اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کی کوشش کروں گی۔ مجھے مزید شرمندہ نہ کیجیے گا۔"

"میں نے کبھی تم کو شرمندہ کرنے کی کوشش نہیں کی فروزاں!"

"بیشک۔ آپ کا یہ ارادہ نہیں تھا لیکن تھوڑی سی جو عزتِ نفس باقی رہ گئی ہے اُسے تو رہنے دیجیے۔"

"تم مجھے اتنا غیر کیوں سمجھتی ہو؟"

"آپ سے آخر میرا کیا رشتہ ہے؟" اُس نے صاف گوئی کے ساتھ کہا۔ "میں آپ کے لیے اجنبی ہوں، پھر آپ کیوں میرے لیے اتنا درد محسوس کرتے ہیں؟"

بیشک میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن میں اُسے کیسے بتلاتا کہ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کو اپنا محسوس کیا تھا۔ "انسانیت سے بڑا رشتہ اور کون سا ہو سکتا ہے فروزاں؟" میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں آپ کے جذبے کی قدر کرتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن دنیا میں مجھ سے زیادہ دُکھی انسان موجود ہیں، اسی شہر میں ہوں گے۔ آپ نے اب تک میرے لیے جو کچھ کیا ہے یہی بہت کافی ہے۔ غلط نہ سمجھیے گا اخلاق صاحب! میں اس سے زیادہ آپ کے احسان کا بار نہیں اٹھا سکتی۔ اب آپ براہِ کرم یہاں آنے کی زحمت نہ کیجیے گا۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ مجھے اچانک دھچکا لگا تھا۔

"اس لیے کہ میں آپ کے احسانات کا بدلہ نہیں اتار سکتی۔"

"اوہ ۔ فروزاں تم سے یہ کس نے کہا کہ میں یہ سب کچھ احسان سمجھ کر کر رہا ہوں۔"

"کہنے کی کیا ضرورت ہے ۔ میں آپ کی کیا لگتی ہوں! آپ کیوں میرے لیے اتنا پریشان ہیں؟"

میں کیا جواب دیتا، بلاشبہ وہ میری کچھ نہ لگتی تھی۔ میرا اس کا کوئی رشتہ نہ تھا لیکن کیا یہ حقیقت تھی؟ اور اچانک یہ حقیقت میرے ذہن میں عیاں ہو گئی ۔ لاشعور میں چھپی ہوئی بات حقیقت بن کر سامنے آ گئی۔ میں نے اس کی سمت دیکھا۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے۔

"فروزاں! تم بھی چاہو تو مجھ پر احسان کر سکتی ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں! ... کیوں مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس دلاتے ہیں آپ؟"

"دنیا میں کوئی بھی کم مایہ نہیں ہوتا فروزاں تم نے ابھی کہا تھا کہ میرا تمھارا کیا رشتہ ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ رشتہ قائم ہو جائے۔"

"جی! کیا مطلب؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"غور سے سنو فروزاں! میں کالج میں ملازمت کرتا ہوں۔ معقول تنخواہ پاتا ہوں، آرام سے زندگی بسر کرتا ہوں۔ اس کے باوجود خود کو بے سہارا محسوس کرتا ہوں۔ دنیا میں کوئی نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میرا بھی کوئی گھر ہے۔ شاید زندگی میں اسی کمی کا احساس مجھے تم سے اتنا قریب لے آیا ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھ سے؟ آپ؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں تم سے فروزاں! تم پڑھی لکھی ہو، گھر بار چلانے کا تجربہ رکھتی ہو اور مجھے کیا چاہیے۔"

"لیکن میں... میرے پاس کیا ہے۔ ایک بیمار لڑکی ہوں جس کا وجود خود اپنے لیے بار ہے۔"

"تمھاری صحت ٹھیک ہو جائے گی۔ بیشک میں عمر میں تم سے بڑا ہوں لیکن دونوں مل جل کر ایک دوسرے کا بار اٹھا سکتے ہیں۔"

"آپ کب تک میری ہمدردی میں قربانیاں دیتے رہیں گے، کب تک؟" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"میں کوئی قربانی نہیں دے رہا ہوں فروزاں۔ نہ یہ فیصلہ تم پر رحم کھا کر کر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا محبت کیسی ہوتی ہے لیکن میں نے ہمیشہ تم کو اپنے قریب محسوس کیا ہے۔ تمھارے درد کی ٹیسیں محسوس کی ہیں۔ تمھارے آنسوؤں کی تپش کا احساس کیا ہے۔ تم اسے محبت کہو یا ہمدردی لیکن میں جانتا ہوں کہ ہم ایک اچھے دوست اور اچھے ساتھی کی طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے لیے یہ ایک نیا تجربہ ہوگا لیکن ہمارے درمیان باہمی اعتماد کی کمی نہیں ہے۔ ہم اپنی زندگی خود تعمیر کر سکتے ہیں۔ بولو فروزاں! کیا تم مجھے قبول کر سکتی ہو؟"

"میں... میں نہیں جانتی۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم خوب اچھی طرح غور کر لو فروزاں! مجھے جواب کی جلدی نہیں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بیشک مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔ میں عمر میں تم سے بہت بڑا ہوں۔۔۔"

"نہیں۔ نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں۔ کوئی بھی لڑکی آپ کی شریک حیات بننے میں فخر محسوس کرے گی لیکن ...."

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں فروزاں! کوئی بھی لڑکی سے نہیں فیصلہ تم کو کرنا ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا اخلاق صاحب! ڈرتی ہوں کہ آپ پر ایک بوجھ نہ بن کر رہ جاؤں۔"

"میں اس بوجھ کو اٹھانے کی سکت رکھتا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ خوشی اور کسی کام میں نہ ملے گی۔"

"لیکن اخلاق صاحب!"

"اخلاق صاحب نہیں، اخلاق کہو فروزاں ۔ بشرطیکہ تم کو یہ منظور ہو۔"

"جی اخلاق۔" اس نے آہستہ سے کہا اور نظریں جھکا لیں۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا۔

ہماری شادی بڑی سادگی سے ہو گئی۔

فروزاں کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ میں خود تنہا تھا۔ ہم دونوں کی اس محرومی کو جمال نے دور کر دیا۔ وہ کالج میں کیمسٹری کا لیکچرر تھا۔ اس کی خوشدامن اور لڑکی نے فروزاں کو اتنی اپنائیت سے رخصت کیا جیسے وہ ان کے گھر کی بیٹی ہو۔ جمال کی مہربانی سے ہمیں اس کے بالکل برابر ایک خوبصورت سی کاٹیج کرائے پر مل گئی۔ شہر سے دور ہونے کے باوجود جہانگیر آباد کا علاقہ بڑا خوبصورت اور پرسکون تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جو جمال کے باغیچے سے بالکل ملحق تھا۔ دونوں کے درمیان صرف ایک معمولی سی خاردار باڑھ تھی۔ جمال کی خوشدامن بہت خلیق اور محبت والی خاتون تھیں۔ جمال کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی نو سالہ اکلوتی لڑکی نازنین بڑی محبت کے ساتھ فروزاں سے دوستی

Farrukh Malik

لی اور ایسے گھل مل گئی جیسے برسوں سے جانتی ہو۔

ہم جب اپنے مکان میں منتقل ہوئے تو فروزاں کو بخار تھا۔ شادی کے بعد وہ تین چار دن بستر سے نہ اُٹھ سکی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ میں اس کے جذبات کو سمجھ رہا تھا۔ وہ اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ وہ خود کو ایک ایسا بار تصور کر رہی تھی جو اُس کے خیال میں صرف ہمدردی کے شانوں پر اٹھایا گیا تھا لیکن میں نے یہ شادی اُس پر رحم کھا کر نہ کی تھی۔۔۔ میں اس جذبے کو محبت کا نام بھی نہ دے سکتا تھا۔ بس کسی کو اپنا لینے کی آرزو تھی۔ کسی خلاء کو پُر کرنے کی خواہش تھی۔ کسی کو زندگی کی راہ میں ہمسفر بنانے کی تمنا تھی۔۔۔ اور فروزاں نے اس تمنا کو پُورا کر دیا تھا۔

میں نے گھر کو سلیقے کے ساتھ سجایا۔ میں اسے کھانا کھلاتا۔ اس کی دوا کا خیال رکھتا۔ اُس کے پاس بیٹھ کر ایسی باتیں کرتا جو اس کی اداسی اور مایوسی کو دور کر سکیں۔ ابتدا میں وہ مجھے تشکر بھری نظروں سے دیکھتی رہتی۔ میں نے اس کی نظروں میں محبت کے بجائے پرستش کی جھلک دیکھی۔ وہ مجھے اس طرح گھورتی رہتی جیسے میں حقیقت نہیں ایک خواب ہوں۔ جیسے آنکھ کھلتے ہی میرا سہارا دور ہو جائے گا۔

دن گزرتے رہے، اس کی صحت آہستہ آہستہ بحال ہونے لگی۔ رخساروں میں زردی کی جگہ لالی جھلکنے لگی۔ ویران اور سوگوار آنکھوں میں زندگی کی چمک پیدا ہونے لگی۔ پھر وہ ایک دن بستر سے خود اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی صحت کی بحالی پر بڑی خوش نظر آ رہی تھی میرے کالج جانے کے بعد وہ تنہا رہتی تھی۔ جمال کی مہربانی سے مجھے سائرہ مل گئی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی سنجیدہ اور سلیقہ مند۔ فروزاں نے شکوہ بھی کیا کہ میں یہ فضول خرچی نہ کروں۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ جب تک وہ بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتی، سائرہ گھر کے کام کاج کے علاوہ اس کی بھی دیکھ بھال کرتی رہے گی۔ سائرہ نے چند ہی روز میں اس کو دوست بنا لیا۔ میرے ذہن سے ایک اور فکر دُور ہو گئی۔

فروزاں کے رخساروں پر تندرستی کی لالی جھلکنے لگی تھی۔ اس میں زندہ رہنے کی آرزو پیدا ہو چکی تھی۔ ایک دن میں کالج سے واپس آیا تو دیکھا کہ وہ باغیچے میں بیٹھی گلاب کی کیاری ٹھیک کر رہی تھی۔ ہاتھ مٹی میں لت پت تھے میں بے ساختہ مسکرا دیا۔ اس نے بتلایا کہ باغبانی اُس کا پُرانا شوق ہے۔ میں نے اُسے منع کیا کہ ابھی زیادہ محنت نہ کرے۔ اور سہارا دے کر اندر لے گیا۔ اس دن وہ بہت خوش رہی۔ دو تین دن بعد میں گھر میں داخل ہوا تو فروزاں نظر نہ آئی۔ باغیچے میں بھی نہ تھی۔۔۔ میں پریشان ہو گیا لیکن کچن سے اچانک عقبی صحن میں نظر پڑی تو دیکھا کہ وہ کرسی پر بیٹھی بالوں کو برش کر رہی تھی۔ اس کے بال بڑے خوبصورت تھے۔ غسل کر کے اس نے لباس تبدیل کیا تھا۔ کمزور جسم اب کچھ گداز نظر آنے لگا تھا۔ وہ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ محبت کی حرارت کیا ہوتی ہے اور پہلی بار یہ احساس بھی ہوا کہ فروزاں ایک عورت بھی تھی۔ صحت اور توانائی کے بعد وہ کتنی دلکش ہو جائے گی، اس کی جھلک واضح تھی۔ بڑی پُراسرار لڑکی تھی۔ خود غمزدہ ہونے کے باوجود میری دل جوئی کے لیے فکرمند رہتی تھی۔

کچھ عرصے بعد فروزاں بالکل صحتیاب ہو گئی تو یوں لگا جیسے بدلی سے چاند نکل آیا ہو۔ ہم نے اس کی صحتیابی کا جشن تنہائی میں منایا۔ اُس دن فروزاں نے خود کھانا پکا کر دعوت کا اہتمام کیا۔ ہم دونوں رات کو دیر تک خوشگوار مستقبل کی باتیں کرتے رہے۔

چند روز بعد جمال نے فروزاں کی صحت یابی کی خوشی میں ہماری دعوت کی۔ شادی کے بعد وہ پہلی بار گھر سے باہر نکلی تھی میری لائی ہوئی نیلی ساری میں وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ میں نے تعریف کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”یہ صحت اور حسن بھی آپ ہی کا عطیہ ہے۔“ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”نہیں فروزاں! یہ خدا کی مہربانی ہے۔ اُس نے تم کو حسن و جمال سے نوازا ہے۔ تم نے زندہ رہنے کی لگن پیدا کی تو مرجھائے ہوئے پھول میں شگفتگی آ گئی۔“

”آپ نہ ہوتے تو نہ یہ لگن پیدا ہوتی اور نہ یہ پھول شگفتہ ہوتا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا مجھے بے پناہ مسرت کا احساس ہوا۔

جمال نے بڑا اہتمام کیا تھا اس کی خوشدامن نے معذور ہونے کے باوجود فروزاں کی خاطر مدارات میں گرمجوشی اور محبت کا مظاہرہ کیا۔ نازلی تو جیسے اُس پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ آنٹی فروزاں کے حسن، اُس کے لباس کی خوبصورتی کی اتنی تعریف کی کہ فروزاں کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ میں خود بھی تصور نہ کر سکتا تھا کہ نحیف، بیمار اور زندگی سے مایوس فروزاں ایک دن ایسی نکھر جائے گی۔ رات کو دس بجے کے قریب ہم گھر واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ فروزاں دریچے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

”دعوت بڑی پُرلطف رہی۔ کیوں فروزاں!“ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”میں تو سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ زندگی میں اتنی مسرتیں بکھری ہوئی ہیں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”میں اس سے پہلے کسی

Farrukh Malik

دعوت میں نہ گئی تھی۔"

میں تڑپ اٹھا۔ کیسی محرومیوں کا شکار رہی تھی یہ لڑکی۔ "اب تم آرام کرو فروزاں۔ کافی تھک گئی ہو گی۔" میں نے محبت سے کہا۔ وہ مسکرا دی۔

دو ماہ اور گزر گئے۔ فروزاں اب بالکل صحت مند ہو چکی تھی۔ میں نے اسے کئی خوبصورت ساڑیاں لا کر دی تھیں۔ اسے ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ میں بہت خرچ کر رہا ہوں۔ میں جب بھی اسے کوئی چیز لا کر دیتا وہ اس کی قیمت پہلے پوچھتی تھی۔ بے چاری کے ذہن پر افلاس کا خوف اب تک سوار تھا۔ ہمارا گھر کالج سے بہت دور تھا۔ مجھے روزانہ بس پر آنے جانے میں خاصی دیر لگتی تھی۔ ایک دن اس نے یاد دلایا کہ پروفیسر عزت کی پرانی کار گیراج میں پڑی ہے کیوں نہ اس کی مرمت کرا لی جائے۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ ہم دونوں کو اب تک یہ خیال ہی نہ آیا تھا۔ میں اسی دن گیراج پر گیا۔ ایک ہفتے بعد تقریباً دو ہزار خرچ کر کے کار گھر پر آ گئی۔ کار پرانی ضرور تھی لیکن مستری نے اسے استعمال کے قابل بنا دیا تھا۔

میں کالج سے واپس آیا تو فروزاں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔ وہ اتنی دل کش لگ رہی تھی کہ میں ایک لمحے کو دم بخود رہ گیا اور اسے والہانہ نظروں سے گھورتا رہا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ میری بیوی بھی تھی اور اس کا یہ دلکش وجود اور حسن و جمال سب کچھ میرا تھا۔

"یہ آپ آج مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو فروزاں۔ میں نے فروزاں کے اس روپ کو آج پہلی بار دیکھا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ زندگی سے بیزار فروزاں کوئی اور تھی۔"

"خیریت تو ہے۔ یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے!"

"آج ۔۔۔ آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم جشن منائیں گے۔"

"کیسا جشن؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ تو تم جانتی ہو کہ ہم اجنبی نہیں ہیں۔ آج تک ہم دونوں نے بالکل اجنبیوں کی طرح زندگی بسر کی ہے لیکن تم میری شریکِ حیات ہو فروزاں! جس کو میں بے پناہ محبت کرتا ہوں۔"

اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ آنکھوں میں خمار سا آگیا۔ رات میں نے ضد کر کے ہوٹل میں کھانے کا پروگرام بنایا۔ فروزاں بہت خوش تھی۔ ہم اپنی کار میں پیراڈائز ہوٹل پہنچے۔ موم بتیوں کی روشنی اور دھیمی موسیقی کی دھنوں کے روح پرور ماحول میں ہم نے کھانا کھایا۔ رات تقریباً گیارہ بجے ہم گھر کے لیے واپس ہوئے۔ ہم دونوں گوشت پوست کے بنے جیتے جاگتے انسان تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے شریکِ حیات تھے لیکن ہم دونوں محبت کے ان جذبوں سے ناآشنا تھے جو زندگی کو حرارت بخشتے ہیں، جو دلوں کو ان شادمانیوں سے ہمکنار کرتے ہیں جو محبت کا ماحصل ہیں۔ ہمارے دل کی دھڑکن اس انجانے احساس سے تیز ہو رہی تھی۔ ہماری محبت کے احساس کی آنچ تیز ہو رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے بازو میں ہاتھ ڈالے کار کی سمت بڑھے۔

"کار میں چلاؤں گی۔" فروزاں نے کہا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "پاپا نے مجھے ڈرائیونگ خود سکھائی تھی۔" اس نے بتلایا۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔

وہ بڑے اطمینان سے کار چلا رہی تھی۔ ہوا سے اس کے اڑتے ہوئے بال میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو مجھے مخمور کیے دے رہی تھی۔

ابھی ہم گھر سے دور تھے کہ ایک موڑ پر اچانک سامنے سے آنے والی کار کی تیز روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ فروزاں نے پھرتی سے اسٹیئرنگ گھمایا لیکن اگلے ہی لمحے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور میری نگاہوں میں تاریکی چھا گئی۔

آنکھ کھلی تو ایسا لگا کہ میں ہوا میں معلق ہوں۔ ہلنے کی کوشش کی تو کامیاب نہ ہو سکا۔ سارے بدن میں ٹیس سی اٹھی اور میں کراہ دیا۔

"شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا۔" ایک مترنم سی آواز سنائی دی۔ میں اسپتال کے بستر پر پلاستر میں جکڑا ہوا پڑا تھا۔ ٹانگ چھت سے لگے کنڈے میں بندھی رسی سے معلق تھی۔ سرہانے کھڑی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ "آرام سے لیٹے۔ آپ خوش قسمت ہیں جو بچ گئے۔"

مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ "فروزاں ۔۔۔ میری بیوی ۔۔۔ ہے؟ وہ کیسی ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"فکر نہ کریں ۔۔۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" نرس نے تسلی

"ٹھیک ہیں! یہ کیسے ممکن ہے۔ تم جھوٹ بول رہی

"نہیں جناب ۔۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ ٹھیک

اس نے یقین دلایا۔ "حادثے سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اب ۔۔۔ کر رہی ہیں۔"

وہ شاید مجھے جھوٹی تسلی دے رہی تھی۔ حادثہ اتنا خطرناک تھا، سامنے سے آنے والی کار سے زبردست ٹکر ہوئی تھی، فروزاں کار چلا رہی تھی، پھر وہ کیسے ٹھیک ہو سکتی تھی؟

"نرس! خدا کے لیے مجھے سچ بتلا دو۔" میں نے کہا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں مسٹر اخلاق۔" نرس نے یقین دلایا۔ "وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"آج کون سی تاریخ ہے؟ میں کب سے اسپتال میں ہوں؟"

"آج اپریل کی بارہ تاریخ ہے اور آپ گزشتہ رات سے یہاں ہیں۔" نرس نے بتلایا۔

"اگر فروزاں بالکل ٹھیک ہے تو یہاں کیوں نہیں آئی؟"

"اوہ۔ ان کو چوٹ نہیں آئی لیکن حادثے سے شدید صدمہ پہنچا ہے۔" نرس نے کہا۔ "ڈاکٹر نے انھیں نیند کی دوا دی ہے۔"

ڈاکٹر کی آمد پر نرس کی اطلاع کی تصدیق ہو گئی۔ فروزاں بالکل ٹھیک تھی۔ میری فروزاں معجزانہ طور پر بال بال بچ گئی تھی۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ مجھے اس سے کتنی گہری محبت ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے شاید مسکن دوا دی تھی کیونکہ جلد ہی میں گہری نیند سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو طبیعت بالکل ٹھیک تھی صرف ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا۔ ایک ٹانگ بالکل بے حس لگ رہی تھی۔ نرس دوا دینے آئی تو میں نے اس سے حسبِ معمول فروزاں کی خیریت پوچھی۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

"شاید خواب میں بھی آپ انھی کو دیکھتے رہے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بالکل ٹھیک ہیں وہ، آج ملوا دوں گی آپ سے۔"

"سچ؟" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"بڑی محبت ہے آپ کو اپنی مسز سے؟"

"ہاں سسٹر۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بے حد۔"

نرس کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا۔ جانے کتنے دن مجھے اسپتال میں رہنا پڑے۔ فروزاں تنہا کیسے رہے گی؟ بیشک جمال اور اس کی خوشدامن خیال رکھیں گی لیکن اگر وہ بیمار پڑ گئی تو؟ اچانک مجھے شیریں آپا کا خیال آیا۔ مصیبت میں اپنے کتنی شدت سے یاد آتے ہیں۔ میں بھی کتنا خود غرض تھا۔ کتنے برسوں سے اُن کی خبر نہ لی تھی۔ آخر وہ بڑی بہن تھیں میری۔ یہ سچ ہے کہ والدین کی موت کے بعد ہم دونوں عموماً الگ ہی رہے تھے۔ دونوں نے اب تک ایک دوسرے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی، وہ ہمیشہ کی آزاد خیال تھیں اور ملازمت کے بعد سے مختلف جگہوں پر تنہا رہ رہی تھیں، شادی بھی نہیں کی تھی۔ انھیں مرد کے نام سے چڑ تھی۔ کچھ بھی ہو وہ چھٹی لے کر آ سکتی تھیں۔

مجھے اُن کا پتا یاد تھا۔ نرس آئی تو اس کو تار کا مضمون لکھوا کر رقم دی اور تاکید کی کہ یہ تار ارجنٹ بھجوا دیا جائے۔

شیریں آپا خلافِ اُمید تیسرے ہی دن آ گئیں۔ وہ فروزاں کو اپنے ساتھ لے کر گھر گئیں۔ فروزاں کا بُرا حال تھا۔ میری حالت دیکھ کر روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ حادثے کا ذمّے دار خود کو تصور کر رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے تسلی دے کر چپ کرایا۔ لیکن شیریں آپا کی آمد تک وہ میرے سرہانے سے نہیں ہٹی تھی۔ اس کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں حلقے پڑ چکے تھے اور مجھے ڈر تھا کہ وہ بھی بیمار نہ پڑ جائے۔

فروزاں کو گھر چھوڑ کر وہ اسپتال واپس آئیں تو مجھے سرزنش کے لہجے میں مخاطب کیا۔ "یہ تم کیا کرتے رہے ہو اخلاق!" انھوں نے کہا۔ "فروزاں سے میں نے سب کچھ پوچھ لیا ہے۔ لگتا ہے تم نے اس کی کسمپرسی پر ترس کھا کر شادی کر لی ہے۔"

"یہ بات نہیں آپا۔ دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا۔ اُسے سہارے کی ضرورت تھی۔" میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اسی وجہ سے میں نے آپ کو آنے کی زحمت دی۔"

"سہارے کے لیے شادی کرنا تو ضروری نہ تھا۔" انھوں نے جواب دیا۔ "تم اس کے بغیر بھی اس کی مدد کر سکتے تھے۔"

"کسی جوان اور تنہا لڑکی کی مدد کرنا آسان تو نہیں آپا۔" میں نے جواب دیا اور پھر "فروزاں بڑی نیک اور اچھی لڑکی ہے۔"

"لیکن وہ عمر میں تم سے بہت چھوٹی ہے اخلاق۔" انھوں نے یاد دلایا۔ "تم اب پچاس سے تجاوز کر چکے ہو، وہ تم کو فرشتہ سمجھتی ہے، دیوتا کی طرح پوجتی ہے، تم نے کام بھی تو فرشتوں والا کیا ہے۔" انھوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں آپا۔ کیوں شرمندہ کرتی ہیں مجھے؟"

"تم ہمیشہ کے رحم دل ہو۔ کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتے۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمھارے احسانات کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے بیچاری۔ کہتی ہے تم نے اُسے موت کے منہ سے نکالا ہے۔"

"وہ بڑی اچھی لڑکی ہے آپا۔"

"بیشک۔ لیکن تم بھی تو بڑے پیارے ہو، خیر کوئی فکر نہ کرو۔ میں ایک ماہ کی چھٹی لے کر آئی ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں آپا۔ لیکن آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتلایا ہی نہیں۔"

"ٹھیک ہوں، ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہوں، دو سال بعد ریٹائر ہو جاؤں گی۔" انھوں نے بتلایا۔ "سچ پوچھو تو اتنے بڑے

شہر کی ہنگامہ خیز زندگی سے تنگ آ گئی ہوں یہاں بڑا سکون ہے؟

میرا دل بہن کی محبت سے بھر آیا۔ "تو پھر مستقل یہیں آ جائیے نا۔ آپ کا اپنا گھر موجود ہے کب تک یوں تنہا زندگی بسر کریں گی آپ؟"

"دیکھا جائے گا۔ پہلے تم پوری طرح صحت یاب ہو جاؤ۔" انھوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "تمھارا تار پا کر تو میں بدحواس ہو گئی تھی۔"

"آپ کے علاوہ اب کون ہے میرا۔" میری آواز بھرا گئی۔

"آپ کے آنے سے بڑی ڈھارس ہو گئی ہے۔"

شیریں آپا مجھے آرام کرنے کی ہدایت کر کے چلی گئیں شام کو جب وہ آئیں تو فروزاں اُن کے ساتھ تھی اداس، غمگین اور شرمندہ سی۔ "اب کیسی طبیعت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔"

وہ رونے لگی۔ "سب کچھ میری غلطی سے ہوا مجھے معاف کر دیجیے۔"

"نہیں فروزاں! یہ محض اتفاق تھا۔ تم بلا سبب خود کو قصوروار نہ سمجھو۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"اخلاق ٹھیک کہتے ہیں تمھارا کوئی قصور نہ تھا۔" آپا نے تائید کی۔

"فروزاں! صرف چند روز کی بات ہے پھر میں گھر آ جاؤں گا۔" میں نے سمجھایا۔ "اب آپا آ گئی ہیں تمھارا ہر طرح خیال رکھیں گی۔"

کچھ دیر بعد دونوں چلی گئیں۔ ٹیکسی میں آپا نے اسے پھر تسلی دی۔ "تم کیوں اس طرح ہلکان ہو رہی ہو؟ تمھارا بھلا کیا قصور تھا۔"

"آپا مجھ سے ان کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔" فروزاں نے کہا۔ "انھوں نے میرے لیے بڑی زحمتیں اٹھائی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں اُسے ہر لمحہ تمھارا خیال رہتا ہے۔"

"وہ میرے لیے۔۔۔۔"

آپا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس کا دل ہمیشہ سے بہت نرم ہے کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتا۔"

"آپا! آپ اندازہ نہیں کر سکتی ہیں کہ مجھے۔۔۔۔ مجھے اُن سے کتنی محبت ہے۔"

شیریں آپا کے ماتھے پر شکنیں آ گئیں۔ "وہ بھی تم سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ عمر میں تم سے بہت بڑا ہے۔"

"میں اُن کا بہت احترام کرتی ہوں آپا۔" فروزاں نے کہا۔

"اب دل پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو، بیمار ہو جاؤ گی تو وہ اور پریشان ہو گا۔"

آپا نے چند روز ہی میں فروزاں کو شاگرد بنا لیا تھا۔ وہ اُسے بولنے کا بہت کم موقع دیتی تھیں۔ بیچاری فروزاں اُن کی ہر بات کی حامی بھرنے کے سوا کچھ نہ کرتی تھی مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ آپا پوری طرح اُس پر حاوی ہو گئی تھیں۔

دن گزرتے رہے۔ پہلے شیریں آپا اور فروزاں ساتھ آتی تھیں۔ وہ دونوں بہت خوش اور مطمئن دکھائی دیتی تھیں۔ آپا نے چند دنوں کے اندر ہی فروزاں میں۔۔۔ خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور محرومی کی پرچھائیوں کی جگہ اب عزم اور حوصلے کی چمک نظر آنے لگی تھی۔ وہ دونوں مجھے حوصلہ دلا کر واپس چلی جاتی تھیں اور میں فروزاں میں پیدا ہونے والی اس تبدیلی پر خوش بھی ہوتا تھا اور حیران بھی۔

پھر کئی مرتبہ شیریں آپا تنہا آئیں۔ پوچھنے پر انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ فروزاں بہت تھک گئی تھی آرام کر رہی ہے۔ انھوں نے دبے الفاظ میں یہ بھی کہا کہ اب مجھے کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے۔ سائرہ کو ملازم رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن میں ٹال گیا۔ جمال اور کالج کے دوسرے ساتھی کبھی کبھی عیادت کو آ جاتے تھے لیکن میں اسپتال میں پڑے پڑے عاجز آ گیا تھا۔

ایک دن فروزاں مجھ سے ملنے تنہا آ گئی۔ اس نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ وہ ملازمت تلاش کر رہی ہے۔

"دیکھیے نا۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی آپ کئی ماہ تک کالج نہ جا سکیں گے۔ چھٹیاں ختم ہو جانے کے بعد تنخواہ بھی نہ ملے گی۔ اور میں بیکار بیٹھ کر کیا کروں گی۔"

بلاشبہ وہ بالکل صحت مند ہو چکی تھی۔ اب وہ پہلے جیسی خاموش طبع اور شرمیلی لڑکی نہیں رہی تھی۔ اس کی بات چیت میں اعتماد آ چکا تھا۔ جھجک کی جگہ بے تکلفی آ چکی تھی۔ آپا نے اس میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ "عورت صرف گھر کی زینت نہیں ہے۔" فروزاں نے کہا۔ "اسے مرد کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ اس کے شانہ بشانہ چلنا چاہیے۔"

"اگر تم کو ملازمت کا اتنا ہی شوق ہے تو میں منع نہیں کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "باغیچے کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہی ہو گا۔ میرا مطلب ہے آج کل اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ اُدھر توجہ کروں۔"

"اوہ۔۔۔ بہت مصروفیت ہے؟"

"آدھی زندگی گھر میں قید رہ کر گزار دی۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اب ذرا دنیا دیکھی ہے۔"

"کیسی لگی یہ دنیا تم کو؟"

"اوہ۔ بڑی دلچسپ لیکن دُنیا میں بڑی کش مکش ہے۔ جدوجہد اور مقابلے کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔"

"خوب۔ مجھے خوشی ہے کہ تم میں اتنا اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ وہ خوشی سے مسکرا دی۔

"سب آپا کی مہربانی ہے۔ انھوں نے مجھے یہ احساس دلایا کہ عورت اِتنی بے بس اور مظلوم نہیں ہے، وہ اپنی دُنیا خود تعمیر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

میں جانے کیوں یہ سُن کر اُداس ہو گیا۔ اب فروزاں میرے سہارے کی محتاج نہیں تھی۔ کیا میں اُسے ہمیشہ اپنا دستِ نگر دیکھنا چاہتا تھا؟

چند روز بعد مجھے اسپتال سے چھٹی مِل گئی۔ بیساکھیوں کے سہارے کھڑا ہوا تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ اب مجھے سہارے کی ضرورت ہے۔ بڑا اذیتناک تھا یہ احساس۔ ڈاکٹر نے بتلایا تھا کہ پنڈلی کی ہڈی چکنا چور ہو گئی تھی اور اس میں اسٹیل کی راڈ ڈالی گئی ہے۔ ضرورت ہوئی تو ایک آپریشن اور ہوگا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی عرصے تک میں بیساکھیوں کا محتاج رہوں گا۔

شام کو فروزاں نے میری گھر واپسی کی خوشی میں جمال کے گھر والوں کو چائے کی دعوت دی۔ نازلی گھر کے ایک فرد کی طرح اہتمام میں لگی ہوئی تھی۔ میں بیساکھیوں کے سہارے کمرے میں داخل ہوا تو فروزاں کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

"تمھیں اس حال میں دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔" جمال نے کہا۔ "لیکن حوصلہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو تمھاری دیکھ بھال کے لیے ایک نہیں، دو سہارے موجود ہیں۔"

میں بے بسی سے مسکرا دیا۔ کبھی یہی مشورہ میں دوسروں کو دیتا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں اب ملازمہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" آپا نے کہا۔ "گھر میں کام ہی کیا ہے۔"

"آپ دونوں پر ملازمت کی دُھن سوار ہے۔ میں اکیلا گھر کیسے سنبھالوں گا؟" میں نے کہا۔

"جب تک آپ بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتے، میں ملازمت نہیں کروں گی۔" فروزاں نے فوراً کہا۔

"ویسے بھی میں کسی ملازمہ پر گھر نہیں چھوڑ سکتی۔" آپا نے کہا۔ "ان عورتوں کا کیا بھروسا؟"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپا!" میں نے کہا۔ "سائرہ بڑی نیک اور ایماندار عورت ہے۔"

"تم عورتوں کے بارے میں کیا جانتے ہو۔ زندگی میں کبھی تمھارا واسطہ پڑا نہیں۔" آپا نے کہا۔

"لیکن آنٹی! سائرہ بہت اچھی عورت ہے۔ ہم اسے بہت دنوں سے جانتے ہیں۔" نازلی نے کہا۔ اُسے بھی آپا کی بات ناگوار محسوس ہوئی تھی۔

جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ گھر پر آپا کا راج ہے۔ پورے گھر کی ترتیب بدل دی گئی تھی۔ خود فروزاں کی حیثیت گھر کی مالک کے بجائے ملازمہ جیسی ہو گئی تھی۔ یہ کام ایسے نہیں ویسے کرو۔ تم کو اس بات کا بھی سلیقہ نہیں۔ تم نے یہ چیز وہاں کیوں رکھ دی۔ فروزاں اُن کے اشاروں پر ناچتی تھی۔ اور پھر میں نے محسوس کیا کہ آپا کو نازلی کی آمدورفت بھی پسند نہ تھی۔ وہ جب تک میرے قریب رہتی، اُن کی کڑی نگاہیں نگرانی کرتی رہتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے ایسی بات کہہ دی کہ میں اچھل پڑا۔

"مجھے پڑوسیوں سے اتنی بے تکلفی پسند نہیں۔" انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپا! جمال کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ اس نے اور نازلی نے فروزاں کا بڑا خیال رکھا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" آپا نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن وہ کسی بلی کی طرح باپ پر نظر رکھتی ہے۔"

"ماں کے انتقال کے بعد جمال نے ہی اُسے پالا ہے۔"

"شاید اسی لیے وہ ڈرتی ہے کہ کہیں جمال دوسری شادی نہ کر لے۔"

"آپ نے یہ اندازہ کیسے کیا؟"

"اِس میں تعجب کی کیا بات ہے! جمال ابھی جوان ہے، خوبصورت ہے۔ ظاہر ہے وہ دوسری شادی ضرور کرے گا۔ تمام عمر یونہی تو نہ بیٹھا رہے گا۔"

"وہ نازلی سے بہت پیار کرتا ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ ایسا کرے۔" فروزاں نے کہا۔

"تم اِن مردوں کو نہیں جانتی ہو۔" آپا نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "یہ عورت کے بغیر خود کو ادھورا تصور کرتے ہیں۔ ممکن ہے وہ ساس کے مرنے کا انتظار کر رہا ہو۔"

"نہیں آپا۔ وہ تو ماں کی طرح جمال سے محبت کرتی ہیں۔"

"ممکن ہے۔ لیکن مجھے تو اس معذور عورت پر رحم آتا ہے۔ بے چاری داماد کے سہارے زندہ ہے۔ میں تو اس بے چارگی پر موت کو ترجیح دوں گی۔"

میں اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر میری ٹانگ ٹھیک نہ ہوئی، اگر میں ہمیشہ کے لیے معذور ہو گیا تو کیا فروزاں بھی میرے بارے میں یہی سوچے گی؟ میں اسے ایک بوجھ محسوس نہیں ہوں گا؟

آخر میں عمر میں اس سے اتنا بڑا تھا۔ پندرہ بیس سال بعد میں اپاہج تصور کیا جاؤں گا۔ خدا نہ کرے جو یہ دن دیکھنا پڑے۔

اسی حالت میں ایک ماہ اور گزر گیا۔ اب اس بات میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ شیریں آپا کو اپنے علاوہ ساری دنیا میں خامی نظر آتی تھی۔ ساری زندگی وہ آزاد اور خود مختار رہی تھیں۔ اُن کی زندگی میں کسی کو دخل نہ رہا تھا۔ اس لیے اب بھی ان کو اپنے کسی فیصلے میں مداخلت گوارا نہ تھی اور اس صورتِ حال سے سب سے زیادہ بیچاری فروزاں متاثر ہوئی تھی۔ شیریں آپا نے اب مستقل یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، وہ ملازمت تلاش کر رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے ہی جال میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔

گھر میں مسلسل پڑے رہنے سے میں ویسے ہی بیزار ہو چکا تھا۔ جمال اور نازلی کبھی کبھی آ ضرور جاتے تھے لیکن انھوں نے بھی شاید آپا کی سرد مہری کو محسوس کر لیا تھا کیونکہ اب اُن کے رویّے میں پہلی سی گرمجوشی نہ رہی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ آپا کے آنے کے بعد فروزاں اب تک اُن کے ساتھ ہی کمرے میں سوتی تھی۔ اس نے میرے کمرے میں منتقل ہونے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ آپا کے رویّے پر جھنجلانے کے باوجود وہ اُن کے اشاروں پر چلتی تھی۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ آپا ہر وقت بے چاری سائرہ کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ بات بات پر ٹوکنا، ہر لمحہ نگرانی کرنا اُن کا معمول بن گیا تھا۔

اس صبح صفائی کرتے ہوئے اتفاق سے سائرہ کے ہاتھ سے شیشے کا گلدان گر کر ٹوٹ گیا۔ چھناکے کی آواز سنتے ہی آپا تیر کی طرح کمرے میں داخل ہوئیں۔

"توڑ دیا۔" انھوں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "فروزاں کتنے شوق سے لائی تھی۔"

"میں نے جان بوجھ کے تو نہیں توڑا ہے۔" سائرہ نے غصے میں جواب دیا اور ٹوٹے ہوئے گلدان کے ٹکڑے جمع کرنے لگی۔ "صفائی کرتے ہوئے ہاتھ سے پھسل گیا۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم نے دانستہ توڑ دیا۔" آپا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "ذرا احتیاط سے کام لیا ہوتا تو نہ گرتا۔"

فروزاں تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ "بہت برا ہوا، لیکن کوئی بات نہیں سائرہ، دوسرا آ جائے گا۔ صرف پندرہ روپے کا تھا۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ ہزار روپے کا تھا۔" آپا نے درشت لہجے میں کہا۔

"میں اس کی قیمت ادا کر دوں گی۔" سائرہ نے آہستہ سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

"آپ بھی حد کرتی ہیں آپا۔ معمولی سا گلدان ٹوٹنے پر اتنا برہم ہو گئیں۔" میں نے کہا۔ "ایک اتفاقی حادثہ تھا۔"

"یہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ اُس نے دانستہ گلدان کو توڑا ہے کیونکہ وہ مجھ سے خار کھاتی ہے۔"

"آپا۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ مجھ سے جلتی ہے کیونکہ میں ہر لمحہ اس کی نگرانی کرتی ہوں۔"

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت؟ میں تم دونوں کی طرح آنکھ بند کر کے گھر کو لٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔" انھوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کوئی بھی نوکر چوری کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

میرا دل چاہا کہ سر پیٹ لوں لیکن فروزاں بھی برداشت نہ کر سکی۔ "آپا یہ غلط ہے۔ سائرہ نے کبھی چوری نہیں کی۔ آپ نے یہ بہت بڑا الزام لگا دیا اُس پر۔"

"تم دونوں کو اس پر اتنا اندھا اعتماد کیوں ہے۔ میرے مقابلے میں تم اس کی حمایت کر رہے ہو؟" وہ غصے سے بولیں۔

"بس ختم کیجیے آپا۔" میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا اس کا کیا مقابلہ۔"

سائرہ اُسی دن ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کتنا دکھ ہوا تھا۔ لیکن وہ بڑی بہن تھیں اس لیے کیا کر سکتا تھا۔ فروزاں بھی کئی دن تک خاموش اور اداس رہی، لیکن ہم دونوں حالات کے ہاتھوں مجبور تھے۔ آپا کا حکم کون ٹال سکتا تھا۔

حالات دن بدن کشیدگی کا رخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ میرا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں مطالعہ کرنے میں گزرتا تھا۔ ہم شیریں آپا کے معمولات کے عادی ہو چکے تھے۔ ہر چیز کا وقت مقرر تھا۔ ناشتہ، کھانا، چائے اور تفریح، سب مقررہ اوقات میں ہونے لگے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ فروزاں مجھ سے دور دور رہنے لگی تھی۔ وہ تنہا میرے کمرے میں نہ آتی تھی۔ کھوئی کھوئی، اداس اداس اور فکرمند فروزاں ایک اجنبی سی نظر آتی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے بھی وہ مجھ سے آنکھ نہ ملاتی تھی۔

"کیا بات ہے فروزاں!" ایک دن موقع ملتے ہی میں پوچھ لیا۔ "یہ تم کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا آپا نے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں تو۔" اُس نے جلدی سے کہا۔ "وہ تو میرا بہت خیال

رکھتی ہیں۔" لیکن اس کے لہجے کی تلخی نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

"کاش میں نے انہیں نہ بلایا ہوتا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ اپنے علاوہ کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ وہ آپ کی بڑی بہن ہیں۔" وہ پھرتی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

میں حیران تھا کیسی عورت تھی فروزاں۔ ہر بات کو برداشت کر لیتی تھی۔ ہر غم پی جاتی تھی۔ پتا نہیں آپا اس سے کیا کچھ کہتی ہوں گی۔

ایک دن میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا پڑھ رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا جہاں سے کچن صاف نظر آتا تھا۔ کچن کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ فروزاں اور آپا کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بار بار کچھ کہہ رہی تھیں اور فروزاں احتجاجی لہجے میں تردید کر رہی تھی، اسی لمحے میں نے عقبی دروازے سے جمال کو کچن میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ڈش تھی۔ آپا نے جلے بھنے لہجے میں کچھ کہا۔ میں نے پہلی مرتبہ فروزاں کو تیز لہجے میں بات کرتے ہوئے سنا تھا۔

"آپا۔ خدا کے لیے رحم کیجیے۔"

"لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔" آپا غصے میں چیخ کر باہر نکل آئیں۔

فروزاں آگے بڑھی اور پھر اچانک لڑکھڑائی۔ جمال نے لپک کر اسے بازوؤں میں سنبھالا۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی، اسی لمحہ آپا کمرے میں داخل ہوئیں، مجھے کچن کی سمت دیکھتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ اور پھر زہریلے لہجے میں بولیں۔

"دیکھ رہے ہو تم؟"

"آپ نے کیا کہہ دیا فروزاں سے جو اس طرح رو رہی ہے!"

"تم کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔" وہ غصے میں بولیں۔ "میں جو کچھ بھی کہتی ہوں اس کے بھلے کے لیے کہتی ہوں۔ مجھے تمھاری حالت پر رحم آتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں ابھی بھی کچھ نہیں گیا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا آپا۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

انھوں نے ٹھنڈی سانس لے کر مجھے رحم بھری نظروں سے دیکھا۔

"اخلاق! مجھے کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے لیکن تم نے اس لڑکی سے شادی کر کے حماقت کی ہے۔"

"حماقت کی ہے؟"

"ہاں۔" انھوں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "تم نے جو کچھ کیا ہمدردی میں کیا۔ لیکن کیا تم کو یہ اندازہ تھا کہ صحت مند ہونے کے بعد بھی فروزاں ویسی ہی رہے گی؟"

"میں کچھ نہیں سمجھا آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔"

"سنو۔ وہ تم سے عمر میں بہت چھوٹی ہے۔ ایسی عمر میں جذباتی ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔"

"میں جانتا ہوں آپا لیکن......"

"بحث نہ کرو۔ میری بات دھیان سے سنو۔ وہ بیمار تھی تو اور بات تھی، وہ احساس محرومی کا شکار بھی تھی، مایوس بھی تھی۔ تب اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ جوانی کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ اب وہ صحت مند ہے۔ اسے شدت سے ہر بات کا احساس ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"خاک معلوم ہے۔ اگر تم کو ذرا بھی احساس ہوتا تو فروزاں کو یہاں لا کر نہ رکھتے۔ جمال جیسے خوبصورت نوجوان سے ربط ضبط کا موقع نہ فراہم کرتے۔ تم نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے اخلاق۔ اس کا نتیجہ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

"آپا۔" میں نے سراپا احتجاج بن کر کہا۔ "یہ... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" میری آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

"اب بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ اخلاق، میں جانتی ہوں، فروزاں بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمھارا بہت احترام کرتی ہے، لیکن تم سے عمر میں بہت چھوٹی ہے۔"

"خدا کے لیے آپا۔ بس کیجیے۔"

"یہ حقیقت ہے۔ اور بڑی تلخ بھی۔ تم کو بھی حوصلے کے ساتھ اسے تسلیم کر لینا چاہیے۔" انھوں نے صاف گوئی کے ساتھ کہا۔ "فروزاں خوبصورت ہے، جوان ہے اور جمال اس کا ہم عمر بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ خدایا کیا یہ سب کچھ سچ تھا؟ کیا اسی لیے فروزاں مجھ سے دور دور تھی اور بے رخی کا سلوک کر رہی تھی؟ کیا میں نے جو کچھ دیکھا وہ اسی حقیقت کی جھلک تھی؟

"اس میں جمال کا بھی قصور نہیں ہے۔ اس کا فروزاں کے ساحرانہ حسن سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ جذبات انسان کو اندھا بنا دیتے ہیں۔"

"آپا۔ آپ مجھے دیوانہ کر دیں گی۔" میں چیخ اٹھا۔

"نہیں اخلاق۔ تم کو دیوانہ نہیں، ہوشمند بننا چاہیے۔ تم مرد ہو، ہمت سے کام لو۔ بیچاری فروزاں بے قصور ہے۔ قصوروار تو تم ہو۔"

"آپ چاہتی کیا ہیں آخر؟"

"فروزاں تم سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔ وہ مجبور ہے۔ اگر

تم واقعی اس کو نہیں چھوڑ سکتے تو فوراً یہ جگہ چھوڑ دو۔"

"نہیں۔" میں غصّے میں چیخا۔ "اگر وہ مجھ سے وفا کر سکتی ہے تو یہاں رہ کر بھی کر سکتی ہے، بصورتِ دیگر۔۔۔"

"بیشک، بیشک۔ بصورتِ دیگر یہی بہتر ہو گا کہ تم اس کے راستے سے ہٹ جاؤ۔" وہ سنگدلی کے ساتھ بولیں۔ "اگر وہ جمال کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے تو۔۔۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ یہ ناممکن ہے، میں ایسا نہیں کروں گا۔"

"کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میں اسے بے حد پسند کرتا ہوں۔"

"میں سمجھتی ہوں اخلاق۔ بلاشک تمھارے لیے فیصلہ بہت اذیت ناک ہو گا لیکن تم خود سوچو، اس عمر میں کب تک تم اس کا ساتھ دے سکو گے؟ اس سے پہلے کہ وہ خود بیزار ہو جائے، اس سے پہلے کہ وہ زندگی سے پھر مایوس ہو جائے، اسے زندگی کی وہ خوشیاں دے دو جو وہ تم سے حاصل نہیں کر سکتی۔۔۔ یہی دانشمندی ہو گی۔"

آپا کمرے سے جا چکی تھیں۔ لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ہر سمت تاریکی چھا چکی تھی۔

سینے میں آگ سی بھری ہوئی تھی۔ زندگی کرب و اذیت بن چکی تھی۔

مجھے نہیں خبر تھی کہ محبت کیا ہوتی ہے لیکن ان چند دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا۔ دل کو بار بار سمجھاتا تھا کہ آپا نے جو کچھ کہا، سب غلط تھا، آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، سب جھوٹ تھا لیکن تین روز گزر چکے تھے اور فرزاں میرے پاس نہیں آئی تھی۔

آپا نے کہا تھا اگر اسے مجھ سے محبت ہو گی، اگر اسے میری ضرورت ہو گی تو وہ خود آئے گی، مجھے پہل نہیں کرنی چاہیے۔ اُسے فیصلہ کرنے کا موقع دینا چاہیے۔۔۔ تو کیا یہ سچ تھا کہ وہ جمال سے محبت کرتی تھی؟ کیا میں اس کی راہ میں حائل تھا؟ وہ میرے احسانات کے بوجھ تلے اتنا دبی ہوئی ہے کہ مجھے چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ میں اس کی محبت۔۔۔ اس کی مسرّتوں کی راہ میں حائل تھا۔ میں جو عمر میں اس سے دگنا تھا۔ میں جس نے اس کی بے بسی اور بے کسی پر رحم کھا کر اس کی مدد کی۔۔۔ میں خود غرض تھا۔ اپنے احسانات کے عوض اس سے محبت کا طالب تھا لیکن محبت احسانات کے ذریعے نہیں خریدی جا سکتی۔ محبت تو خوشبو ہے، اسے قید نہیں کیا جا سکتا۔ میں فرزاں کی زندگی سے خوشیوں اور شادمانیوں کو چھین لینا چاہتا تھا۔ میں اپنے احسانات کے صلے میں اُسے ان مسرّتوں سے محروم کر دینا چاہتا تھا جو مجھ جیسا ادھیڑ عمر شوہر اس کو کبھی نہیں دے سکتا تھا۔ زندگی کے اس سفر میں کتنی دیر میں اس کے ساتھ چل سکوں گا۔ چند برس بعد تھک کر اس کے لیے ایک بوجھ بن جاؤں گا اور باقی زندگی وہ مجبوراً یہ بوجھ اٹھائے چلتی رہے گی، کیونکہ وہ میری احسان مند تھی۔ میں واقعی بڑا خود غرض تھا۔ جمال خوبصورت تھا، جوان تھا۔ فرزاں کا ہم عمر تھا۔ اگر وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی تو مجھے اس کے راستے سے ہٹ جانا چاہیے تھا۔

میں جانتا تھا فرزاں میرے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش ہرگز نہ کرے گی۔ وہ مجھے خوش رکھنے کے لیے اپنی محبت قربان کر دے گی۔ شاید اسی شرمندگی کی بنا پر وہ میرے پاس آتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی سکھ نہیں دیکھا تھا۔ کبھی محبت کی مٹھاس نہ چکھی تھی۔ کبھی زندگی کی سچی مسرّتوں سے ہمکنار نہ ہوئی تھی۔ کیا مجھے یہ زیب دیتا تھا کہ میں اس کے دامن میں محرومیاں بھر دوں؟ کیا مجھے یہ حق پہنچتا تھا کہ میں اس سے وہ سب کچھ چھین لوں جو قدرت نے اسے زندگی میں پہلی بار دیا تھا؟

کئی دن تک میں تنہائی میں غور کرتا رہا۔ راتوں کو کروٹیں بدل کر سوچتا رہا۔۔۔ اور بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا۔۔۔ میں بڑا حیران تھا کہ اس فیصلے پر مجھے بڑی مسرّت ہو رہی تھی، ذرا بھی خوف نہ تھا۔ اس کے برعکس ذہن پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ ایثار و قربانی تو انسانیت کا طرۂ امتیاز ہے۔

اور پھر اپنے فیصلے پر عمل کرنے کا موقع بھی مجھے بہت جلد مل گیا۔

شیریں آپا نے اپنی ملازمت سے پنشن لینے کی جو درخواست دی تھی، وہ پہلے ہی منظور ہو چکی تھی۔ صبح سویرے ڈاک سے جو خط آیا، اس کو پڑھتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑیں۔ انھیں ایک مقامی پرائیویٹ اسکول میں ملازمت مل گئی تھی جو حال ہی میں قائم ہوا تھا۔ انھوں نے اسی اسکول میں فرزاں کی ملازمت کے لیے بھی بات کی تھی اور خط میں تحریر تھا، کہ وہ اُسے بھی اپنے ساتھ لے کر آئیں تاکہ انٹرویو لیا جائے۔

میرے لیے اس خبر میں خوشی کی بات صرف یہ تھی کہ بالآخر مجھے تنہائی نصیب ہو جائے گی اور میں اپنے منصوبے پر عمل کر سکوں گا۔ ہم ناشتا کر رہے تھے، فرزاں اپنی فراک میں بٹن لگا رہی تھی۔ آپا نے بڑی مسرّت کے ساتھ کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ فرزاں کو بھی جاب مل جائے گی۔ بس دشواری یہ ہے کہ اسکول بہت دور

ہے اور بس میں سفر کر کے بڑی کوفت ہوگی۔ اخلاق! کیوں نہ ہم اس جگہ کو چھوڑ دیں۔"

"چھوڑ دیں؟" فروزاں اتنی زور سے اچھلی کہ سوئی انگلی میں چبھ گئی۔

"ہاں۔ ہم کو شہر میں اسکول سے قریب بھی مکان مل سکتا ہے۔" آپا نے اس کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "فروزاں! تمھاری انگلی زخمی ہوگئی ہے۔"

"لیکن آپا یہاں ہمیں بہت آرام ہے۔ اتنا بڑا مکان ہے اور۔"

"ہاں۔ پڑوس بھی اچھا ہے۔" آپا نے کہا۔ "جمال کو چھوڑنے کا ہمیں واقعی افسوس ہوگا۔" انھوں نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "فروزاں! ہاتھ دھو لو خون کا دھبہ تمھاری فراک پر لگ رہا ہے۔"

فروزاں کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ "آپا!" آپ نے فروزاں کو چونکا دیا۔ اسے نازلی سے بڑی محبت ہوگئی ہے۔"

"نازلی سے نہیں، اس کے باپ سے۔" آپا نے بے دھڑک کہا۔ "تم نے دیکھا نہیں، مکان چھوڑنے کی بات سن کر وہ اتنی زور سے اچھلی کہ انگلی زخمی کرلی۔"

ذرا دیر بعد فروزاں لباس تبدیل کر کے واپس آئی تو اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ میں مبہوت رہ گیا۔ مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ آپا کی نگاہیں ہم دونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"آپا! ہم دونوں کے جانے کے بعد یہ.... اکیلے کیسے رہیں گے؟" فروزاں نے آہستہ سے کہا۔

"ان کو کیا بچے پالنا ہیں؟" آپا نے سرد لہجے میں کہا۔ "اور پھر خدانخواستہ یہ کوئی معذور تو نہیں ہیں۔"

"تم میری فکر نہ کرو فروزاں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں تو تنہا رہنے کا عادی ہوں۔" میں نے اسے جی بھر کے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں چلی گئیں۔ گھر میں سناٹا چھا گیا۔ کتنی خوبصورت اور معصوم تھی فروزاں۔ بیشک اسے ایک ایسے شریکِ حیات کی ضرورت تھی جو اس کا ہم عمر اور ہم پلہ ہو۔ جو زندگی کے تیز سفر میں اس سے قدم ملا کے چل سکے میرے ساتھ دیکھ کر لوگ فروزاں کو شریکِ حیات نہیں، میری بیٹی تصور کریں گے اور جن کو حقیقت کا علم ہوگا، وہ مجھے ظالم اور حریص تصور کریں گے۔ نہیں فروزاں! میں تم سے اپنے احسان کی اتنی بڑی قیمت نہیں وصول کروں گا۔

میرا فیصلہ اٹل تھا لیکن ہر چیز سلیقے سے کرنا تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ جمال چھٹی پر تھا اس لیے اس کے دفتر سے مطلوبہ شیشی حاصل کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہوگی۔ میں کسی کے لیے بوجھ نہیں بنوں گا۔ جب وہ دونوں واپس آئیں گی تو میں اپنے بستر پر آرام سے سوتا ہوا ملوں گا۔ انھیں کچھ دیر بعد اندازہ ہوگا کہ میری نیند ابدی ہے۔ بیشک انھیں بڑا صدمہ ہوگا لیکن وقت اس زخم کو مندمل کر دے گا۔ نئی زندگی کی مسرتوں میں فروزاں مجھے بھول جائے گی جس طرح باپ کی موت کا غم آہستہ آہستہ بھول گئی۔

لیکن مرنے سے پہلے مجھے ایک خط ضرور چھوڑ دینا چاہیے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ موت کا تصور کر کے ایک مرتبہ جھرجھری آگئی لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ بھلا موت سے کیا ڈرنا۔ کسی کے لیے مر جانا تو ایک سعادت تھی اور پھر میں تو اپنی فروزاں کے لیے جان دے رہا تھا۔ اس کی محبت کیلیے یہ تحفہ مہنگا تو نہیں تھا۔ بیچاری نے زندگی میں دکھ ہی دکھ جھیلے تھے، جمال کے ساتھ اسے زندگی کی سچی مسرتوں کا لطف ملے گا۔

بارہ بجے کے قریب میں لباس تبدیل کر کے بید کے سہارے لنگڑاتا ہوا باہر نکلا۔ میں نے دریچے سے پہلے ہی جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ جمال یا اس کے گھر کا کوئی فرد باہر نہ تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں بس اسٹاپ تک پہنچا۔ کچھ دیر بعد بس مل گئی میں کالج پہنچا تو چھٹی ہوچکی تھی میں جمال کی لیبارٹری پہنچا تو دفتر کے کمرے میں اس کا اسسٹنٹ موجود تھا۔ وہ رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔

"اخلاق صاحب آپ؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "آپ نے کیسے زحمت کی؟"

"زحمت نہیں میاں۔ ورزش کہو۔ ڈاکٹر نے چلنے پھرنے کی ہدایت کی ہے۔ سوچا ذرا کالج ہو آؤں۔ جمال نے کہا کہ اس کی دراز میں ایک ضروری خط رکھا ہوا ہے وہ لیتا آؤں۔"

"اوہ۔ مجھے فون کر دیا ہوتا۔ چلیے میں نکال دوں۔" اس نے دراز سے کنجی نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں، تم کام کرو۔ جمال نے مجھے بتلا دیا ہے کہ وہ کہاں رکھا ہے۔" میں نے کنجی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ میں نے لیبارٹری کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر بند کر لیا۔ جمال کی دراز کھول کر چابیاں نکالیں اور سامنے رکھی الماری سے وہ شیشی نکال لی جو ایک دن جمال نے میرے سامنے اس میں رکھی تھی۔ اس نے بتلایا تھا یہ بے مزہ زہر ہلاک۔ چھ گھنٹے انسان کو موت کی نیند سلا سکتا

Farrukh Malik

ہے۔ اُسے ایک خاص تجربے کے لیے لیبارٹری میں منگوایا گیا تھا۔ میں اپنے ساتھ زیتون کے تیل کی شیشی لے کر آیا تھا جو کچن میں رکھی ہوئی تھی۔ یہ خوبصورت چھوٹی شیشی میں نے خود خریدی تھی کیونکہ فروزاں سلاد میں ہمیشہ زیتون کا تیل ملاتی تھی جس سے وہ بہت مزےدار ہو جاتا تھا۔

میں نے اس بے مزہ اور بغیر بُو والے زہر کی مناسب مقدار اپنی شیشی میں بھرنے کے بعد شیشی کو الماری میں مقفل کیا۔ کُنجیاں دراز میں بند کیں اور پھر کاغذ کے نیلے لفافے میں ڈال کر ساتھ لائے ہوئے تھیلے میں رکھ لی۔ باہر آ کے کُنجی لیب اسسٹنٹ کو واپس کی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا بس اسٹاپ کی سمت روانہ ہوا۔ مجھ پر خودکشی کا جنون سوار تھا۔ موت کا تصوّر بڑا حسین لگ رہا تھا۔ خوف کے بجائے ایک عجیب سا فاتحانہ سرُور طاری تھا۔ زندگی کا جب کوئی مقصد نہ ہو تو زندہ رہنا بے کار ہے۔ میں اس دُنیا میں بالکل تنہا تھا۔ فروزاں نے زندہ رہنے کی جو لگن پیدا کی تھی، وہ ختم ہو چکی تھی۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ لیکن اس نے کسی اور کو اپنی محبت کا محور بنا لیا تھا۔ بیشک محبت ایک آگ کا دریا ہے اس میں ڈوب کر جانے کی ہمت صرف ایثار کرنے والوں میں ہوتی ہے۔ فروزاں کی محبت پر مجھے اپنا پیار قربان کر دینا چاہیے۔

میں اپنے خیالات میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ بس میں بیٹھ کر میں باہر جھانکتا رہا۔ اور اس وقت چونکا جب سپر مارکیٹ کا اسٹاپ آ گیا۔ بس سے اُترتے ہوئے کسی نے مجھے آواز دی لیکن میں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ دُکان سے ڈبل روٹی، مکھن اور کافی خریدی۔ دکاندار نے سامان میرے تھیلے میں رکھ دیا۔ میں وہاں سے پیدل چلتا ہُوا گھر واپس پہنچا تو جمال کی خوشدامن اپنے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

”میرے خدا! تم کو اس حالت میں بازار جانے کی کیا ضرورت تھی؟“ اُنھوں نے کہا۔ ”جمال سے سامان منگوا لیا ہوتا۔“

”بیٹھے بیٹھے گھبرا گیا تھا۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی ڈاکٹر نے چلنے پھرنے کی ہدایت کی ہے۔“

میں تیزی کے ساتھ گھر میں داخل ہُوا۔ اس وقت میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میرا ارادہ ایک مرتبہ متزلزل ہو گیا تو پھر کبھی اس پر عمل نہ کر سکوں گا۔ کچن میں پہنچ کر میں نے سامان کا تھیلا رکھا اور ایک ایک کر کے ساری چیزیں نکالنا شروع کر دیں۔ تھیلا خالی ہو گیا لیکن نیلے کاغذی تھیلے میں رکھی زہر کی شیشی اس میں نہ تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سامان خریدتے ہُوئے زہر کی شیشی میں نے تھیلے سے نکال کر دکان کے کاؤنٹر پر رکھی تھی اور روانہ ہونے سے پہلے پھر سامان والے تھیلے میں رکھ لی تھی۔ تھیلا میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ پھر زہر کی شیشی کہاں گئی؟ گھبرا کر میں نے اپنی ساری جیبیں ٹٹول لیں لیکن شیشی نہیں ملی۔ ایک لمحہ کو میرا جسم خوف سے سرد ہو گیا۔ آخر وہ زہر کی شیشی گئی کہاں؟

اچانک مجھے خیال آیا کہ زہر زیتون کی رنگین شیشی میں تھا۔ بغیر بُو اور بے مزہ زہر شیشی کے تیل میں مل کر شناخت نہ ہو سکے گا۔

اوہ میرے خدا! یہ میں نے کیا کیا؟ کیا میں کسی بے گناہ کا قاتل بن جاؤں گا؟ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ دُنیا مجھے کیا کہے گی۔ ہر طرف سے لعنت ملامت ہو گی۔ ساری عزّت خاک میں مل جائے گی۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ خدایا میں کیا کروں؟ میں خوف و دہشت سے کراہ اُٹھا۔

اسی لمحہ دروازہ کھُلا اور فروزاں اندر داخل ہُوئی۔ ”اخلاق! میں واپس آ گئی ہُوں۔ میں آپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میں آج آپ سے بات کرنے آئی ہوں۔ میں۔۔۔۔۔“ اچانک اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی، اس نے گھبرا کر پُوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”غضب ہو گیا فروزاں، غضب ہو گیا۔“ میں نے دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے فوراً پولیس کو فون کرنا چاہیے۔“

فروزاں کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ میں تیزی سے لنگڑاتا ہُوا جمال کے گھر کی سمت بڑھا۔ فروزاں بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آ رہی تھی لیکن مجھے کسی کی پروا نہ تھی۔ جمال کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کیا۔ ”پولیس اسٹیشن؟ میں خلاق احمد بول رہا ہوں۔ شادمان کالونی، کاٹیج نمبر ۲ سے۔ مجھ سے ایک شیشی گم ہو گئی ہے جس میں مُہلک زہر بھرا ہوا ہے۔“ میں نے بتلایا۔ ”شیشی پر اولیو آئل لکھا ہوا ہے، ہاں زیتون کے تیل کی چھوٹی شیشی ہے۔ گہرے سرخ رنگ کی بمشکل پانچ انچ لمبی ہوگی اور وہ کاغذ کے نیلے تھیلے میں رکھی ہوئی ہے۔ کوئی اُسے زہر نہ سمجھ پائے گا۔ خدا کے لیے اُسے تلاش کیجیے۔ لوگوں کو کسی طرح خبردار کر دیجیے۔“

فروزاں نے دیوار کا سہارا لے لیا تھا۔ دہشت سے اُس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ لب کانپ رہے تھے۔

”میں نے وہ کالج کی لیبارٹری سے چوری کیا تھا۔ نہیں

زہر کا نام نہیں معلوم لیکن وہ مہلک ہے۔ میں سٹی کالج سے پانچ نمبر کی سرخ بس پر روانہ ہوا تھا جس پر سفید دھاریاں بنی ہوئی ہیں ٹھیک بارہ چالیس کا وقت تھا۔ پھر سپر مارکیٹ کے اسٹاپ پر اتر گیا تھا۔ وہاں جنرل اسٹورز سے کچھ سامان خریدا اور پھر پیدل گھر واپس آگیا۔ ہاں۔۔۔ یہاں آنے کے بعد پتا چلا کہ زہر کی شیشی غائب ہے۔۔۔۔ نہیں، میں نے اچھی طرح تلاش کر لیا۔۔۔ کیوں؟ جناب کسی اور کے لیے نہیں خود اپنے استعمال کے لیے لایا تھا۔ ہاں ہاں۔۔۔ میں خودکشی کرنے جا رہا تھا۔" میں نے لہجے میں چیخ کر کہا۔ سامنے کھڑی فروزاں کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ دوسری جانب فون پر پولیس والا بحث کیے جا رہا تھا۔ "مجھے معلوم ہے کہ کسی نے اُسے زیتون کا تیل سمجھ کر استعمال کر لیا تو کیا ہو گا۔ وہ فوراً مر جائے گا۔ اسی لیے تو آپ کو فون کر رہا ہوں ہاں۔ میں مجرم ہوں۔ میں نے مجرمانہ غفلت کی ہے۔ یہ بحث بعد میں کر لینا میرے بھائی! پہلے خدا کے لیے کچھ کرو۔" میں نے التجا کی۔ اپنا پتا اور جمال کا فون نمبر دوبارہ نوٹ کرایا۔ ریسیور رکھ کر پلٹا تو فروزاں آگے بڑھی۔

"کیوں؟۔۔۔ آخر کیوں؟" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے سوال کیا۔ "اگر مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہے تو معاف کر دیجیے۔"

"تم کمرے میں جا کر آرام کرو۔ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "جرم میں نے کیا ہے۔ اگر کوئی مر گیا تو میں قاتل قرار دیا جاؤں گا۔"

"نہیں اخلاق! جرم آپ نے نہیں کیا، میں نے کیا ہے۔ مجھے آپ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ مجھے پہلے ہی یہ احساس ہو جانا چاہیے تھا کہ آپ کو کتنی ذہنی اذیت ہو رہی ہے۔"

"خدا کے لیے فروزاں تم جاؤ۔"

"میں۔۔۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ ہم ساتھ چل کر اس شیشی کو تلاش کریں گے۔ گھبرائیے نہیں اخلاق! کچھ نہیں ہو گا۔" وہ بھاگتی ہوئی اندر گئی۔ دوسرے ہی لمحے جمال بدحواسی کے عالم میں باہر نکلا۔

"خدا کی پناہ، اخلاق۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں!" اس نے غصے میں کہا۔ "میں کار نکال رہا ہوں تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔"

ذرا دیر بعد ہم دونوں اس کی کار میں بیٹھے مارکیٹ کی سمت روانہ ہو گئے۔ "یہ زہر تم کو ملا کہاں سے؟" اس نے پوچھا۔

"لیب میں تمھاری الماری سے چوری کر کے لایا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "یاد ہے، تم نے خود ایک مرتبہ مجھے وہ شیشی دکھائی تھی۔"

"خدایا۔۔۔ یہ تم کو ہوا کیا ہے؟ کیا دیوانے ہو گئے ہو؟"

"میں خودکشی کرنے جا رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ نہ پوچھو کہ کیوں۔۔۔ پہلے ہر قیمت پر وہ شیشی تلاش کر لو پھر سب کچھ بتلا دوں گا۔"

"میں خود محسوس کر رہی تھی آپ کتنے پریشان ہیں۔۔۔ میں آپ سے بات کرنے آئی تھی جس دن سے آپا آئی تھیں۔۔۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

پولیس ہم سے پہلے مارکیٹ پہنچ چکی تھی۔ دکان کے سیلز مین نے بڑے یقین کے ساتھ بتلا دیا کہ میں نے وہاں کوئی شیشی نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے سامان رکھتے وقت میرے تھیلے میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جب میں سپر مارکیٹ پہنچا تو شیشی میرے پاس نہیں تھی۔

"آپ نے بس میں تو نہیں چھوڑ دی؟" فروزاں نے پوچھا۔

"ایک منٹ۔" سب انسپکٹر نے مجھے غصے میں گھورتے ہوئے کہا۔ "آپ کو یقین ہے کہ بس میں بیٹھتے ہوئے شیشی آپ کے پاس تھی؟"

"ہاں۔"

"خوب غور کر لیجیے آپ اس وقت ذہنی کشمکش میں تھے۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"تو پھر آپ نے یقیناً شیشی بس میں چھوڑ دی۔" سب انسپکٹر راحیل نے کہا۔ "ہم بس کو تلاش کر رہے ہیں اور ریڈیو پر لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے وارننگ بھی نشر ہونے لگی ہو گی۔"

"لیکن اگر شیشی کسی کو مل گئی اور اس نے زیتون کا تیل سمجھ کر استعمال کر لیا تو؟" جمال نے کہا۔ "سب لوگ ہر وقت ریڈیو تو نہیں سنتے۔"

"ہم بس کو تلاش کر رہے ہیں، آپ بھی کوشش کیجیے۔" راحیل نے کہا۔ "اور اگر شیشی مل جائے تو فوراً پولیس اسٹیشن فون کر دیں۔"

"اب کیا کریں؟" فروزاں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

ایک بہت مشہور سماجی کارکن مولوی تفضل کے بارے میں غلطی سے اخبار میں یہ خبر شائع ہو گئی کہ اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کے چند روز بعد اتفاق سے مولوی تفضل کا ایک پرانے دوست سے رات قبرستان کے باہر آمنا سامنا ہو گیا۔ انھیں دیکھ کر دوست کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ خوف سے کپکپاتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا مولانا! میں آپ کے جنازے میں شامل نہیں ہو سکا۔ لیکن میں نے آپ کی قبر پر پھول چڑھا دیے تھے۔"

Farrukh Malik

"میرا خیال ہے ہم لوگ بھی بس کی تلاش میں چلیں۔" جمال نے کہا۔

"تم بس کو پہچان لوگے؟"

"ہاں۔ شاید پہچان لوں۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ حالانکہ میں جس کیفیت میں بس میں بیٹھا تھا اس میں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔

پانچ نمبر کی بس سنت نگر جا کر ختم ہوتی تھی۔ ہم اسی راستے پر جا رہے تھے۔ آخری اسٹاپ سے پہلے ہی ہم کو پولیس کی گاڑی نظر آ گئی۔ سڑک کے کنارے دو بسیں رکی ہوئی تھیں۔ دونوں کا رنگ سرخ تھا اور باڈی پر سفید دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ پولیس والے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ہمارے پہنچنے تک اگلی بس روانہ ہو گئی۔ جمال نے کار کو موڑ کر بس کے قریب روکا، ہم کار سے اتر کر تیزی سے روانہ ہوئے۔

"یہ مسٹر اخلاق ہیں۔" جمال نے پولیس والے سے کہا۔ "شیشی کا کچھ پتا چلا؟"

"جی نہیں۔" سارجنٹ نے کہا۔ "آپ نے اسی بس میں سفر کیا تھا؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں میرا خیال ہے یہی بس تھی۔" میں نے بس کو پہچانتے ہوئے کہا۔ "میں ادھر کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔"

"لیکن ہمیں تو اس سیٹ پر کوئی شیشی نہیں ملی۔" کنڈیکٹر نے کہا۔

"ممکن ہے کسی نے شیشی اٹھا لی ہو۔" ڈرائیور نے کہا۔ "اس سیٹ پر آپ کے علاوہ کون بیٹھا تھا؟"

"ایک عورت یا لڑکی۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "شاید نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اس نے۔"

"اگر اس نے شیشی اٹھائی تھی تو اس کی جان خطرے میں ہے۔"

"ٹھہرو... ایک منٹ۔" ایک نوجوان نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "تم نیلی کے برابر میں بیٹھے تھے؟ ہاں مجھے بھی یاد پڑتا ہے۔ اوہ گاڈ! اگر وہ مر گئی تو۔"

"تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟" سارجنٹ نے پوچھا۔ "کہاں رہتی ہے وہ؟"

"نہیں، مجھے نہیں معلوم۔"

"پھر تم نے اس کا نام کیسے معلوم کر لیا؟"

"نام... مجھے نہیں معلوم اس کا نام کیا ہے۔ میں اسے نیلی کہتا ہوں کیونکہ وہ عموماً نیلا لباس پہنتی ہے۔"

"تم کو یہ کیسے معلوم...؟"

"ایک منٹ۔" کنڈیکٹر نے کہا۔ "وہ نیلے لباس والی لڑکی جس بس اسٹاپ پر اترتی ہے..."

"میں جانتا ہوں۔" نوجوان نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کے پاس کار ہے نا؟ آیئے دیر نہ کیجیے۔"

"ایک منٹ۔" سارجنٹ نے کہا۔ "آپ لوگ کہاں جا

"نیلی کو تلاش کرنے۔" نوجوان نے کہا۔ "اس کی زندگی میں ہے۔"

"اگر شیشی مل گئی تو ہم فوراً پولیس کو فون کر دیں گے۔" نے کہا۔ "چلو دیر نہ کرو۔"

"میرا نام پال ہے۔" اس نوجوان نے کہا۔ "اگر نیلی کو کچھ اچھا نہ ہوگا۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"نیلی کو کچھ نہ ہوگا۔" فروزاں نے جلدی سے کہا۔ "بس کہ شیشی اس نے اٹھائی ہو۔"

"اتنی اچھی بیوی ہوتے ہوئے آپ کو خودکشی کی کیا سوجھی" اس نے کہا۔

"دماغ خراب ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"لگتا تو یہی ہے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ "ویسے کیا تھی؟"

"چھوڑو اس بحث کو، تم اپنی نیلی کے بارے میں بتلا" فروزاں نے مداخلت کی۔

"اوہ، میری نیلی بہت خوبصورت ہے۔" اس نے مسکرا ہوئے کہا۔ "اتنی خوبصورت کہ اس کی وجہ سے میری نوکری جاتی

"وہ کیسے؟"

"دیکھیے نا۔ وہ ٹھیک ایک بجے اسپتال سے چھٹی کرتی اور میں ہر روز اسٹاپ پر اس کا انتظار کرتا ہوں۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ "بس میں اس کو اس کے گھر کے اسٹاپ چھوڑ کر دفتر واپس پہنچتا تھا تو دو ڈھائی بج جاتے تھے۔ اس نے نکال دیا۔"

"اتنی محبت ہے تم کو اس سے؟" فروزاں نے حیرت مجھے یہ گفتگو زہر لگ رہی تھی۔

"جی ہاں پھر بھی میں اس کے لیے خودکشی نہیں کر دل

"تو شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"شادی؟ لیکن ابھی تک تو اس کا نام بھی معلوم نہیں بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

فروزاں بے ساختہ ہنس پڑی۔ جمال بھی مسکرا دیا میں اس کو گھورتا رہا۔ جمال نے اسے یاد دلایا۔ "تم کو اس تم کام کیا کرتے ہو؟"

"ڈرائیور ہوں۔" پال نے جواب دیا۔ "یوں جیس دیکھیے اگریجویٹ ہوں۔ بھوکا مرنے سے بہتر ہے کہ آد ملا کرے۔ آپ کو ڈرائیور کی ضرورت تو نہیں؟"

Farrukh Malik

”نہیں۔“ میں نے فوراً کہا۔”فروزاں خود ڈرائیو کر لیتی ہے۔“
”نہیں اخلاق۔ حادثے کے بعد اب مجھ میں ہمت نہیں۔“
”حادثہ؟ کیسا حادثہ؟“ پال نے پوچھا۔

فروزاں نے خوف سے جھرجھری لی۔”بڑا ہولناک حادثہ تھا۔“ اس نے پال کو تفصیل بتلاتے ہوئے کہا۔”تم ڈرائیور ہو نا؟ مجھے ایک بات بتلاؤ۔ میں بائیں طرف چل رہی تھی، کار اچانک سامنے آگئی۔ سڑک کے نیچے نشیب میں گڑھا تھا۔ اس لیے میں نے دائیں جانب کار کو موڑ دیا۔ اس نے بھی دائیں جانب کار گھمائی اور ٹکر ہوگئی۔ کیا میری غلطی تھی؟“

”نہیں۔“ پال نے کہا۔”غلطی آپ کی نہیں تھی۔ ویسے بھی اس قسم کے حادثے اچانک اور اتفاقیہ ہوتے ہیں، کوئی دانستہ حادثہ نہیں کرتا۔“

”میں دائیں جانب بیٹھی تھی اس لیے بچ گئی۔“ فروزاں نے کہا۔ ”لیکن اخلاق شدید زخمی ہوگئے۔ مجھے ہر لمحے یہ خیال رہتا ہے کہ اگر میں کار کو دائیں جانب نہ موڑتی...“

”تو اخلاق صاحب زخمی نہ ہوتے بلکہ آپ ہوتیں۔“ پال نے بات کاٹ کر کہا۔”لیکن حادثے کسی کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے محترمہ، ورنہ حادثہ نہ کہلائیں۔“

”لیکن خیر میں آپا کا تو خیال یہ ہے کہ حادثہ کوئی چیز نہیں۔ انسان کے ہر عمل میں اس کے لاشعور کا دخل ہوتا ہے۔ جو کچھ ہوا اس میں میری لاشعوری خواہش کارفرما تھی۔“

”حادثہ کوئی چیز نہیں؟“ پال نے آنکھیں نچا کر کہا۔”یہ محترمہ رہتی کہاں ہیں؟“

”وہ... وہ بہت دانشمند اور تجربہ کار ہیں۔“ فروزاں نے جلدی سے کہا۔

”دانش حد سے بڑھ جائے تو انسان کو پاگل خانے پہنچا دیتی ہے۔“ پال نے جواب۔”بعض لوگوں کو دانش کا ہیضہ ہو جاتا ہے۔ حادثہ کبھی اختیاری یا دانستہ نہیں ہوتا۔“

”واقعی؟ تمھارے خیال میں میرے لاشعور کا کوئی دخل نہ تھا اس میں؟“

”خدا کی پناہ!“ پال چلّایا۔”چلیے فرض کیجیے کہ آپ کا لاشعور پاگل ہوگیا تھا، وہ دوسرا جو حادثے میں مر گیا اس کے لاشعور نے کیا یہ مشورہ دیا تھا کہ ٹکرا کر مر جاؤ؟“

فروزاں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔”تم سچ کہتے ہو۔ میرے دل پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔“

”فروزاں! کیا آپا نے تم سے یہ کہا تھا کہ تم نے دانستہ مجھے زخمی کیا؟“

”دانستہ تو نہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اس میں میرے لاشعوری ارادے کا دخل ضرور تھا۔ وہ... وہ مجھے الزام تو نہیں دیتی ہیں لیکن اوہ، چھوڑو اس ذکر کو۔“

”واہ، کیسے چھوڑ دیا جائے؟ یہ محترمہ جو بھی ہیں، بلاوجہ آپ کو احساسِ جرم میں مبتلا کر رہی تھیں۔“ پال نے کہا۔”ویسے یہ ہیں کون؟“

”میری بہن ہیں اور پال کا خیال درست ہے فروزاں! آپا نے تم کو احساسِ جرم میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے، میں...“

”اب جانے بھی دو اخلاق۔“ فروزاں نے کہا۔”ویسے پال دلچسپ آدمی ہے، انجان لڑکی سے محبت کرتا ہے۔“

”بھلا محبت جان پہچان کی محتاج کب رہی ہے؟“ پال نے ہنستے ہوئے کہا۔”محبت میں کرتا ہوں نیلی تو نہیں۔“

”تم نے اسے بتلانے کی کوشش بھی نہیں کی؟“ جمال نے پوچھا۔

”کبھی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی۔“

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔”ان جیسا بے نیاز عاشق پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔“ میں نے کہا۔

”بس یہ اگلے موڑ پر کار کو ایک سمت پارک کر لیں۔“ پال نے کہا۔”نیلی یہیں پہ اترتی ہے اور سامنے والی سڑک پہ جاتی ہے۔“

جمال نے کار سڑک کے کنارے پارک کی۔ ہم سب اتر کر باہر آگئے۔ کار کو لاک کر کے جمال نے کہا۔”تم نہ اس کا نام جانتے ہو، نہ پتا۔ ہم اسے تلاش کیسے کریں گے؟“

بچوں کے مشہور ادیب شکیل انجم کی مقبول ترین کتابیں

آئندہ ماہ کے ناول

کرنل پرویز سیریز نمبر ۱۹

بین الاقوامی سازش پر مبنی سنسنی خیز ناول

پکارتی لاشیں

کیا لاشیں پکار سکتی ہیں۔ جی ہاں! لاشیں پکار رہی تھیں۔ اس عمارت میں زبردست دھماکہ ہوا اور ہر طرف تباہی پھیل گئی۔ سدو بھائی کو ایک شخص نے گہرے سمندر میں پھینک دیا۔ ایک خوبصورت لڑکی جو زہریلی ناگن تھی!!!

کرنل پرویز سیریز نمبر ۲۰

خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی ہولناک ناول

جہنم کی بلائیں

فیصل، ندیم اور سدو بھائی جہنم کی بلاؤں کے نرغے میں پھنس گئے۔ اس ویران حویلی میں ایک بہت بڑا ہاتھ برآمد ہوا اور سدو بھائی کو اپنی مٹھی میں دبا کر لے گیا۔ سدو بھائی کا کیا حشر ہوا یہ بات تو ناول پڑھ کر ہی معلوم ہو سکتی ہے!!

قیمت فی کتاب ۶/ روپے

قالوط سیریز نمبر ۷

مزاح، سسپنس اور جاسوسی سے بھرپور

مسٹر چکرم

وہ عجیب شخص تھا جو سر کے بل کھڑا ہو کر کتے کی طرح بھونکتا تھا۔ قالوط بھی اس بھونک میں شریک ہوگیا۔ پھر محمود، فرحانہ اور ڈولو سب ہی بھونکنے لگے۔ قہقہوں کا طوفان جو آپکے پیٹ میں بھی بل ڈال دیگا اور ہو سکتا ہے آپ بھی...

قالوط سیریز نمبر ۸

قدم قدم پر چونکا دینے والا ناول

تیسرا روپ

اس کے تین روپ تھے اور تینوں ایک دوسرے سے مختلف اور سنسنی خیز۔ انسپکٹر خورشید مرزا اس ہولناک مجرم کی تلاش میں۔ سنجیدہ اغوا ہوگئی، اسے اغوا کرنے والے کون لوگ تھے۔ محمود، فرحانہ اور ڈولو پر قیامت ٹوٹ پڑی!!!

کتابیات پبلی کیشنز - پوسٹ بکس نمبر ۲۳ - کراچی!

"اپنی عقل سے۔" پال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت خوبصورت ہے۔ ہمیشہ نیلا لباس پہنتی ہے اور شاید اسپتال میں نرس ہے۔ اخلاق صاحب! آپ دونوں کو ساتھ لے کر بائیں سمت کے مکانات پر دستک دیں۔ میں دائیں سمت سے شروع کرتا ہوں۔ چلیے، انتظار کس بات کا ہے۔"

ہم ابھی تیسرے مکان پر ہی پہنچے تھے کہ پال نے چلا کر آواز دینا شروع کی۔ وہ ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ ہم لپکتے ہوئے پاس پہنچے تو دیکھا کہ دروازے میں ایک خوبصورت سی لڑکی کھڑی حیرت سے ہم کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ سوتے سے اٹھ کر آئی تھی، کیونکہ آنکھیں خوابیدہ اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

"دیکھا آپ نے؟ آخر میں نے تلاش کر لیا۔" اس نے فروزاں کی سمت دیکھ کر فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"آخر بات کیا ہے؟" لڑکی نے حیران ہو کے پوچھا۔

"بات بہت ضروری بلکہ خطرناک ہے۔" پال نے کہا۔ "اندر چلیے وہیں بات ہوگی۔"

لڑکی ان سب کو لے کر جس کمرے میں داخل ہوئی، وہ صاف ستھرا چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے پھر سوال کیا۔ "جی اب بتلائیے کیا بات ہے؟"

"دیکھو، ہم تم کو الزام نہیں دے رہے ہیں۔" پال نے جلدی سے کہا۔ "لیکن کیا تم کو آج بس میں زیتون کے تیل کی کوئی شیشی ملی تھی؟"

"نہیں تو۔" لڑکی نے قدرے غصّے میں جواب دیا۔ سب کے چہرے اُتر گئے۔

"دیکھو، بات یہ ہے کہ اس شیشی میں زہر تھا۔" فروزاں نے کہا۔ "میرے شوہر اخلاق احمد صاحب تمھارے برابر بیٹھے تھے۔" اس نے میری سمت اشارہ کر کے بتلایا۔ "یہ شاید سیٹ پر وہ شیشی چھوڑ آئے ہیں۔"

"زہر کی شیشی سیٹ پر چھوڑ آئے؟" لڑکی نے مجھے ملامت آمیز نظروں سے دیکھا۔ "لیکن مجھے تو نہیں ملی۔ ویسے آپ کا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگتا ہے۔" اس نے پال کی سمت دیکھ کر کہا۔

"لگتا ہے نا؟" پال نے خوش ہو کر کہا۔ "میں روزانہ بس پر تمھارے ساتھ ہوتا ہوں۔"

"اوہ! آپ بس ڈرائیور ہیں؟"

"میں؟ نن... نہیں تو۔" پال نے جلدی سے کہا۔ "میں تو..."

"ایک منٹ پال۔" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کا کیا نام ہے مس؟"

"روزی۔ میں اسپتال میں نرس ہوں۔"

"بڑا پیارا نام ہے۔" پال جلدی سے بولا۔ میں نے اسے غصّے میں گھورا۔

"مس روزی! یہ مسئلہ بڑا سنگین ہے۔" میں نے کہا۔ "میں وہ زہر کی شیشی کہیں بھول آیا ہوں۔ خیال ہے شاید بس پر رہ گئی ہو۔ مجھ سے مجرمانہ غفلت ہوئی ہے اور اگر کسی نے اس زہر کو زیتون کا تیل سمجھ کر استعمال کر لیا تو مر جائے گا۔ پولیس شیشی کو تلاش کر رہی ہے۔ ریڈیو پر اس کے متعلق اعلان نشر ہو رہا ہے۔ ہمارا خیال تھا شاید آپ کو وہ شیشی مل گئی ہو۔ اس لیے آپ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔ خدا کے لیے ذہن پر زور دے کر یاد کیجیے۔ شاید آپ نے کسی کو وہ شیشی اٹھاتے ہوئے دیکھا ہو؟"

لڑکی چند منٹ سوچتی رہی۔ "نہیں، مجھے کچھ یاد نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے اس وقت کچھ توجہ نہیں کی۔"

"آپ نے کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔؟" فروزاں نے پوچھا۔ "یہ تو دیکھا ہوگا کہ ان کے آس پاس کون بیٹھا تھا؟ ممکن ہے..."

"ایک منٹ۔" روزی نے کہا۔ "میں نے بیگم خاقانی کو دیکھا تھا اور اس بات پر حیران بھی ہوئی تھی کہ اتنی دولت مند ہونے کے باوجود وہ بس پر کیوں سفر کر رہی ہیں۔ ان کے پاس چار کاریں ہیں۔"

"آپ انہیں جانتی ہیں؟" میں نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔ "شاید انھوں نے دیکھا ہو۔ ان کا فون نمبر کیا ہے؟"

"فون نمبر تو نہیں معلوم۔ البتہ کوٹھی کا پتا معلوم ہے۔" روزی نے کہا۔ "وہ بیمار تھیں تو میں نے ان کی نرسنگ کی تھی۔"

"بس تو فوراً ہمارے ساتھ چلو۔" پال نے کہا۔ "زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

روزی چند منٹ میں تیار ہو کر ہمارے ساتھ روانہ ہو گئی۔ ہم کار کے پاس پہنچے تو پال نے کہا۔ "آپ لوگ پیچھے بیٹھیں۔ کار میں ڈرائیو کروں گا۔ روزی پتا بتلاتی جائے گی۔"

جمال نے مسکراتے ہوئے کار کی چابی پال کے حوالے کر دی۔ ہم اس کی خوشی کا سبب سمجھ رہے تھے جبکہ روزی حقیقت سے بے...

"سوال یہ ہے کہ آپ کو خودکشی کرنے کا خیال کیوں آیا؟" روزی نے اچانک پوچھا۔

"شیریں آپا کی وجہ سے۔" پال نے فوراً کہا۔

"اوہ نہیں۔" فروزاں نے جلدی سے کہا اور گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ "آپا ایسی بُری بھی نہیں ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ وہ مجھے تسلی دینے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ کیا یہ سچ نہ تھا۔ پال نے اجنبی ہوتے ہوئے چند لمحہ میں حقیقت کا اندازہ کر لیا تھا۔ محرومی، مایوسی اور زندگی...

Farrukh Malik

بیزاری کا یہ زہر میرے ذہن میں آپا نے پھیلایا تھا۔ خدایا! اس بدنامی اور احساسِ جرم سے بہتر تو یہ ہوتا کہ میں مرجاتا۔

"اخلاق صاحب بڑے پڑھے لکھے سمجھدار آدمی ہیں۔" پال کہہ رہا تھا۔ "ان کی بیگم بھی خاصی سمجھ بوجھ کی مالک ہیں، لیکن یہ آپا۔"

"اوہ، پلیز۔" روزی نے کہا۔ "یہ فیصلہ اخلاق صاحب پر چھوڑ دو۔ ہمیں تو یہ سوچنا ہے کہ ان کی بے پروائی کسی کی جان نہ لے لے۔"

میں کراہ اٹھا۔ اگر واقعی ایسا ہوگیا تو میں قاتل قرار پاؤں گا۔ خدا کرے وہ شیشی بیگم خاقانی کو مل گئی ہو۔

کار ایک شاندار کوٹھی کے پورچ میں جاکر رک گئی۔ ایک باوردی ملازم نے دروازہ کھولا۔

"بیگم خاقانی موجود ہیں؟" روزی نے کار سے باہر نکل کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ لوگ اندر آجائیے۔"

ہم ایک ہال نما شاندار ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے دوسرے ہی لمحے ایک ادھیڑ عمر خاتون اندر داخل ہوئیں۔ عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی لیکن چہرے سے چاق و چوبند لگ رہی تھیں۔ سفید رنگ کی قیمتی ساڑی اور نیلے بلاؤز میں وہ بڑی باوقار لگ رہی تھیں۔ انھوں نے حیرت سے ہم سب کو دیکھا اور پھر روزی کو پہچان لیا۔

"اوہ روزی تم؟ خیر تو ہے؟"

"جی بیگم صاحبہ! میں نے آج آپ کو بس پر دیکھا تھا۔"

"اوہ ہاں۔ بھئی یہ لڑکے کار لے کے نکل جاتے ہیں اور ویسے بھی تم جانتی ہو مجھے بس میں سفر کرتے ہوئے کوئی عار نہیں محسوس ہوتا۔"

"بات بہت اہم ہے بیگم صاحبہ۔" روزی نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کو بس میں نیلے رنگ کے تھیلے میں رکھی ہوئی کوئی شیشی تو نہیں ملی ہے؟"

"شیشی؟ نہیں تو۔ کیسی شیشی تھی؟"

فروزاں سے ضبط نہ ہوسکا۔ "معافی چاہتی ہوں بیگم خاقانی۔" اس نے کہا۔ "میرا نام فروزاں ہے اور یہ میرے شوہر پروفیسر اخلاق احمد ہیں۔" اس نے ساری تفصیل بتلادی۔

"خدا خیر کرے۔" بیگم خاقانی نے مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے تم کو بس میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔"

"پال نے روزی کو دیکھا تھا۔" فروزاں نے کہا۔ "اور روزی نے آپ کو۔ اس لیے ہم نے آپ کو زحمت دی۔" اس نے مایوس لہجے میں کہا۔

"اوہ، لیکن مجھے وہ شیشی نہیں ملی۔ ایک منٹ۔۔۔ مجھے یاد آیا۔ میرے سامنے والی سیٹ پر رملیش بیٹھا تھا۔"

"رملیش؟" پال نے اچھل کر کہا۔ "کون رملیش؟"

"تم رملیش کو نہیں جانتے؟ شہر کا نامور مصوّر ہے۔"

"ممکن ہے شیشی اس کو مل گئی ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ رہتا کہاں ہے؟ فون ہے اس کے گھر پر؟" جمال نے پوچھا۔

"اس طرح بدحواس ہونے سے کام نہیں چلے گا۔" بیگم خاقانی نے کہا۔ "ممکن ہے پولیس نے شیشی تلاش کرلی ہو۔ ٹھہرو میں فون کرکے معلوم کرتی ہوں۔"

انھوں نے فون نمبر ڈائل کیے۔ چند لمحے بات کی اور پھر مایوس لہجے میں کہا۔ "پولیس اب تک ناکام رہی ہے۔"

"آپ رملیش کو بھی فون کرلیں بیگم صاحبہ۔" پال نے کہا۔

"رملیش اپنے اسٹوڈیو میں ہوگا اور وہاں فون نہیں ہے۔" بیگم خاقانی نے بتلایا۔

"تو پھر ہم وہیں کیوں نہ چلیں۔" فروزاں نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" بیگم خاقانی نے کہا۔ "لیکن کار تو لڑکے لے گئے ہیں، ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔"

"اس کی ضرورت نہیں بیگم صاحبہ۔" پال نے فوراً کہا۔ "ہمارے پاس کار نما ایک سواری موجود ہے۔"

ذرا دیر بعد ہم شہر سے باہر جانے والی سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ چھوٹی سی کار میں ہم لوگ پھنسے ہوئے بیٹھے تھے۔

بچوں کی دلچسپ ترین مقبول کتابیں

بچوں کے مشہور ادیب شکیل انجم کے دو سلسلے بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول ہیں۔ جنہیں گھر کا ہر فرد دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ بچوں کے لیے بے مثال تحفہ۔

کرنل پرویز سیریز — اور — قابوط سیریز

زہریلی موت

لوگ سڑک پر چلتے چلتے گر تے تھے اور مر جاتے تھے۔ پورے ملک میں لاشوں کا انبار لگ گیا۔ ہر شخص دہشت زدہ اور سراسیمہ تھا۔ وہ عجیب ناگہانی موت تھی جس کا شکار وہ لوگ ہو رہے تھے جو کسی دکسی کو خط لکھ رہے ہوتے تھے۔

گورکھ دھندہ

وہ کیسا گورکھ دھندہ تھا جس نے سب کو چکر میں ڈال دیا تھا۔ ایک مشین جو کسی بھی آدمی کا ہمشکل تخلیق کرسکتی تھی۔ شہر میں زبردست افراتفری پھیل گئی تھی۔ بیشمار لوگوں کے ہمشکل پیدا ہوگئے تھے جو خود کو اصل ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

قیمتی مجرم

وہ لمحات انتہائی سنسنی خیز تھے جب ایک پولیس افسر کی آنکھ کھلی تو ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور ایک لاش اس کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ پولیس ایک آدمی کا تعاقب کر رہی تھی اچانک وہ بم کی طرح پھٹ گیا اور ہر طرف تباہی پھیل گئی۔

خلائی مخلوق

وہ عجیب مخلوق تھی جو ایک اجنبی سیارے سے زمین پر وارد ہوئی تھی۔ ایک خلائی جہاز جس کے گرد آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ لوگ کون تھے جو اچانک غائب ہوجاتے تھے اور اچانک ہی نمودار ہوجایا کرتے تھے۔ ایک حیرت انگیز سیریز!!!

اپنی کاپی آج ہی بک کرالیجیے یا ہاکر کو براہ راست طلب کیجیے۔ قیمت فی کتاب چھ روپے۔ ڈاک خرچ پانچ روپے۔ چاروں ناول ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف۔

کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی

"ہاں بھئی، اخلاق میاں! یہ خودکشی کا کیا قصہ ہے؟" بیگم خاقانی نے پوچھا۔

میرے جواب دینے سے پہلے فروزاں بول اٹھی "جب سے شیریں آپا آئی ہیں۔" اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا "جب سے وہ آئی ہیں بیگم صاحبہ، پتا نہیں ان کو کیا کر دیا ہے؟ انھوں نے مجھے بھی دیوانہ کر دیا ہے۔"

"بڑے کام کی خاتون معلوم دیتی ہیں تمھاری شیریں آپا۔"

"میری نہیں، وہ ان کی بڑی بہن ہیں۔" فروزاں نے کہا "مجھے افسوس ہے ان کے بارے میں مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا لیکن ان کی آمد سے پہلے ہم کتنے خوش تھے۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ یہ خودکشی کا ارادہ کریں گے اور پھر اب میرے لیے چپ رہنا ممکن نہیں ہے۔ وہ اچانک سسکیاں لینے لگی۔ دل میں چھپا غبار ابھر نکلا تھا۔

"اگر کوئی وہ زہر کھا کر مرگیا تو خون شیریں آپا کے سر ہوگا۔" پال نے کہا۔

"ایسی بات نہ کرو۔" بیگم صاحبہ نے فروزاں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لو ہم پہنچ گئے۔"

ہم بان گنگا کی چڑھائی کے روبرو پہنچ چکے تھے۔ درختوں کے جھنڈ میں کھپریلوں کی چھت کا ایک مکان نظر آرہا تھا۔

"کیسے ٹھیک ہو جائے گا بیگم صاحبہ؟" پال نے کہا "اس عورت نے فروزاں صاحبہ کے ذہن میں یہ احساس جرم بھر دیا ہے کہ وہ دانستہ اخلاق صاحب کو حادثے کا شکار کرنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے خود کو بچانے کے لیے اخلاق احمد کو زخمی کر دیا۔ ان کے لنگڑے ہونے کی ذمہ دار یہ ہیں۔ اس احساس نے فروزاں کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ بیچاری ذہنی اذیت اور کرب کی مریضہ ہو گئی ہیں حالانکہ حادثہ محض اتفاقیہ تھا، لیکن یہ شیریں آپا بڑی بقراطی خاتون ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟ وہ جو کچھ کہتی ہیں، بس وہی سچ ہوتا ہے۔"

"اوہ، میں سمجھ گئی۔" بیگم خاقانی نے کہا "اور وہ اخلاق کی بڑی بہن ہیں اس لیے فروزاں ان کی تردید بھی نہیں کر سکتی۔ یہی بات ہے نا بیٹی؟"

"جی... جی ہاں۔" فروزاں نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم جی بھر کے رو لو، دل کا غبار نکل جائے گا۔"

"لیکن یہ تو سراسر ظلم ہے بیگم صاحبہ۔" روزی نے کہا "اخلاق صاحب کو خودکشی سے بچانے کے بجائے اس عورت کا گلا گھونٹ دینا چاہیے تھا۔"

"اب بھی وقت ہے۔ بس یہ ہمت کر لیں۔" پال نے تائید کی۔

میں دل ہی دل میں سلگ رہا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ آپا اس بے گناہ لڑکی پر یہ ظلم کر رہی تھیں۔

"قصور ان کا نہیں میرا ہے۔" فروزاں نے کہا "بزدلی میں نے دکھائی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ کسی کو بولنے کا موقع کہاں دیتی ہیں۔ مجھے تو پاگل کر دیا ہے انھوں نے۔"

"لیکن اخلاق میاں! تم تو مرد ہو۔ تمھارا فرض تھا کہ تم اپنی بہن کو اس رویے سے روکتے۔ تم نے خودکشی کا ارادہ کر کے بڑی بزدلی... دکھائی ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ پال نے میری سمت دیکھا "بیگم صاحبہ ٹھیک کہہ رہی ہیں دوست! آپ کو کم از کم فروزاں کا خیال تو کرنا تھا۔"

"ان کو دوسروں کا خیال کب آتا ہے۔" فروزاں نے پہلی بار شکوہ کیا۔ میرا دل تڑپ اٹھا۔ کتنا ظلم کیا تھا میں نے اس پر۔

"تم کو بھی حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔" بیگم خاقانی نے کہا "پڑھی لکھی عورت ہو۔ مجھے دیکھو، گھر بھی دیکھتی ہوں اور درجنوں فلاحی اداروں کی سربراہی بھی کرتی ہوں۔ عورت کمزوری کا مظاہرہ کرے گی تو ظلم کا شکار رہے گی۔ شکوہ کرنا بزدلی ہے۔ عورت کس لحاظ سے مرد سے کمتر ہے؟"

"وہ کسی لحاظ سے نہیں۔ عورت تو مرد کے دل و دماغ پر بھی حکو[مت] کرتی ہے۔" پال نے روزی کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

"قصور فروزاں کا نہیں میرا ہے۔" میں ضبط نہ کر سکا۔ "... آنکھیں کھلی رکھنی چاہیے تھیں۔ قصوروار میں ہوں۔"

"چلو کوئی بات نہیں، اب خیال رکھنا۔" پال نے تسلی...

"لو بھئی ہم منزل پر پہنچ گئے۔" بیگم خاقانی نے کہا "کار روک لو اور تم لوگ ٹھہرو۔ بملا کی موجودگی میں وہ تم سب کا آنا پسند نہ کرے۔"

"بملا؟ یہاں بھی کچھ چکر ہے؟" پال نے کہا لیکن بیگم [صاحبہ] جواب دیے بغیر مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

ہم ایک وسیع اور کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ دیوار... پر ہر سمت خوبصورت تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ آئل پینٹنگ کے... نمونے کسی فنکار کی صلاحیتوں کا زندہ ثبوت تھے لیکن ہمارے... کھڑا ہوا فنکار خود ایک نمونہ تھا۔ زرد رنگ، بال بکھرے ہوئے... ملگجا لیکن آنکھیں غیر معمولی خوبصورت اور چمکدار۔ اس کے برابر... خوبرو دوشیزہ مسکرا رہی تھی۔ لباس سے ظاہر تھا کہ وہ رمیش...

"رمیش صاحب! آپ کو بس پر زیتون کے تیل کی کو... نہیں ملی؟" فروزاں نے بیتابی کے ساتھ پوچھا "وہ نیلے تھیلے میں رکھی تھی۔"

رمیش نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ ایک...

رہا تھا۔ "تم بس پر موجود تھے؟" اس نے پال کی سمت دیکھ کر کہا۔ "اور تم بھی۔" اس نے اخلاق کو مخاطب کیا۔ "باقی چہرے اجنبی ہیں۔"

"حیرت انگیز۔" پال نے کہا۔ "تمھاری یادداشت اتنی اچھی ہے۔"

"ہاں، میں ایک مرتبہ جو کچھ دیکھ لیتا ہوں ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔" رمیش نے کہا۔ "یہی میرے فن کی کامیابی کی بنیاد ہے۔"

"پھر تم کو وہ شلپشی بھی یاد ہو گی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"تمھارے بائیں ہاتھ میں کاغذ کا ایک تھیلا تھا... نیلے رنگ کا... تم خیالات میں گم تھے۔ میں نے تم کو غور سے دیکھا تھا کیونکہ تم بہت مایوس اور رنجیدہ نظر آرہے تھے۔ تم نے جیب سے ایک سیاہ نوٹ بک نکالی۔" وہ بتلا رہا تھا اور میرا دل زور زور سے اچھل رہا تھا۔

"ہاں، ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "وہ شلپشی... وہ..."

"تم نے نوٹ بک پر کچھ لکھا پھر سوچنے لگے اور پھر جیسے کہیں کھو گئے۔ بس میں نے اور کچھ نہیں دیکھا کیوں کہ سامنے بیٹھی ایک خوبصورت لڑکی نظر آگئی تھی۔" اس نے مسکراتے ہوئے روزی کی سمت دیکھا۔

میں نے جلدی سے اپنی نوٹ بک نکالی اور ورق الٹنے لگا۔ اس پر جگہ جگہ صرف ایک لفظ لکھا تھا فروزاں، فروزاں، فروزاں۔ وہ میرے قریب کھڑی دیکھ رہی تھی۔ میں نے نظریں اٹھائیں تو فروزاں کی آنکھوں میں بے پناہ محبت اور کرب کے آنسو جھلملا رہے تھے۔

"میں... میں تم کو خط لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔" میں نے... بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایک منٹ۔" رمیش نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تمھارا نام اخلاق ہے نا؟" میں نے سر ہلایا۔ "کسی نے تم کو نام لے کر پکارا تھا؟"

"ہاں، ہاں۔" میں نے خوش ہو کر جواب دیا۔ "مجھے بھی یاد ہے، دو مرتبہ۔ جب میں بس سے اتر رہا تھا، کوئی میرا جاننے والا رہا ہو گا۔"

"کون ہو سکتا ہے اخلاق... آخر کون؟" فروزاں نے پرامید لہجے میں کہا۔

"مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں اس وقت ہر چیز سے بے پروا ہو چکا تھا۔" میں نے بتلایا۔ "شاید رمیش نے دیکھا ہو۔"

"میں نے توجہ نہیں کی تھی۔" رمیش نے کہا۔ "لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کسی کو سیٹ سے وہ نیلا تھیلا اٹھاتے دیکھا تھا۔"

"کسے؟" میں اچھل پڑا۔ میرے ساتھ ہی سب کے لبوں سے یہی سوال نکلا۔ "کون تھا وہ؟"

"ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی یا عورت۔" رمیش نے کہا۔ "بہت خوبصورت، وہ تھیلا لے کر بس سے اتر گئی تھی۔"

"کہاں کس اسٹاپ پر؟"

"میرا خیال ہے، اسی اسٹاپ پر جہاں یہ اترے تھے۔" اس نے بتلایا۔ "نہیں، اگلے اسٹاپ پر۔"

"شکل و صورت تو یاد ہو گی؟" فروزاں نے بیتابی کے عالم میں سوال کیا۔

"خوبصورت تھی۔ جوان تھی اور بال لانبے اور بھورے تھے۔"

"نازلی۔" جمال نے اچھل کر کہا۔ "اوہ، میرے خدا وہ یقیناً نازلی تھی۔ یہاں ٹیلیفون ہے؟" اس نے بدحواسی کے عالم میں کہا۔

"لیکن جمال! وہ نازلی کیسے ہو سکتی تھی؟"

"کیونکہ وہ اپنی ٹیچر کے یہاں گئی ہوئی تھی جو سپر مارکیٹ کے قریب مقیم ہے۔" جمال نے کہا۔ "ممکن ہے جہاں اخلاق بس سے اتر رہے تھے وہ وہیں سے سوار ہوئی ہو، اس نے اخلاق کو سیٹ پر وہ تھیلا چھوڑ کر جاتے دیکھا ہو اور گھر لے آئی ہو۔ تم جانتی ہو وہ سلاد میں ہمیشہ زیتون کا تیل استعمال کرتی ہے۔ میرے خدا! اگر اسے کچھ ہو گیا ہو تو..."

"اوہ میرے خدا! تم سچ کہتے ہو۔ میں نے سلاد بنانا اسی سے سیکھا ہے۔" فروزاں نے کہا۔

میرا دل ڈوب رہا تھا۔ اگر نازلی کو کچھ ہو گیا تو زندگی بھر جمال سے نظریں نہ ملا سکوں گا۔ "خدا نہ کرے کہ وہ نازلی رہی ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے فوراً گھر پہنچنا چاہیے۔ میں ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتا۔" جمال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہاں کہیں قریب میں فون بھی نہیں ہے؟"

"راستے میں بملا کے باپ کا پٹرول پمپ ہے۔ ہم سب وہیں چلتے ہیں۔" رمیش نے کہا۔

ہم سب کار میں ایک دوسرے پر لدے پھندے پٹرول پمپ پہنچے تو بملا کے باپ راجندر ترپاٹھی کا منہ ہمیں دیکھ کر کھل گیا لیکن بملا کچھ کہے بغیر سیدھی ٹیلیفون کی سمت بڑھی۔ جمال نے اسے نمبر بتلا دیا تھا۔ مسلسل ڈائل گھمانے کے بعد اس نے پکار کر کہا۔ "نمبر مسلسل انگیج مل رہا ہے۔"

"نہ جانے کیا بات ہے؟" جمال نے گھبرا کر کہا۔

"تم نمبر ملاتی رہو۔" پال نے بملا سے کہا۔ "اگر نمبر مل جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ شلپشی مل گئی ہے تو خبردار کر دینا کہ اسے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔"

ہم فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ رمیش نے جمال کے چہرے کی بدحواسی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اتنا پریشان کیوں ہو بھائی! مجھے یقین ہے وہ تمھاری لڑکی نہیں تھی۔"

"اور پھر نازلی بڑی سمجھ دار بچی ہے۔ وہ اس طرح ملی ہوئی

Farrukh Malik

پیپز استعمال نہیں کرے گی۔" فروزاں نے سمجھایا۔
"اس ساری پریشانی کا ذمّہ دار میں ہوں۔" میں نے اعترافِ جرم کیا۔
رمیش نے غور سے میرا چہرہ دیکھا۔" زندگی بڑی سُندر اور قیمتی ہے بھائی۔ تم نے اس کو ختم کرنے کا فیصلہ کیوں کر لیا؟"
"شاید یہ... زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔" روزی نے کہا۔" یا ممکن ہے کوئی صدمہ پہنچا ہو۔"
"بھئی تم خود جواب کیوں نہیں دیتے؟" بیگم خاقانی نے مجھ سے پوچھا لیکن میں خاموش رہا، کیا جواب دیتا۔
"یہ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتے۔" میرے برابر بیٹھی فروزاں نے کہا۔" ہماری شادی کو صرف چند ماہ ہوئے ہیں۔ زندگی سے یہ نہیں، میں مایوس تھی۔ انھوں نے مجھ پر ترس کھایا، مجھے مایوسیوں سے نکال کر نئی زندگی دی لیکن اب میں شاید ان پر بار بن گئی تھی۔ شاید یہ اپنے فیصلے پر پشیمان تھے۔"
"نہیں... نہیں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔" یہ تم کیا کہہ رہی ہو فروزاں؟" میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا لیکن اس نے جھٹکے سے بازو چھڑا لیا۔
"پھر کیوں تم نے یہ فیصلہ کیا؟" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ "آخر کیوں؟ شاید تم سے شیریں آپا نے کچھ کہا ہوگا۔ یقیناً یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔"
میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ خدایا، کیسے تبلاؤں اسے۔ بیگم خاقانی مجھے ملامت بھری نظروں سے گھور رہی تھیں۔" کیا یہ سچ ہے بھائی؟" رمیش نے پوچھا۔
"نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔" اس میں آپا کا کچھ قصور نہیں۔ ان کو الزام دینا زیادتی ہوگی۔ انھوں نے تو صرف حقیقت کا احساس دلایا تھا۔"
"کس بات کا احساس؟" فروزاں نے چونک کر کہا۔" یہی نا کہ تم نے مجھ سے شادی کر کے غلطی کی ہے، تم نے ترس کھا کر..."
"نہیں فروزاں۔" میں نے بڑے پیار سے سمجھایا۔" میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا لیکن تم کیوں مجھ سے دور ہو گئی تھیں؟ میں جانتا ہوں کہ میری عمر تم جیسی نوجوان اور خوبصورت لڑکی سے شادی کرنے کی نہیں تھی۔ تم نے میرے لیے بڑی قربانی دی تھی۔ زیادتی میں نے تمھارے ساتھ کی تھی۔"
اس نے میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔" ایسا نہ کہو اخلاق۔ آپا نے تم کو غلط تاثر دیا تھا۔ میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ وہ بار بار مجھے یقین دلاتی تھیں کہ تمھارے زخمی ہونے کی ذمّے دار میں ہوں۔ میں لاشعوری طور پر تم سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یہ حادثہ میرے اسی لاشعوری احساس کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے اتنی بار مجھ
یہ احساس دلایا کہ مجھے یقین آنے لگا تھا۔ میں خود کو مجرم سمجھنے لگی تھی
اُس نے سسکی لے کر کہا۔" اسی لیے مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا
تم شاید مجھ سے نفرت کرنے لگے ہو۔ میں سمجھتی تھی کہ تم مجھ سے نجات
حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تم نے مجھ پر اتنے احسانات کیے ہیں کہ میں
اس کے لیے بھی تیار تھی۔ میرا خیال تھا کہ آپا نے تم کو اس بات پر
آمادہ کر لیا ہے۔"
"لیکن وہ تو ایک اتفاقی حادثہ تھا فروزاں۔ تم اس کے لیے
کیسے قصور وار ہو سکتی ہو؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔
"میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اشارتاً کئی بار کہا بھی
لیکن وہ تمھاری بڑی بہن ہیں۔ تم ان کا احترام کرتے ہو۔ اس لیے
میں نے سوچا کہ تم کو انھی کی بات پر یقین ہوگا۔"
"یہاں سے دائیں جانب موڑ لو۔" جمال نے تقریباً چلا کر
"بس وہ سامنے والا مکان میرا ہے۔"
کار جمال کے گھر کے سامنے رُک گئی۔ وہ کود کر باہر نکلا اور
سے مکان کی سمت لپکا۔ ہم سب بھی اس کے پیچھے تیزی سے
میرا دل زور زور سے اُچھل رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا
تھا کہ خدایا سب خیر ہو۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور نازلی بھاگتی ہوئی
باہر آئی۔" او پاپا۔ مل گئی وہ شیشی؟"
"شیشی اس لڑکی نے نہیں اٹھائی تھی۔" رمیش نے فوراً کہا
جمال نے محبت اور خوشی سے نازلی کو سینے سے لگا لیا
" خدایا! تیرا شکر ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا شیشی تم نے سیٹ سے
ہے۔" اس نے کہا۔
"میں نے؟" نازلی نے حیران ہو کے کہا۔" آپ کو یہ
کیسے آیا پاپا؟ ذرا دیر پہلے ایک عورت کا فون بھی آیا تھا شاید
ہے اس کا۔ وہ بھی یہی پوچھ رہی تھی۔ ہم نے تو یہ خبر ریڈیو
لی تھی۔ وہ وقفہ وقفہ سے خبردار کر رہے ہیں۔"
"تب تو آپا کو بھی خبر ہو چکی ہوگی۔" میں نے فروزاں
"نہیں انکل شاید ان کو خبر نہ ہو۔" نازلی نے کہا۔"
والے آپ کا نام نہیں نشر کر رہے ہیں۔ ارے آپ لوگ
کھڑے رہیں گے۔ اندر آئیے نا۔"
ہم سب اندر داخل ہوئے۔ جمال نے اپنی خوشدامن
سب کا تعارف کرایا۔ بیگم خاقانی بہت خوش نظر آ رہی
انھوں نے جمال کی خوشدامن کو مخاطب کر کے کہا۔" جمال
کرتا ہے آپ سے۔ سارے راستے پریشانی سے بُرا حال
غریب کا۔"
"اس کے اور نازلی کے سوا میرا ہے کون اس دنیا

Farrukh Malik

انھوں نے جواب دیا۔ "لیکن بیٹے تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ نازلی کسی ملی ہوئی چیز کو کھانے کی بات سوچے گی۔"

"یس امی۔" پریشانی میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔"

"میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ شیشی اٹھانے والی لڑکی تمھاری نہیں ہو سکتی۔ وہ عمر میں کافی بڑی تھی۔" ریشں نے کہا۔

"تو پھر کون تھی وہ؟" فروزاں نے فکر مند لہجے میں کہا۔ "خدا کے لیے یاد کرنے کی کوشش کرو۔"

"ہم سب کو دعا کرنا چاہیے کہ وہ منحوس شیشی مل جائے۔" جمال کی خوشدامن نے کہا۔ "جانے یہ پولیس والے اب تک کیا کر رہے ہیں۔"

"ٹھہرو۔ میں معلوم کرتی ہوں۔" بیگم خاقانی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "فون کہاں ہے؟"

ذرا دیر بعد انھوں نے آکر بتلایا کہ پولیس کو اب تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب لوگ میری حماقت کی سزا بھگت رہے تھے، مجھے خود پر شرم آنے لگی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ سب کو اتنی پریشانی ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"نہ تم یہ حماقت کرتے اور نہ ہی ہم دونوں کی ملاقات ہوتی۔" پال نے پرستش کی نظروں سے روزی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمھارا مشکور ہوں۔"

"خوب، کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔" روزی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بے ساختہ سب ہنس پڑے۔

نازلی شربت بنا کر لے آئی۔ سب تھکے ہوئے تھے۔ شربت پی کر تازہ دم ہو گئے۔ بیگم خاقانی نے جمال کی خوشدامن سے دوستی کر لی تھی۔ دونوں باتوں میں منہمک تھیں۔ اچانک انھوں نے جمال کی سمت دیکھ کر کہا۔ "مجھے تو حیرت ہے جمال نے دوسری شادی نہیں کی۔"

"جمال کو نازلی سے بڑا پیار ہے۔" فروزاں نے کہا۔

"اوہ آنٹی! میں تو پاپا سے ہمیشہ ضد کرتی ہوں کہ میرے لیے ایک خوبصورت سی امی لے آئیں۔" نازلی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بالکل آپ کی طرح۔" میرا دل ڈوبنے لگا۔

"لیکن لڑکی! کیا تم سوتیلی ماں کو گوارا کر لو گی؟"

"سب جہالت کی باتیں ہیں۔" نازلی نے کہا۔ "مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ آیا۔ اگر آنٹی فروزاں کی عمر زیادہ نہ ہوتی تو میں پاپا کے لیے ان کو پسند کر لیتی۔"

فروزاں کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ سب نے بے ساختہ قہقہہ لگایا لیکن میں حیران رہ گیا تھا۔ وہ فروزاں کی عمر زیادہ بتلا رہی تھی۔

"بھئی سچ پوچھو تو فروزاں کی عمر کچھ ایسی زیادہ تو نہیں ہے۔" بیگم خاقانی نے کہا۔ "میں تو یہ کہوں گی کہ وہ اخلاق کی بیوی نہیں بیٹی لگتی ہے۔" ایک لمحہ کو سناٹا چھا گیا۔

"پتا نہیں آپ لوگوں کو یہ عمر رسیدہ کیوں لگتے ہیں۔" فروزاں نے غصے میں کہا۔ "مجھے نوجوان لوگ کبھی پسند نہیں تھے۔ میں.... میں ایک سنجیدہ اور متین شریکِ حیات کو پسند کرتی ہوں۔"

"مجھے تم سے پورا اتفاق ہے۔" ریشں نے فوراً تائید کی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ خدایا آپا نے ہمیں کتنی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

"شیریں آپا کو بھی میری بات پر یقین نہیں آتا۔" فروزاں کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ "لیکن۔ لیکن میں سچ کہتی ہوں۔ شادی سے پہلے ہی میں ان سے بے پناہ محبت کرنے لگی تھی۔"

"لیکن ... لیکن آپا تو کہتی ہیں کہ تم کو مجھ میں باپ کی محبت اور جھلک نظر آتی ہے۔" میں نے جانے کیسے کہہ دیا۔

"غلط کہتی ہیں وہ۔" فروزاں غصے میں چیخی۔ "تم میرے والد کو نہیں جانتے۔ وہ ہمیشہ سے انتہائی بخیل، تنگ نظر اور خود غرض تھے۔ میری ماں اسی غم میں مر گئی۔ بے شک وہ میرے باپ تھے۔ میں ان سے محبت کرتی تھی لیکن ان کا تم سے کیا موازنہ؟ تم انتہائی فراخدل، ہمدرد اور محبت کرنے والے ایک عظیم انسان ہو۔" وہ اچانک سسکیاں لینے لگی۔

سب حیرت سے فروزاں کو دیکھ رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اُسے سینے سے لگا لوں۔ آپا نے ہمیں کس جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ وہ ہمارے ذہن میں کیسا زہر گھول رہی تھیں۔



ایک ہپّی جس نے پانچ سال سے بال نہیں کٹوائے تھے، حجام کی دکان میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر نے کہا ہے کہ مجھے اپنا وزن کم از کم دس پونڈ کم کر لینا چاہیے۔ میرے بال کاٹ دو۔"



ایک حجام ایک ہپّی کے بال کاٹتے ہوئے بولا۔ "کیا تم نیوی میں بھی کام کر چکے ہو؟"

"ہاں! مگر تمھیں کیسے پتا چلا؟" ہپّی نے پوچھا۔

"تمھارے بالوں میں سے نیوی کی ٹوپی برآمد ہوئی ہے۔" حجام نے جواب دیا۔

Farrukh Malik

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ آپا زہر کی پڑیا ہے۔" جمال نے کہا۔ "وہ یقیناً ذہنی مریض ہیں۔ شعور... لاشعور، اسی بہانے وہ تمھاری زندگی تباہ کر رہی ہیں۔"

"وہ ہمیشہ مجھ سے یہی کہتی رہتی ہیں کہ مجھے کسی نوجوان شخص سے شادی کرنا چاہیے۔" فروزاں نے کہا۔ "جمال جیسے نوجوان اور خوبصورت شخص سے۔"

"خدا کی پناہ۔" میں کراہا۔ "مجھ سے تو وہ یہ کہتی رہتی ہیں کہ میں عمر میں تم سے بہت بڑا ہوں۔ معذور ہوں۔ تم سے شادی کر کے ظلم کیا ہے میں نے۔"

"محبت عمر اور خوب صورتی کی محتاج نہیں ہوتی۔" رمیش نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" فروزاں نے کہا۔ "حادثے کے بعد تو میں ان کی پرستش کرنے لگی ہوں۔ کاش، میں بتلا سکتی کہ میری محبت کتنی انتہا ہے۔"

"خدا تم دونوں کو اور تمھاری محبت کو قائم رکھے۔" جمال کی خوشدامن نے دعا کی۔ "خدا کرے وہ زہر کی شیشی مل جائے تو اطمینان ہو جائے۔"

"آؤ فروزاں! ہم دونوں گھر چلیں۔" میں نے اسے محبت سے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں آپا کا کیا حال ہے؟"

ہم گھر میں داخل ہوئے تو شیریں آپا میز پر کھانا لگا رہی تھیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتے ہوئے دیکھ کر ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"حد کر دی تم دونوں نے۔" انھوں نے غصے میں کہا۔ "اس طرح گھر کھلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟ اخلاق تم اس عمر میں بھی کتنے غیر ذمے دار ہو۔"

مجھے ان کی حالت دیکھ کر ترس آ گیا۔ انھوں نے ساری زندگی تنہا گزاری تھی۔ نہ شوہر کی محبت پائی تھی نہ والدین کی... شفقت اور محبت سے ان کا حسد فطری تھا۔ بیچاری محبت کی لذتوں سے ناآشنا تھیں۔ "آپا! آج ہم دونوں بہت خوش ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کے ہوتے ہوئے گھر کی فکر کیا کرنا ہے؟"

آپا نے فروزاں کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا، پھر محبت سے بولیں۔ "جاؤ، تم دونوں ہاتھ منہ دھو لو۔ میں نے کھانا تیار کر دیا ہے۔" انھوں نے ہمیں ایسے حکم دیا جیسے ہم بچے ہوں۔

ہم خاموشی سے باہر نکل آئے۔ آپا کو اب تک کچھ خبر نہ تھی۔ ہم تازہ دم ہو کر واپس کمرے میں پہنچے تو کھانا میز پر لگا ہوا تھا۔

"آج آپ کو بڑی زحمت ہوئی آپا۔" فروزاں نے کہا۔

"چلو کھانا شروع کرو۔" انھوں نے حکم دیا۔ "اور مجھے بتلاؤ کہ تم دونوں کیا کرتے پھر رہے تھے؟"

"ہم آپ کو سب کچھ بتلا دیں گے۔" فروزاں نے کہا۔ "اور امید ہے کہ آپ ہمیں معاف کر دیں گی۔" آپا نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں آپا۔ غلط فہمیوں کی بنا پر یہ سب کچھ ہوا ہے۔" میں نے ہمت کر کے کہا۔

"اوہ، تو تم دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے ہو۔" آپا نے ہمیں ملامت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "دیکھو! تم دونوں میرے بچوں کی طرح ہو۔ مجھے تمھارے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے تو صرف تمھاری اپنی بھلائی کے لیے..."

"آپا! ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ آپا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ انھیں جیسے اچانک دھچکا لگا ہو۔

"کیا یہ سچ ہے فروزاں؟"

"ہاں آپا۔ میں ان سے پرستش کی حد تک محبت کرتی ہوں۔ یہ میرا آئیڈیل ہیں۔"

"اوہ! بڑی خوشی ہوئی یہ سن کر۔" انھوں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ بیچاری آپا۔ انھیں سخت مایوسی ہوئی تھی۔ "اب کھانا شروع کرو ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

لیکن اسی لمحے دروازہ کھلا اور سب تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ رمیش سب سے آگے تھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ ہلا رہا تھا۔ "بھائی اخلاق! ہم نے پتا لگا لیا۔"

"ہاں، اب بالکل فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" جمال نے نعرہ لگایا۔

"کیسے؟ کب؟ خدا کے لیے کچھ بتلاؤ تو سہی۔" فروزاں چلا... آپا حیرت سے منہ پھاڑے سب کو دیکھ رہی تھیں۔

"میں بتلاتی ہوں انکل۔" نازلی نے بڑھتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا کہ رمیش انکل مصور ہیں تو میں نے ضد کی کہ اس عورت کی تصـ... دکھائیں جسے شیشی اٹھاتے دیکھا تھا۔" اس نے کہا۔ "اور... ہیں انھوں نے جو تصویر بنائی وہ کس کی تھی؟ سائرہ کی... سائرہ نے اٹھائی تھی!"

"کیا؟" میں اچھل پڑا۔ "سائرہ نے؟ وہ تو خیریت..."

"بلا کی خوب صورت عورت ہے۔" جمال نے کہا۔ "... کے مکان پر پہنچ چکی ہوگی۔ اب کسی فکر کی ضرورت نہیں...

Farrukh Malik

آپا اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں "یہ سب لوگ کون ہیں اخلاق؟ اور یہ کیا ماجرا ہے؟" انھوں نے غصے میں پوچھا۔

"ہم آپ کو تلانے جا رہے تھے آپا" فروزاں نے کہا۔ "خدا نے بڑی خیر کی۔"

"اوہ، تو یہ ہیں نمبر ۱۰ آپا؟" پال نے آپا کو گھورتے ہوئے کہا "سب اِنھی کا کیا دھرا ہے؟"

"اخلاق! کون ہے یہ بدتمیز شخص؟ میں اپنے ہی گھر میں بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی" وہ غصے میں کانپتے... ہوئے بولیں۔

لیکن میری نگاہیں کچن کے ریک پر مرکوز تھیں۔ میں ہر چیز اور ہر بات سے بے پروا آنکھیں پھاڑے گھور رہا تھا "فروزاں!" میں اچانک چیخا "وہ... وہ کاغذ کا نیلے رنگ کا تھیلا... وہ کچن میں کہاں سے آیا؟" کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ ہر نگاہ کچن میں دیکھ رہی تھی۔

"تو یہ ہے اخلاق، تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا" آپا نے کہا۔ "وہ سائرہ یہاں آئی تھی، گھر خالی پڑا تھا اس لیے وہ زیتون کے تیل کی شیشی کچن میں رکھ گئی تھی۔ تم بس میں چھول آئے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ تم کو آواز بھی دی لیکن تم نے جیسے سنا ہی نہیں، اس لیے اس نے بعد میں دوبارہ یہاں آکر مجھے بتلایا تھا۔"

"آپا!" میں نے حیرت زدہ ہو کے کہا "... کیا آپ نے ریڈیو نہیں سنا؟"

"تم جانتے ہو مجھے چڑ ہے ان ریڈیو پروگراموں سے۔"

"وہ شیشی کہاں ہے آپا؟" فروزاں دہشت زدہ لہجے میں بولی "وہ زیتون کے تیل والی شیشی۔"

"سلاد بنانے کے بعد میں نے الماری میں رکھ دی۔ آخر بات کیا ہے؟" وہ غصے میں بولیں۔

"آپ نے اس سلاد میں وہ ملایا ہے؟" میں نے گھبرا کر پلیٹ کی سمت دیکھا۔

"ہاں اس سلاد میں۔ ابھی نہیں گئی ہیں" انھوں نے سہم ہو کے کہا "لو چکھ کر دیکھ لو۔ فروزاں کے بنائے ہوئے سلاد سے کم مزیدار نہیں ہے۔"

"آپا" فروزاں دہشت زدہ ہو کر چیخی "خدا کے لیے ہاتھ نہ لگائیے اسے۔ یہ زہر ہے... خطرناک زہر۔"

"کھا لینے دو تھوڑا سا" پال نے آہستہ سے کہا "قصہ تمام ہو جائے گا۔"

اچانک سب کے قہقہے گونج اُٹھے۔ ہر ایک کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا تھا۔ آپا غضب ناک انداز میں اُٹھیں "اخلاق! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میرے ساتھ ایسا سلوک کرو گے۔ میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔ میں ایک لمحہ نہیں ٹھہروں گی اس گھر میں" وہ اتنی غضب ناک تھیں کہ سب خاموش ہو گئے۔

"نہیں آپا! یہ آپ کا گھر ہے" فروزاں نے لپک کر انہیں روک لیا "آپ کو نہیں معلوم کہ ہم سب دوپہر سے اب تک کتنے پریشان رہے ہیں" اس نے مختصراً آپا کو سب کچھ بتلا دیا۔

"خدا کی پناہ اخلاق" آپا جیسے بے دم ہو کر کرسی پر بیٹھ گئیں "اگر تم کو خدانہ کرے کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی؟" ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے "میرا کون ہے دنیا میں تمھارے سوا؟"

"لاشعور... آپ لاشعوری طور پر ان کو قتل کرنا چاہتی تھیں" پال نے کہا۔

"ہوش میں تو ہو تم؟" آپا گرج کے بولیں "میں اپنے بھائی کو قتل کر سکتی ہوں؟"

"تو کیا فروزاں اپنے شوہر کو قتل کر سکتی ہے؟" پال نے کہا "اب تو مان جائیے کہ حادثے اتفاقیہ ہوتے ہیں۔"

"بند کرو اس بحث کو" بیگم خاقانی نے ڈانٹا "دیکھتے نہیں وہ کتنی پریشان ہیں؟"

آپا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے لپک کر انھیں گلے لگا لیا "آپا! سب کچھ غلط فہمی سے ہوا۔ معاف کر دیجیے ہم سب کو۔"

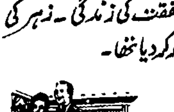
"ہاں، ہم سب شرمندہ ہیں آپ سے" فروزاں بھی ان سے لپٹ گئی۔ آپا رو رہی تھیں۔ میرا دل ان کے درد کو محسوس کر رہا تھا۔

"تم میری وجہ سے خودکشی کرنے جا رہے تھے؟" انھوں نے شکوہ کیا "میری وجہ سے؟"

"شیریں بہن" بیگم خاقانی نے کہا "اب جانے دیجیے۔ آپ ان دونوں کی بزرگ ہیں۔"

"ہاں آپا، جانے دیجیے" پال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھو روتی بھی رونے والی ہے اور میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔"

سب ہنس پڑے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا، ایک نئی زندگی مل گئی ہے۔ محبت کی زندگی... شفقت کی زندگی۔ زہر کی اس شیشی نے زندگی کا سارا زہر دور کر دیا تھا۔



کی ہوا میں خاصی خنکی آ گئی تھی۔

چالیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ سرسبز نواحی سڑک پر پہنچ گیا۔ اُس خوبصورت جانے پہچانے علاقے میں پہنچ کر وہ ہولے ہولے سیٹی بجانے لگا۔ وہ اپنے ذہن کو خیالات سے آزاد رکھنا چاہتا تھا۔ اسی سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے اُس نے کئی مرتبہ امیلیا سے کہا تھا ”اتنی خوبصورت سڑک پر اپنے ذہن کو خیالات سے صاف رکھنا چاہیے۔“

مزید پانچ منٹ کے بعد وہ اپنے نواحی مکان کے ڈرائیو وے میں داخل ہوا اور کار روک کر چند لمحوں تک خاموش بیٹھا رہا۔ اندر سے کسی قسم کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ امیلیا کام پر جا چکی تھی۔ اُس نے ڈیش بورڈ کے خانے سے چابیوں کا گچھا نکالا اور محتاط قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ امیلیا نے ابھی دروازوں کے تالے تبدیل نہیں کیے ہوں گے۔ جب اُس نے پہلی بار امیلیا کو وہ سو سال پرانا مکان دکھایا تھا تو وہ بہت ہنسی تھی۔ اُس نے کہا تھا ”اس خوفناک مکان میں تو کوئی آسیب ہی رہ سکتا ہے۔“ لیکن اب وہ خود ہی آسیب بن گئی تھی اور اُسے جو مکان کا اصل مالک تھا، نکال باہر کیا تھا۔

دروازے کا تالا پرانا ہی لگتا تھا۔ اسمتھ نے ایک چابی منتخب کی اور اُسے تالے میں گھمایا۔ تالا کھل گیا۔ گویا امیلیا نے تالے تبدیل کرنے کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا اور اداس نظروں سے کمروں کو دیکھنے لگا۔ امیلیا نے فرنیچر کی ترتیب تبدیل کر دی تھی۔ شاید اُس نے اپنی پسند کے مطابق ایسا کیا تھا یا کسی اور کی پسند کا خیال رکھا تھا؟ اُس کے دل میں شکوک نے سر اُبھارا۔ شاید وہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصّہ تھا، امیلیا اُسے کبھی بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اُس نے صرف مکان ہتھیانے کے لیے اُس کے ساتھ شادی کی تھی۔

وہ نشست گاہ سے ہوتا ہوا اپنی اسٹڈی میں پہنچ گیا اور گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر شیلف میں رکھی ہوئی کتابوں کو گھورنے لگا۔ امیلیا نے ہر کمرے میں تھوڑی تبدیلی کر دی تھی۔ میز دوسری جگہ پر رکھی تھی، شیلف میں کتابوں کی ترتیب بدلی ہوئی تھی۔ بلکہ اُس کی پسندیدہ کتابوں کی جگہ پر کچھ دوسری کتابیں وہاں نظر آ رہی تھیں۔ گویا امیلیا نے اُس کی یاد اور اُس کے اثرات کو بھلانے کے لیے وہ تبدیلیاں کی تھیں۔

وہ اُٹھا اور ٹہلتا ہوا خواب گاہ میں چلا گیا۔ یہ دیکھ کر اُسے حیرانی ہوئی کہ خواب گاہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ وہ غالباً خاصی عجلت میں گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ کیونکہ بستر بے ترتیب تھا اور اُس پر کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ اسمتھ نے امیلیا کا گاؤن اور دوسرے کپڑے ہینگر پر ڈال دیے اور بستر پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ تکیے میں سے امیلیا کے پرفیوم کی سوندھی سوندھی مہک آ رہی تھی۔ اُس نے گہرا سانس لیا اور سر گھما کر مینٹل پیس کی طرف دیکھا۔ اُس کی فریم شدہ تصویر وہاں موجود نہیں تھی۔ اُس نے اپنے سینے میں ایک ایسا درد محسوس کیا جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بستر سے اُٹھا، باہر گیا، کار کی ڈکی سے پٹرول سے بھرے ہوئے دو کنستر نکالے اور انھیں اندر لے آیا۔ اگر وہ اُس مکان میں نہیں رہ سکتا تھا تو کوئی دوسرا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

لیکن وہ امیلیا کو صلح کا ایک آخری موقع دینا چاہتا تھا۔ اُس نے پٹرول کے کنستر ایک طرف رکھ دیے اور فون کے پاس جا کر امیلیا کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے نہایت شگفتہ آواز میں کہا گیا ”گرے سنز رئیل اسٹیٹ، گڈ مارننگ۔“

”کیا میں مسز امیلیا اسمتھ سے بات کر سکتا ہوں؟“

”ہولڈ کیجیے۔“ خاتون نے کہا۔ لمحہ بھر کے بعد اسمتھ کے کان میں امیلیا کی کاروباری آواز آئی۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

”امیلیا، میں مائیکل اسمتھ بول رہا ہوں۔“

امیلیا کے لہجے کی خوشگواری غائب ہو گئی۔ ”تم نے کیوں فون کیا ہے؟“

”امیلیا، میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں بہت مصروف ہوں مائیک۔“ امیلیا نے کہا۔ ”اور میرے خیال میں کوئی ایسی بات باقی نہیں ہے جس پر ہم لڑ نہ چکے ہوں۔“

”میں لڑائی کی نہیں، صلح کی بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ معاملہ عدالت میں ہے، جو کچھ کہنا ہو وہ عدالت میں کہنا۔“

”میں تمھارے ساتھ صلح کرنا چاہتا ہوں امیلیا! عدالت میں صلح کی باتیں نہیں ہوا کرتیں۔ غلطی ہم دونوں کی تھی۔ اگر ہم پرانی باتوں کو بھول جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میں سب کچھ بھول چکی ہوں۔“ امیلیا نے تیز لہجے میں کہا۔ ”پرانی باتیں بھی بھول چکی ہوں اور پرانے لوگوں کو بھی بھول چکی ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ ٹھیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے؟“

”ہاں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور پلیز، میرا وقت ضائع نہیں کرو۔“

”اگر تم اس فیصلے پر نظرِ ثانی کر لو تو تمھارے حق میں اچھا ہو گا۔“

”کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“

”تم اسے دھمکی بھی سمجھ سکتی ہو۔“

”مثلاً تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

ہاضمی سے ہاضمہ دُرست
آپ سدا تندرست



- ہاضمی خوراک کو ہضم کرنے میں مدد دیتی ہے اور کھانے کے بعد پیٹ کے بوجھ اور بھاری پن کو دُور کرتی ہے۔
- پیٹ میں گیس اور ہواؤں کو بھی پیدا نہیں ہونے دیتی
- ھاضمی کی ٹکیاں نظام ہاضمہ اور اس سے متعلق شکایات مثلاً بدہضمی، بھوک کی کمی،
- گیس پیدا ہونا اور کھٹی ڈکاروں کے لئے مفید ہیں۔

ہاضمی



اکسیری

کی ھاضمی ہر دوافروش اور جنرل اسٹور سے دستیاب ہے۔

یونانی طریقہ علاج کے لئے
اوقاتِ خدمتِ مطب

صبح ۱۰ بجے سے دوپہر ۲ بجے تک
شام ۴ بجے سے ۶ بجے تک
بروز جمعہ تعطیل

بیرونی حضرات خط وکتابت کے ذریعے استفادہ کرسکتے ہیں۔

اکسیری دواخانہ

۴۔ مورس والا بلڈنگ
بالمقابل میونسپل کارپوریشن
ڈسٹرکٹ کورٹ۔
ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

فون: 213197

"امیلیا! ہیر، نے اپنا آبائی مکان اس لیے تمہارے نام نہیں کیا تھا کہ تم مکان پر قبضہ کر کے الگ ہو جاؤ۔۔۔ وہ ایک محبت کا اظہار تھا، مل جل کر رہنے کے لیے۔"

"ہوں... تو یہ بات ہے۔" امیلیا نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ تمہیں مکان کا غم کھا رہا ہے۔ مکان کو بھول جاؤ۔ اب وہ میرا مکان ہے۔"

"یہ مکان میرا ہے... اس کی بنیادوں میں میرے باپ دادا کا خون پسینہ ملا ہوا ہے۔ اگر تم میری بیوی بن کر نہیں رہ سکتی ہو تو تمہیں اس مکان میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

امیلیا چونک کر بولی۔ "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"تمہیں یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم صلح کر لو تو کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

"ہائیک! اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ مکان قانونی اور اخلاقی طور پر میرا ہے۔ جب تم نے مکان میرے نام کیا تھا تو شادی، محبت یا اکٹھے رہنے کی کوئی شرط نہیں لگائی تھی۔ بقول تمہارے تم نے مجھے تحفہ دیا تھا اور تحفہ کسی چیز سے مشروط نہیں ہوتا۔ تم بہت گھٹیا، خود غرض اور کمینے انسان ہو۔ میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی، نہیں گزار سکتی۔ اب تو بالکل نہیں گزار سکتی۔" اسکے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اسمتھ نے ریسیور پٹخ دیا اور پٹرول کا کنستر اٹھا کر خواب گاہ میں چلا گیا۔ اس نے خواب گاہ میں چاروں طرف پٹرول چھڑکا اور پھر اسے لکڑی کے زینے پر چھڑکتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ بچا کھچا پٹرول اس نے اسٹڈی میں چھڑکا اور دوسرا کنستر کھول کر اس کا پٹرول نشست گاہ اور لونگ روم میں چھڑکنے لگا۔ اس طرح دیگر کمروں میں چھڑکتے چھڑکتے وہ باورچی خانے کے دروازے پر پہنچ گیا۔

اس نے خالی کنستر ایک طرف رکھ دیا، شیلف سے ماچس اٹھا کر ایک تیلی جلائی اور اسے ڈائننگ روم میں پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی آگ کی لکیریں کسی سریع الحرکت سانپ کی طرح مختلف سمتوں میں دوڑتی چلی گئیں۔ اس سو سوا سو سال پرانی عمارت کا زیادہ حصہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اور وہ پرانی اور خشک لکڑی تھی۔

تیلی پھینکنے کے بعد اسمتھ جلدی سے باورچی خانے کے دروازہ کی طرف بڑھا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے دور چلا جانا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ دروازے کے وسط میں ایک آہنی راڈ لگی ہوئی تھی جو نیچے فرش تک چلی گئی تھی۔ اسے عرفِ عام میں پولیس لاک کہا جاتا تھا۔ اسمتھ اس قسم کے تالے شہر میں بھی دیکھ چکا تھا۔ جسے چوروں سے بچاؤ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسمتھ کو یاد آیا۔ امیلیا نے کہا تھا۔ "ہائیک، یہ تالا قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ ہمیں یہاں پر کوئی مضبوط تالا لگوانا چاہیے۔"

پیچھے آگ کے چٹخنے کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ اسمتھ نے خود کو سمجھایا کہ اُسے بدحواس نہیں ہونا چاہیے۔ باہر نکلنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور سمجھ میں آ جائے گا۔ اُس نے راڈ کو کھینچا، دروازے کو ٹھوکریں ماریں پھر پیچھے ہٹ کر پوری قوت سے ٹکر ماری لیکن پرانے وقتوں کا بنا ہوا ٹھوس لکڑی کا... دروازہ لوہے کی طرح مضبوط تھا۔ باورچی خانے میں تھوڑا تھوڑا دھواں آنا شروع ہو گیا تھا۔

اسمتھ کاؤنٹر پر چڑھ گیا اور کسی بھاری چیز کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن کوئی ٹھوس چیز نظر نہیں آئی۔ اُس نے کھڑکی پر لگے ہوئے نئے پردے ایک جھٹکے سے الگ کر دیے اور کھڑکی میں لگی ہوئی آہنی گرل کو توڑنے یا نکالنے کی کوشش کی۔ دھوئیں کی مقدار بڑھتی جا رہی تھی اور سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ کاؤنٹر سے نیچے اتر آیا، ٹونٹی کھول کر اپنے کپڑے گیلے کیے اور ڈائننگ روم سے گزر کر بیرونی دروازے تک جانے کا ارادہ کیا مگر وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا۔ آگ کی شدید تپش سے اس کے بال بھی جھلس گئے تھے۔ ڈائننگ روم جہنم کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

اسی لمحے زبردست دھماکے کی آواز سنائی دی۔ شاید چھت کا درمیانی حصہ ٹوٹ کر اندر گر پڑا تھا۔ وہ بدحواس ہو گیا۔ اُس کے کانوں میں خود اپنے چیخنے کی آواز آنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں سخت جلن ہونے لگی تھی۔ باورچی خانے میں گہرا سیاہ دھواں بھر رہا تھا۔ اُس نے نیچے نظر کی تو اُسے اپنی پتلون کے بائیں پائنچے میں آگ لگی ہوئی دکھائی دی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی ٹانگ کو نہیں کسی اور چیز کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنا کوٹ اتار کر ٹانگ کے گرد لپیٹ دیا۔ آگ بجھ گئی۔ وہ زمین پر لیٹ کر... باورچی خانے کے دروازے کی طرف بڑھا اور زور سے مکے مارنے لگا۔ اُس کے حلق سے مسلسل چیخیں نکل رہی تھیں۔ مکے مارتے مارتے اُس کے ہاتھوں سے خون بہنے لگا اور دھوئیں سے اُس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ نڈھال ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اُسے یوں لگا جیسے دور کہیں سائرن بج رہا ہو۔ پھر باورچی خانے کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شاید وہ امیلیا کا فون تھا۔ اسمتھ نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن جسم نے ارادے کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ آگ کے شعلوں نے اب باورچی خانے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

زندگی کے آخری لمحات میں اسمتھ کو فون کی گھنٹی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید امیلیا نے صلح کا فیصلہ کر لیا ہے، اب وہ ہمیشہ اپنے آبائی مکان میں رہ سکتا تھا۔ ہمیشہ کے لیے..... کوئی اُس کی راکھ کو مکان کی راکھ سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔



THE SETTLEMENT
Randy Lordon

Farrukh Malik



دوراہا

محمود احمد مودی

مغرب کی ایک درس گاہ کا قصہ جہاں اساتذہ تدریس کی طرف توجہ دینے کے بجائے ایک عجیب سی رسّاکشی میں مصروف ہوگئے تھے جس کے نتیجے میں دو جانیں ضائع ہوگئیں۔ جرم وسزا کی ایک مختصر اور دلچسپ کہانی۔ ایک خط جس نے ایک پولیس افسر کو ایک خطرناک دوراہے پر لاکھڑا کیا تھا۔

ڈیئر لیفٹیننٹ! میں ٹیچرز کے دُہرے قتل کے بارے میں تمھاری تحقیقات کا بغور جائزہ لیتا رہا ہوں۔ اخبارات اب یہ قیاس آرائیاں کررہے ہیں کہ شاید تم اس دُہرے قتل کے معمّے کے حل کے قریب تر پہنچ چکے ہو۔ چونکہ اس معاملے میں میرے ممکنہ طور پر ملوث ہونے کے بارے میں مجھ سے بارہا سوالات کیے جاچکے ہیں اور اخبارات بھی اس معمّے کے حل کے بارے میں قیاس آرائیاں کررہے ہیں لہٰذا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تم سے تحریری طور پر رابطہ قائم کیا جائے۔

چونکہ یہ بات حال ہی میں میرے علم میں آئی ہے کہ تمھاری بیٹی اس اسکول میں زیرِتعلیم ہے جہاں قتل کی یہ دُہری واردات ہوئی تھی، اس لیے میں ذاتی طور پر صرف تمھیں ہی یہ خط لکھ رہا ہوں۔ چونکہ قتل کی تحقیقات تمھارے سپرد ہیں اور جیساکہ حالات سے ظاہر ہے، مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی عار نہیں کہ اس معاملے میں نہ صرف تمھاری پیشہ ورانہ زندگی بلکہ ذاتی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ لہٰذا میں پوری دیانتداری کے ساتھ اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں جو کچھ تحریر کررہا ہوں اس کا ایک ایک لفظ سچائی اور حقیقت پر مبنی ہے۔

میں اس موقعے پر اپنی معصومیت کا ڈھنڈورا پیٹنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اور صرف تم سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ سائنس کے ٹیچر مسٹر ابراہام کا خاتمہ حقیقت میں مَیں نے ہی کیا تھا اور میں اس بات کا اعتراف بھی کرتا ہوں کہ میں ہی مس ٹرنر کو بھی قتل کرڈالتا اگر کوئی دوسرا اس معاملے میں مجھ سے سبقت نہ لے گیا ہوتا۔

ہاں لیفٹیننٹ۔ اہم نکتہ یہی ہے کہ کسی دوسرے نے مجھ سے پہلے یہ کام کر دکھایا! ہم دونوں کی بہتری کے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اپنے آدمیوں کو میری نگرانی پر سے ہٹادو اور ان

Farrukh Malik

کی توجہ کسی اور کی جانب مبذول کرا دو۔

کیا میں اس موقع پر حساب کے ٹیچر مسٹر کالکنز کا نام اس اُمیدوار کی حیثیت سے پیش کر سکتا ہوں جس پر تمہارے آدمی اپنی توجہ مبذول کر سکیں؟ دُہرے قتل کی واردات کے دن وہ نہ صرف اس وقت اسکول میں موجود تھا بلکہ وہ مس ٹرنر کا عاشق بھی تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ مس ٹرنر کے عاشقوں میں سے ایک تھا۔

میری تمام تر پریشانیوں کا مرکز مس ٹرنر کا اندازِ زندگی تھا۔ وہ اپنے قابلِ اعتراض لباس میں جب بھی مختلف ہالوں سے گزرتی تو ٹیچرز اور نوجوان طالب علموں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ میں بارہا اشاروں کنایوں میں اسے مشورہ دے چکا تھا کہ وہ اسکول میں قاعدے کا لباس پہن کر آیا کرے لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ بالآخر مجھے کھل کر کہنا پڑا کہ اس کا قابلِ اعتراض لباس ہمارے اسکول کے ناپختہ ذہن طالب علموں کے لیے اچھی مثال نہیں بن سکتا اور وہ لباس کے معاملے میں قدامت پسندی کا ثبوت دے۔

میری یہ بات سن کر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کیا اور مجھے دقیانوسی ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے بولی۔ ”اس اسکول کو تم جیسے قدامت پسند پرنسپل کی ضرورت نہیں جو اب بھی تاریک دور کی یاد تازہ رکھنا چاہتا ہے۔ ہمیں ایک ماڈرن اور ترقی پسند پرنسپل چاہیے جو زمانے کا ساتھ دے سکے۔ میں کوشش کروں گی کہ کسی طرح تمھیں اس عہدے سے ہٹا دیا جائے، چاہے مجھے اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔“

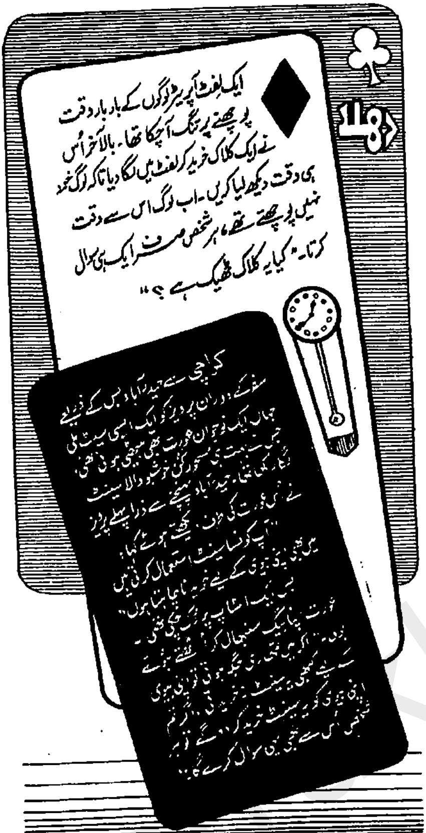
بس یہیں سے مشکلات کے پہیے نے گردش کرنا شروع کر دی۔ مس ٹرنر نے سب سے پہلے اپنے اس منصوبے میں مسٹر ابراہام کو شامل کیا اور وہ سب کچھ کر گزری جو اس نے کہا تھا۔ آج کے خود ساختہ ماڈرن ٹیچرز میں سے ایک ہونے کا دعویٰ کرنے والی مس ٹرنر اپنے طالب علموں کو ریکارڈز سننے کا مشورہ دیتی اور پھر ان سے کہتی کہ وہ ان گانوں کے بولوں کا مطلب ایک دوسرے سے بیان کریں۔ اس بات کو وہ طالب علموں میں اظہارِ رائے کی صلاحیت بڑھانے سے تعبیر کرتی تھی۔ اُدھر جب طالب علم کلاس میں اظہارِ رائے کی صلاحیت بڑھانے میں مگن ہو جاتے تو وہ ٹیچرز لاؤنج میں جا کر مسٹر ابراہام سے اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتی تھی۔ ابتدا میں میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس صورتِ حال کو عارضی طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر میں ان کے خلاف الزامات عائد کرتا تو شاید مس ٹرنر وقتی طور پر ان حرکتوں سے باز آجاتی لیکن پھر وہ مجھے تباہ کرنے کے لیے زیادہ اچھے ہتھکنڈے استعمال کر سکتی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ ابراہام اتنا زیادہ ماڈرن ہرگز نہیں تھا۔ ابراہام میں مس ٹرنر کی دلچسپی کی وجہ اس شخص کا ڈیل ڈول، اسکول میں اس کی عزت و احترام اور پندرہ سال کی سروس تھی۔ اس کے علاوہ ابراہام ہی وہ شخصیت تھی جس سے وہ مجھے پرنسپل کے عہدے سے ہٹانے میں مدد لے سکتی تھی۔ ادھر ابراہام اپنے گرتے ہوئے بالوں اور بڑھتی ہوئی توند کے باوجود شاید یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ بالآخر وہ اس شخصیت کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو اس کی اندرونی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اس کی جانب مائل ہوئی ہے۔ آہ۔ بے چارہ ابراہام! اس نے فوراً ہی اپنی مونچھیں بڑھانا شروع کر دی تھیں حالانکہ مونچھوں کے بالوں کی رنگت سر کے بالوں کی رنگت سے قطعی مختلف تھی۔ وہ اپنا پولسٹر کا واحد سوٹ پہنے اس انتظار میں کھڑا رہنے لگا تھا کہ پہلی گھنٹی بجنے سے قبل مس ٹرنر کو خوش آمدید کہہ سکے۔ ابراہام، جسے میں حیاتیاتی اندھے پن کا شکار کہا کرتا تھا، میری ملازمت کے تحفظ کے لیے خطرہ بنتا جا رہا تھا۔ لہٰذا اس کا راہ سے ہٹانا ناگزیر ہو گیا تھا۔

جوئیل، مس ٹرنر کی خصوصیات کا مردانہ نمونہ تھا۔ یہ عادتیں اس میں فطری طور پر موجود تھیں۔ وہ بہت منہ پھٹ اور ہنگامہ پسند ٹیچر تھا۔ وہ بھی مس ٹرنر کی مانند خود کو ماڈرن کہلاتا تھا۔ وہ اکثر اپنے گھونگھریالے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے وقت کے ساتھ بدلنے کی باتیں کیا کرتا۔ ”تمھیں وقت کے ساتھ خود کو بھی بدلنا چاہیے۔“ وہ اکثر کہا کرتا۔ حالانکہ اس شخص کو وقت کے ساتھ بدلنے کی بات کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا جو کہ اپنی خاکی قمیص تک بدلنے کا روادار نہیں تھا۔ یہ قمیص ہر وقت اس کے جسم پر دکھائی دیا کرتی تھی۔ میں جب کبھی ہال میں سے گزرتا تو اُسے رنگین شیشوں کی عینک کی آڑ سے گھورتا دیکھتا۔ ساتھ ہی وہ اپنی داڑھی کھجلانا شروع کر دیتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ یہ شخص میرے عہدے پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ مجھے جب بھی یہ خیال آتا کہ یہ لوگ اسکول کمیٹی سے میرے خلاف شکایا کر کے مجھے اس عہدے سے ہٹانا چاہتے ہیں تو میرے ہاتھ پیر پھولنا شروع ہو جاتے۔ میں اس عہدے کو کسی قیمت نہیں چاہتا تھا۔ ان لوگوں کی سازش سے بچنے کے لیے کو نہ کوئی تدبیر اختیار کرنا بے حد ضروری تھی۔

میں نے جمعہ کے اس مخصوص دن کا انتخاب بہت سو سمجھ کر کیا تھا۔ جمعے کے دن عام طور پر ویک اینڈ کے مشن طلبا اور ٹیچرز جلدی جلدی اپنے گھروں کو بھاگنے کی سو میں ہیں۔ اس روز بھی مس ٹرنر، مسٹر ابراہام اور مسٹر جوئیل کے

Farrukh Malik



تمام ٹیچرز اور طلبا چھٹی ہوتے ہی اسکول سے چلے گئے تھے۔ وہ تینوں شاید مجھے ہٹانے کے منصوبے پر آخری بار گفتگو کرنے کے لیے رُک گئے تھے۔ صفائی کا عملہ اس وقت جمنازیم کے فرش پر پالش کرنے میں مصروف تھا۔

میں نے یہ صورتِ حال دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ مجھے اپنی نوکری بچانے کے لیے جو تدبیر اختیار کرنی تھی اس پر عمل کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور دن نہیں ہو سکتا تھا۔

ابراہام کو ٹھکانے لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ میں جب ہتھوڑی لیے اس کی کلاس میں داخل ہوا تو وہ اپنی نفسوص میز پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی پُشت میری جانب تھی۔ اس نے قدموں کی چاپ سُن لی تھی کیونکہ میں نے اس کی گردن کو پلٹے سے گھومتے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے مس ٹرنر سمجھا تھا جو دبے پاؤں اس کی گنجی کھوپڑی کو پیار کرنے بڑھ رہی تھی۔ میں نے ہتھوڑی اٹھاتے ہی پوری قوت اور تیزی سے اس کی کھوپڑی پر وار کیا۔ اس بیچارے کو شاید اندازہ بھی نہیں ہوسکا کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹی تھی۔

میں کلاس روم سے نکلنے ہی والا تھا کہ مجھے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ مجھے ایک دم پسینہ آگیا۔ تمھیں تو اس قسم کے پسینوں کا بخوبی اندازہ ہوگا لیفٹیننٹ! پہلے گرم اور پھر سرد پسینہ۔ میں اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تو یقیناً میری نوکری چھوٹ جائے گی۔ میں نے سوچا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ بولنے کی آوازیں نہیں تھیں، یہ چیخیں تھیں۔ کوئی گھٹے گھٹے انداز میں چیخ رہا تھا۔

سب سے پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید مس ٹرنر اور مسٹر جوئیل کے درمیان محبت کی جنگ چھڑ گئی ہے — میں مس ٹرنر کے کمرے کی جانب بڑھا۔ جب میں کمرے کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ مس ٹرنر واقعی چیخ رہی تھی یا چیخنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی گردن پر جمے ہوئے ہاتھوں کی گرفت بہت سخت تھی۔ وہ ہاتھ بہت طاقتور دکھائی دے رہے تھے۔ ان ہاتھوں کی طاقت کا اندازہ ان سرخ نشانات سے لگایا جاسکتا تھا جو مس ٹرنر کے چہرے پر نمایاں تھے۔ ان ہاتھوں نے یقیناً مس ٹرنر کے چہرے کی خاصی مرمت بھی کی تھی۔

"اب تم اس شخص کو کبھی ہاتھ نہیں لگا سکوگی، کبھی نہیں۔" گلا گھونٹنے والی شخصیت غرائی۔ "میں تمھیں پہلے بتا چکی تھی کہ تمھارے لیے بوائے فرینڈز کی کمی نہیں، لہٰذا تم میرے بوائے فرینڈ کو چھوڑ دو لیکن میری تنبیہ کے باوجود تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب اپنی حرکت کا مزہ لو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ہاتھوں کی گرفت سخت کردی۔ مس ٹرنر کے حلق سے آوازیں نکلنا بند ہوگئیں۔ اس کے باوجود اس لڑکی نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ پھر جب اُسے اطمینان ہوگیا کہ وہ جس ارادے سے وہاں آئی تھی، وہ کام مکمل ہوگیا ہے تو اس نے مس ٹرنر کے مُردہ جسم کو ایک ٹھوکر رسید کی اور دروازے کی جانب پلٹ گئی۔

میں اس وقت تک ایک لاکر کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے مستقبل کے منصوبوں میں یہ لڑکی کتنا اہم کردار ادا کرے گی۔

میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میرے تین مخالفین میں سے دو ٹھکانے لگ چکے تھے۔ اب ایک باقی رہ گیا تھا اور مجھے خدشہ تھا کہ جوئیل کسی بھی وقت اسکول کمیٹی کے پاس میرے خلاف شکایت کرنے جاسکتا ہے۔

میں نے سوچا کہ کیوں نہ لگے ہاتھوں جوئیل سے بھی نمٹ لیا جائے۔ میں نے اسی ارادے سے اس کے کمرے کی جانب

جام صحت

کسی نے جانسن نامی ایک شخص سے، جس کا بھائی بہت بڑا پادری تھا، دریافت کیا کہ کیا تمہارا بھائی تمہاری شراب نوشی پر کوئی اعتراض نہیں کرتا؟ جانسن نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہم دونوں کے تعلقات بہت اچھے ہیں وہ میرے لیے دُعا کرتا ہے اور میں اس کی صحت کا جام پیتا ہوں۔"

قدم اٹھائے ہی تھے کہ وہ تیز تیز قدموں سے ہال میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ شاید وہ اپنے سازشی ساتھیوں سے ملاقات کرنے ادھر آرہا تھا۔ اس کی جھلک دیکھتے ہی میں ایک بار پھر لاکر کے پیچھے چھپ گیا۔ جوئیل کو ٹھکانے لگانے کے لیے خاصی قوت اور مہارت درکار تھی کیونکہ وہ طاقتور ہونے کے ساتھ جوان بھی تھا۔ اس پر بہ آسانی قابو نہیں پایا جا سکتا تھا۔

لیکن بدقسمتی سے وہ میرے مقابلے میں مسٹر ابراہام کے کمرے سے زیادہ نزدیک تھا۔ مسٹر ابراہام کے کمرے میں قدم رکھنے کے بعد جیسے ہی اسے صورتِ حال کا اندازہ ہوا وہ تیزی سے پلٹا اور ہال کے قریب ترین دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کے تاثرات نمایاں تھے۔

اس کے ہال سے نکلتے ہی مجھے اپنی ملازمت ہاتھ سے جاتی دکھائی دی۔ یہ ایک ایسی خطرناک صورتِ حال تھی کہ میں پریشان ہو گیا۔ مجھے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ جوئیل لوگوں کو میرے اور ابراہام کے اختلافات کے بارے میں سب کچھ بتا دے گا اور اس طرح میری پوزیشن مزید نازک ہو جائے گی۔

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ تمہارے آدمی مجھے پکڑ کر تمہارے پاس لے گئے۔ تمام شواہد میرے خلاف تھے اور تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ قتل کا شبہ مجھ پر ہی کیا جا رہا ہے۔

پھر جب تم مجھے مزید سوالات کے لیے اپنے دفتر لے گئے تو وہاں پہنچ کر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا لیفٹیننٹ میں اس وقت تم سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کر سکا کیونکہ اس وقت دفتر میں تمہارے آدمی بھی موجود تھے۔

ہو سکتا ہے کہ میری اس تحریر پر تم مجھے احمق اور بے وقوف سمجھ رہے ہو کیونکہ اس طرح میں نے اپنے جرم کا تحریری طور پر اعتراف کر لیا ہے اور میرے خلاف یہی تحریر سب سے بڑے ثبوت کے طور پر پیش جا سکتی ہے۔ دیگر الفاظ میں یہ کہ میں نے خود اپنی قسمت پر اپنے ہاتھوں سے مُہرِ ثبت کر دی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ میری یہ حراست عارضی ہے اور میں جلد ہی رہا ہو جاؤں گا۔

میں جانتا ہوں کہ جس لڑکی نے مس ٹرنر کو ہلاک کیا تھا، وہ بھی جلد گرفتار کر لی جائے گی۔ حالانکہ میرے اختلافات جوئیل سے رہے ہیں اور اس لڑکی سے میرا کوئی تعلق نہیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ مجھے اپنے مقدمے کے دوران وہ ناقابلِ تردید ثبوت مجبوراً پیش کرنا پڑیں گے جو کہ اس لڑکی کے اس مقدمۂ قتل سے منسلک ہونے کے بارے میں ہیں لیکن پھر... معاف کرنا لیفٹیننٹ میں شاید بہک گیا تھا۔ میں گفتگو کا رُخ اس حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کا احساس مجھے تمہارے کمرے میں پہنچ کر ہوا تھا۔ مجھے اب بھی خدشہ ہے کہ اگر جوئیل، اسکول کمیٹی کے پاس میری شکایت لے گیا اور مجھے اس عہدے سے ہٹانے پر زور دیا تو کام بگڑ سکتا ہے، حالات کسی طور پر میرے موافق نہیں۔

لہٰذا میرا پُرخلوص مشورہ ہے کہ تم اس دُہرے قتل کے الزام میں جوئیل کو گرفتار کر لو۔ ویسے بھی وہ اور مس ٹرنر ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا رہ چکے ہیں۔ میں اس بارے میں یہ کہوں گا کہ اُسے جب معلوم ہوا کہ مس ٹرنر اس کے اور مسٹر ابراہام کے ساتھ بیک وقت رومانس لڑا رہی ہے، تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے جذبۂ انتقام میں ان دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ وہ دونوں مل کر اُسے بے وقوف بنا رہے ہیں۔

اس طرح میرا مسئلہ بحسن خوبی حل ہو جائے گا۔ اسکول کمیٹی ایک قاتل کی شکایت پر قطعی کوئی کان نہیں دھرے گی اور ادھر تم بھی اپنے مطلوبہ قاتل کو گرفتار کر لو گے اور دُہرے قتل کا یہ کیس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

مجھے اُمید ہے کہ تم اس بارے میں میرے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے اور سوچنے کی کوشش کرو گے لیفٹیننٹ۔

میں نے تمہارے دفتر کی میز پر جو تصویر دیکھی تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ایک خوشحال اور آسودہ فیملی کے سربراہ ہو۔ میں یہ مشورہ دے کر تمہارے خاندان کا سکون غارت نہیں کرنا چاہتا کہ تمہاری بیٹی، ہمارے اسکول کی ریسلنگ ٹیم میں شامل ہو جائے۔ حالانکہ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے تمہاری بیٹی کے ہاتھوں کی طاقت اور حوصلے کا عملی مظاہرہ دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ اگر وہ ٹیم میں شامل ہو تو پھر ہمارے اسکول کو خواتین کی ریسلنگ چمپئن شپ جیتنے سے کوئی نہیں روک سکتا

PRINCIPAL OF THE ...
...an Szafranski.



مالِ مفت

عائشہ جمال

انسان کی نیّت ھی شاید اس کی بخشش کا پیمانہ ہے۔ وہ پیشہ ور مُجرم نہیں تھا مگر جب اسے چوری کا مال ملنے لگا تو اُسے اس کی چاٹ پڑ گئی۔ لیکن ایک دن لالچ کی یہ کہانی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ ایک انوکھے پنچھی کا قصہ جسے انگوٹھیوں سے عِشق تھا۔

یہ کہانی میرے دوست مرسیانو کی ہے جو کئی سال قبل ایک خطرناک سانپ کے ڈسنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ میں چونکہ اُن تمام حالات سے واقف ہوں اور اُس کی موت بھی میرے ہی سامنے واقع ہوئی۔ لہٰذا آج میں اُن واقعات سے پردہ اٹھاتا ہوں۔ میری پوری پوری کوشش یہ ہے کہ اس کہانی کو مرسیانو کی زبان ہی میں بیان کروں۔ اب آپ سب ہمہ تن گوش ہو جائیں کہ مرسیانو اپنی کہانی شروع کرتا ہے۔

ایک طوفانی سرد صبح میں چہل قدمی کے لیے نکلا۔ میں نے دیکھا کہ ساحلِ سمندر سے کچھ دور اندر کی طرف کوئی چھوٹی سی چیز پڑی ہوئی ہے۔ پہلے پہل میں سمجھا کہ کوئی پتھر وغیرہ ہوگا لیکن جلد ہی مجھے اپنا خیال تبدیل کرنا پڑا۔ وہ کوئی جاندار چیز تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا اور جب نزدیک پہنچا تو میں نے دیکھا وہ ایک بگلے کا بچہ تھا۔ بڑا ہی پیارا، خوبصورت اور زردی مائل۔ بے شمار سفید سفید بگلے اپنے بڑے بڑے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے اپنی کریہہ اور دہشتناک آوازوں میں شور مچاتے ..... اُس کے اردگرد چکر لگا رہے تھے۔ شاید وہ اُسے وہاں سے اٹھا کر لے جانا چاہتے تھے لیکن نہ جانے کیوں وہ نیچے اترنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔

میں چند لمحے اُس حقیر سے جانور کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کا نرم نرم گوشت موجوں کے ٹکراؤ سے جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور سرخ سرخ خون پانی کو رنگین بنا رہا تھا۔ اُس کے نازک پر بالکل ٹیڑھے اور مُڑے ہوئے تھے۔ وہ اب بس چند ہی لمحوں کا مہمان تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ غشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ شاید وہ اپنی موت کا منتظر تھا۔

ایک دیوہیکل لہر اب اُس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یقیناً وہ اس بے رحم موج کا مقابلہ نہ کر پاتا اور وہ اس کے پھول سے نازک جسم کو بے ترپ کر جاتی۔ میں لپک کر آگے بڑھا اور جھپٹ

Farrukh Malik

کر اُسے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ اب وہ اِس سنگدل لہر کی زد سے محفوظ ہو چکا تھا۔ جب میرے ہاتھوں میں اُس کا نرم و گداز جسم آیا تو شاید اُس نے یہ سمجھا ہو گا کہ اب وہ کسی بڑے پرندے کے پنجوں کی گرفت میں ہے جو اُسے تر نوالہ جان کر ایک ہی لقمے میں نگل جائے گا۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھا دیں گویا خدا سے رحم کی درخواست کر رہا ہو۔ لیکن اگلے ہی لمحے اُسے احساس ہو گیا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ میرے گرم ہاتھوں میں سمٹ کر اُسے دنیا جہان کا سکون مل رہا تھا۔ اُس نے بڑی پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرے سینے میں منہ چھپا لیا۔

میں اُس کے دل کی دھڑکن کو صاف محسوس کر رہا تھا۔

میں نے اُسے اور زور سے بھینچ لیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اُس کا تمام ڈر خوف دور ہو چکا تھا۔ اب اُس کے جسم میں زندگی کی حرارت دوڑنے لگی تھی۔ وہ سخت بھوکا تھا۔ میں نے خشک مچھلیاں اُس کے آگے ڈال دیں اور وہ اپنی خوراک پر بے تحاشہ ٹوٹ پڑا۔ پیٹ بھر جانے کے بعد وہ بے پناہ خوش دکھائی دینے لگا۔ کبھی میرے گالوں کو چومنے کی کوشش کرتا اور کبھی اپنے نازک پنجوں سے میرے ہاتھوں کو گھیرنا چاہتا۔ شاید اُسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔

میں نے اُس کی مرہم پٹی کرنے کے بعد اُسے گیراج میں رکھ دیا تھا۔ روزانہ میں اُس کے لیے مچھلیاں پکڑ کر لاتا، وہ کھا کھا کر موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ گیراج میں ہر وقت مچھلیوں کی بساند پھیلی رہتی۔ اگرچہ وہ تمام وقت گیراج میں ہی بند رہتا لیکن اُس کی موجودگی پورے گھر میں محسوس ہوتی تھی۔ وہ گیراج ہی میں پرواز کی مشق کرتا رہتا۔ اُس کے پروں کے پھڑپھڑانے، ٹین کی چھت سے ٹکرانے اور کبھی کبھی زمین پر گر جانے کی زوردار آوازیں میرے کانوں سے ہمہ وقت ٹکراتی رہتیں۔ اب وہ میری پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ اُسے بس اپنے لنچ اور ڈنر سے مطلب تھا۔ میں مچھلیاں لے کر اندر جاتا اور وہ میری طرف دیکھے بغیر اپنے کھانے میں جُت جاتا۔ اُس کو کھلانا پلانا اور خدمت کرنا بس ایسا ہی تھا گویا نیکی کر کے دریا میں ڈال دیا جائے۔

وہ رفتہ رفتہ منزلِ شباب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا اور روز بروز قوی تر۔ بہت جلد وہ پرواز میں طاق ہو گیا۔ یہ سب کچھ اُس نے صرف اپنی قوتِ ارادی اور ہمت سے حاصل کیا تھا۔ میں نے کبھی اُس کی حوصلہ افزائی نہیں کی، سوائے اس کے کہ اب اُسے گیراج کی قید سے آزاد کر دیا تھا۔ روزانہ وہ پرواز کے لیے نکل جاتا۔ اپنے فاصلے کو بتدریج بڑھا کر اب وہ کافی لمبی اور اونچی پرواز کرنے کے .... قابل ہو چکا تھا۔

اُس کی پرواز میں ایک عجیب شان تھی۔ میں جب بھی اُسے فضا میں بلند ہوتا ہوا دیکھتا تو یہ فرض کر لیتا کہ اب میں اُسے آخری بار دیکھ رہا ہوں۔

میں نے اُس کے اندر ایک عجیب سی بات محسوس کی۔ بجائے سمندر کی طرف پرواز کرنے کے اُس کا رُخ ہمیشہ شہر کے گنجان اور فیشن ایبل علاقے کی طرف ہوتا۔ یوں لگتا تھا گویا وہاں کوئی ایسی چیز ضرور ہے جسے دیکھے بغیر اُسے ہرگز چین نہ آئے گا۔

ایک دن وہ صبح سویرے ہی پرواز پر روانہ ہو گیا۔ میں دیر تک اُس کا انتظار کرتا رہا لیکن اُس کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ آخر میں بالکل ہی نا اُمید ہو گیا، میں نے سوچ لیا کہ اب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری دنیا کو چھوڑ کر اپنی آزاد فضاؤں میں واپس چلا گیا ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جب میں باہر نکلا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ واپس آ کر گیراج کے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ میں فرطِ مسرت سے آگے بڑھا اور اُسے پکڑ کر بے تحاشا چومنے لگا۔ جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ میں جس قدر گرم جوشی کا مظاہرہ کر رہا ہوں، وہ اتنا ہی سرد مہر سا نظر آتا ہے۔ وہ بالکل ساکت سا میرے ہاتھوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ میری تمام خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ میں نے اُسے دھیرے سے نیچے اتار دیا، اور پھر اچانک میری نگاہ اُس کے پنجوں پر پڑی۔ حیرت سے میری چیخ نکل گئی۔ اُس کے پنجوں میں ایک بیش قیمت انگوٹھی دبی ہوئی تھی۔ خوشی سے میرا چہرہ گلنار ہو گیا۔ میں نے انگوٹھی اُس کے پنجوں سے نکال لی اور تشکر آمیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

دوسرے دن میں نے اور سویرے اُسے اپنی مہم پر روانہ کر دیا اور اطمینان سے بیٹھ کر اُس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ شام کو واپس آیا اور کامیاب۔ ایک بار پھر وہ بے حد قیمتی انگوٹھی لے آیا تھا۔ میں نے اُسے شاباشی دی اور انگوٹھی کو اپنے بریف کیس میں بند کر دیا۔

اب یہ روز کا معمول بن گیا۔ ہر شام میں ایک عدد قیمتی انگوٹھی کا مالک ہوتا۔ میں اِن انگوٹھیوں کو سنبھال سنبھال کر رکھ رہا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر انھیں اسی شہر میں فروخت کرنے کی کوشش کی تو میری خیر نہیں۔ مجھے وقت کا انتظار کرنا تھا تاکہ بے شمار دولت اکٹھی کر لینے کے بعد کسی دوسرے ملک چلا جاؤں۔ نہ جانے اُسے انگوٹھیوں سے اِس قدر عشق کیوں تھا۔ وہ انگوٹھی کے سوا کبھی کسی اور چیز کو بالکل ہاتھ نہ لگاتا۔

میرے پاس اب ایک سو انگوٹھیوں کا ذخیرہ ہو چکا ہے۔ یہ سب کی سب ایک سے ایک بڑھ کر قیمتی ہیں۔ ان کی مجموعی

قیمت دس ہزار پونڈ سے کسی صورت کم نہیں۔ لیکن یہ کوئی اتنی بڑی دولت نہیں۔ ابھی مجھے اور انگوٹھیاں جمع کرنا پڑیں گی۔ بلکہ اب تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ نادان بگلا جب تک میری "خدمت" اپنی مرضی سے کرنا چاہتے کرتا رہے۔ کبھی نہ کبھی تو وہ پکڑا جائے گا یا کسی گولی کا نشانہ بن جائے گا۔ یعنی میرا مطلب ہے کہ اُسے آخر دم تک پورا پورا موقع دیا جائے۔ جس روز وہ واپس نہیں آئے گا اُس دن میں اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچوں گا۔

پورا ایک سال گزر چکا ہے۔ میرے پاس انگوٹھیوں کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ اب میں سنجیدگی سے سوچنے لگا ہوں، قبل اس کے کہ میں کسی خطرے میں گھر جاؤں مجھے اپنا ٹھکانہ کر لینا چاہیے لالچ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ ایسا نہ ہو کہ "بس ایک اور، ایک اور" کرتے کرتے کوئی لعل بالٹی سے باہر آگرے اور میں بے موت مارا جاؤں۔ آج وہ واپس آجائے تو انگوٹھی اپنے قبضے میں کرنے کے بعد میں اُس کی گردن مروڑ دوں گا، تاکہ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔ نہ وہ زندہ رہے گا نہ میں مزید لالچ میں مبتلا ہوں گا۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد میں اُس کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے اُسے دور سے آتے ہوئے دیکھ لیا۔ آج اُس کی رفتار میں بے حد تیزی تھی۔ میں جان گیا کہ آج وہ شدید خطرے میں ہے۔ اُس کا یہ انداز میرے لیے شدید پریشانی کا باعث بن گیا۔ ممکن ہے کوئی اُس کے تعاقب میں مجھ تک پہنچ جائے اور یوں تمام راز آشکارا ہو جائے۔ اتنی دولت سے مفت میں ہاتھ دھونا پڑیں اور جو کئی سال جیل میں سڑنا پڑے گا وہ الگ۔ خیر اب تو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ میرے بے حد قریب آچکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا جسم خون میں لت پت تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک گونہ خوشی ہوئی۔ آج وہ ضرور کسی گولی کا نشانہ بنا ہے۔ جو کام میں کرنا چاہتا تھا وہ خود بخود ہو گیا تھا۔

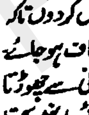
وہ بس کچھ ہی دیر کا مہمان نظر آتا تھا۔ صرف چند لمحے گزرے اور وہ قلابازیاں کھاتا ہوا میرے قدموں میں آگرا اور ترحم آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اُس کی حالت پر کوئی توجہ نہ دی۔ مجھے تو اب یہ فکر ستا رہی تھی کہ اُس کے پیچھے کون وارد ہوتا ہے لیکن خدا کا شکر کہ ابھی تک کسی کی دستک نہیں سنائی دی تھی۔

بے اختیار میری نگاہیں اُس کے پنجوں پر جم کر رہ گئیں۔ وہاں ایک چھوٹی، گول، سیاہ اور پینسل جتنی موٹی کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، آج یہ کسی نئے زیور پر ہاتھ مار کر آیا ہے۔ یہ یقیناً سنگ سیاہ سے بنا ہوا قیمتی کنگن ہے۔ میں آگے بڑھا اور بے اختیار ہاتھ سنگ سیاہ کے کنگن پر رکھ دیا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھوں میں بجلی کا ایک زبردست جھٹکا لگا ہے۔ میں چیخ مار کر پیچھے کی طرف اُلٹ گیا۔ جب ذرا حواس درست ہوئے تو میں نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا وہاں ایک ننھا سا سوراخ تھا جس سے خون کے قطرے وقفے وقفے سے نکل کر گر رہے تھے۔ ہر قطرے کے ساتھ یوں لگتا تھا جیسے کوئی میری روح کھینچ رہا ہو۔ چند ہی لمحوں میں میرا دم نکلنے لگا۔ میں نے "کنگن" پر ایک نگاہ ڈالی اور یکدم مجھ پر ایک نیا انکشاف ہوا۔

جس چیز کو میں سنگ سیاہ کا قیمتی کنگن سمجھا تھا وہ ایک بے حد زہریلا اور خطرناک سانپ تھا۔ اس سانپ کے کاٹے کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے اور مار گزیدہ بہتر گھنٹوں کے اندر گھل گھل کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ میرا تمام جسم نیلا پڑ چکا ہے اور میں بس چند ہی گھنٹوں کا مہمان ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں، آج میں اپنے مہربان دوست اور محسن کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے والا تھا لیکن میری اِس بے وفائی کا بدلہ قدرت کی طرف سے مجھے مل گیا۔ ٹھیک ہے، جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے، وہ کبھی کبھی خود بھی اُس میں گر جاتا ہے۔

یہ تو تھا مرسیالو کا المیہ، قارئین کے پیٹ میں یقیناً یہ تکلیف ہو رہی ہوگی کہ اُن انگوٹھیوں کا کیا حشر ہوا جو بگلے نے مرسیالو کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ تو قارئین! میں آپ کی پریشانی کو دور کرنے کے لیے اپنا طربیہ بیان پیش کرتا ہوں۔

وہ تمام کی تمام انگوٹھیاں جن کی تعداد کل ڈھائی سو تھی، (کیونکہ بگلا کبھی چھٹی کر لیتا اور کبھی بیمار بھی پڑ جاتا، بعض اوقات ناکام واپس آجاتا تھا) مرسیالو کی موت کے بعد میرے قبضے میں آگئیں۔ میں ہی اُس کا واحد رازداں تھا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ آخری لمحوں میں، میں اُس کے پاس موجود تھا۔ اُس نے سب کچھ بتلانے کے بعد گزارش کی تھی کہ میں یہ تمام انگوٹھیاں اُن کے مالکوں کا پتا لگانے کے بعد انھیں واپس کر دوں تاکہ اُس کے گناہ دھل جائیں اور وہ بالکل پاک و صاف ہو جائے۔ لیکن بھلا ہاتھ آئی ہوئی دولت کو کون اتنی آسانی سے چھوڑتا ہے۔ میں آپ کو صاف صاف بتا دینے میں کوئی عار نہیں سمجھتا کیونکہ اب مجھے گرفتاری کا کوئی خوف نہیں ہے۔ اس واقعے کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے اور آپ لوگ یقیناً میری ظاہری صورت اور حالت دیکھ کر اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ میں نے وہ تمام دولت جوئے اور شراب میں تباہ کر دی۔



Arturo Vivante.



میرا نام غلام جیلانی ہے۔ میری داستان معاشرے میں موجود مکروہ چہروں اور تلخ حقیقتوں کی داستان ہے۔ بہن کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے مجھے مجرم بننا پڑا۔ انسانی اعضا کا بیوپار کرنے والے ایک گروہ نے آپریشن کرکے میرا ایک گردہ نکال لیا۔ اس گروہ کی سرغنہ شخصیات ڈاکٹر دھمن اور عالیہ تھے۔ انہوں نے میری بہن کو بھی اغوا کرلیا تھا۔ جوابی کارروائی میں فائرنگ سے ڈاکٹر دھمن کے کلینک پر کچھ افراد مارے گئے، میں گرفتار ہوا اور پھانسی کی سزا کا مستحق ٹھہرا مگر ایک مرحلے پر مجھے جیل سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ قانون کی نظروں سے بچتا بچاتا میں اپنی بہن آسیہ کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ میری ملاقات حادثاتی طور پر اسلم آبی سے ہوگئی۔ آبی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چوری، ڈکیتی کی وارداتوں میں ملوث رہتا تھا۔ لاہور کا ایک بااثر شخص شیر دل آہو، معقول حصہ وصول کرکے اس کی مدد کرتا تھا۔ میں بھی آبی کی معرفت آہو کے چکر میں آگیا اور آہو کی سالی مسند آرا سے دل ہار بیٹھا۔ آسیہ کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنی عزت بچانے کے لیے دو قتل کرکے چودہ سال قید کاٹ رہی ہے۔ آہو نے آسیہ کو آزادی دلانے کا وعدہ کرکے مجھ سے ہادی علی نامی زمیندار کو قتل کرادیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مقتول، آہو کا سسر اور مسند آرا کا باپ تھا۔ اسی دوران میری ملاقات ماجدہ نامی ایک لڑکی سے ہو گئی تھی۔ وہ میری احسان مند تھی۔ آہو نے مجھ سے وعدہ خلافی کی اور مجھے ختم کرانے کی کوشش کی تو میں اسلم آبی کے پاس پہنچا اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا تذکرہ کیا۔ آبی یاروں کا یار تھا۔ وہ فوراً میری مدد پر آمادہ ہوگیا۔ آبی کے ہمراہ آسیہ کی تلاش کا سلسلہ کچھ اس قدر دراز ہوا اور اس میں کچھ ایسے پیچ وخم آئے کہ میں اور آبی یہ بھی بھول گئے کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ ایک بار ہم نے آسیہ کو جیل سے نکال لیا تو وہ پھر پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس کی تلاش میں بھٹک کر ایک بار میں امرتسر جیل کی سیر بھی کر آیا۔ ہمارے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ خدا کی زمین مجھ پر تنگ ہوتی گئی۔ مختلف مواقع پر لوگ میری مجبوریوں سے

ناآسودہ جذبوں کی تسکین اور آتشِ انتقام کو سرد کرنے
کی کوشش میں جرائم اُس کے پیروں کی ناقابلِ شکست
زنجیر بن گئے۔ ایک مردم گزیدہ زمانے کے ستم رسیدہ
وقت کے ٹھکرائے ہوئے نوجوان کی داستان
منفرد قلم کار جبار توقیر
کی دلوں پر نقش یادگار

گمراہ



Farrukh Malik



خونخوار پلیاپ

دوسری جنگِ عظیم نے ظلم و تشدد کی جن لاتعداد سنسنی خیز کہانیوں کو جنم دیا ہے وہ شاید ہمیشہ سُنائی جاتی رہیں گی۔ یہ بھی اسی دور کے ایک کیمپ کا قصہ ہے۔ مگر انوکھی بات یہ ہے کہ یہاں تشدد کی لرزہ خیز داستان مرد نہیں عورتیں رقم کر رہی تھیں۔ مصنف چونکہ امریکی ہے اس لیے یہ قیاس بھی کیا جاسکتا ہے کہ شاید یہ کہانی امریکی پروپیگنڈے کا ایک حصہ ہو تاکہ اس ہولناک ظلم کا جواز پیدا کیا جاسکے جو امریکا نے ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر ڈھایا۔

اقبال کاظمی

دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمن نازیوں کے جنگی کیمپوں میں، بے بس و مجبور قیدیوں پر جو مظالم ڈھائے گئے اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ یہ جرمن نازی ہی تھے جنہوں نے جنگی قیدیوں کو آگ کی بھٹی میں جلایا، انہیں زندہ دفن کیا اور ان پر اذیت و تشدد کے نت نئے حربے آزمائے گئے۔ ان نازی کیمپوں میں بربریت کے ایسے مظاہرے دیکھنے میں آئے کہ انسانیت تھرا اٹھی لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ جاپان میں بھی جنگی قیدیوں سے جو انسانیت سوز سلوک روا رکھا گیا اسے دیکھ کر ہلاکو اور چنگیز خان

Farrukh Malik

Farrukh Malik

جیسے دنیا کے سفاک ترین انسانوں کی روحیں بھی کانپ اٹھی ہوں گی. آج ہم آپ کو جاپانیوں کے ایک جنگی کیمپ کی لرزہ خیز کہانی سناتے ہیں جو محض افسانہ نہیں سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے.

جنرل ڈگلس میک آرتھر فلپائن واپس پہنچ چکا تھا. فروری ۱۹۴۵ء میں منیلا میں موجود امریکی فوجیں جنرل ڈگلس کی کمان میں آچکی تھیں لیکن امریکی فضائیہ کے بمبار طیارے اس سے پہلے ہی لایٹ کے علاقے میں نہایت عجلت میں تعمیر کیے جانے والے ہوائی اڈے سے استعمال کرنا شروع کر چکے تھے ان اڈوں سے پرواز کرنے والے. بی ۲۴ بمبار طیارے چینی سمندروں پر جنوب میں بورنیو ی سے سلیبس تک اور شمال میں فارموسا اور رکویو کے جزائر پر کامیاب بمباری کر رہے تھے. ان طیاروں کا مشن ایک ہی تھا کہ بحری اور بری راستوں سے جاپانیوں کی سپلائی لائن کاٹ دی جائے.

۱۵ جنوری کو بی ۲۴ بمبار طیاروں کا ایک اسکواڈرن ایک ایسے ہی مشن پر روانہ ہوا. پروگرام کے مطابق ان طیاروں کو فارموسا پر بمباری کر کے واپس آنا تھا. گرین گوز نامی طیارہ اس فارمیشن کے آخر میں تھا لیکن ہنان کی بندرگاہ پر بمباری کرتے ہوئے یہ طیارہ اپنی فارمیشن کھو بیٹھا اور بھٹکتا ہوا اس ساحل کے اتنے قریب پہنچ گیا جہاں دشمن کی توپیں اس کے استقبال کے لیے پہلے ہی تیار تھیں. اٹھارہ سو فٹ کی بلندی پر طیارے کا زمینی توپوں کی زد سے بچ نکلنا ممکن نہیں تھا. ایک گولہ طیارے کے دائیں بازو پر لگا اور طیارہ کسی زخمی پرندے کی طرح قلابازیاں کھاتا ہوا تیزی سے زمین کی طرف آنے لگا. طیارے کے پائلٹ لی. این مونرو نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے طیارے کو سنبھال لیا اور ساحل کے قریب ریت کی ایک پٹی پر کریش لینڈنگ کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ طیارے کے عملے کے افراد اپنے یا جہاز کے نقصان کا جائزہ لے سکتے، طیارے کو چاروں طرف سے لاتعداد جاپانی فوجیوں نے گھیر لیا.

اس بمبار طیارے کا عملہ دس افراد پر مشتمل تھا جنہیں گرفتاری کے فوراً ہی بعد ہنان بھیج دیا گیا. جہاں جاپانی بحریہ کے انٹیلی جنس آفیسر تین دن تک ان سے پوچھ گچھ کرتے رہے اور بالآخر انہیں بتلایا گیا کہ انہیں جزیرے کے اندرونی حصے میں واقع ایک جنگی کیمپ میں بھیجا جا رہا ہے جہاں وقتاً فوقتاً ان سے پوچھ گچھ کی جاتی رہے گی. اسی روز ایک جاپانی محافظ نے انہیں بتا دیا تھا کہ انہیں اکاساکی کے جنگی کیمپ نمبر تین میں بھیجا جانے والا ہے.

کیمپ نمبر تین کا نام سنتے ہی مونرو اور اس کے ساتھی لرز اٹھے. کوئی امریکی فوجی ایسا نہیں تھا جس نے اس کیمپ سے متعلق خوف ناک داستانیں نہ سُن رکھی ہوں. وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جنگلوں یا پہاڑوں کے وسط میں واقع اس جنگی کیمپ سے کوئی قیدی آج تک فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا. انہوں نے کسی ایسے قیدی کے بارے میں بھی نہیں سنا تھا جو اس کیمپ سے زندہ بچ نکلا ہو. وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ اس جنگی کیمپ میں جانے والے قیدیوں کے بارے میں بعد میں کبھی کچھ نہیں سنا گیا تھا.

اسی شام انہیں کیمپ نمبر تین کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا. دو تین گھنٹوں تک ٹرک نہایت تیز رفتاری سے سفر کرتا رہا. شدید سردی کے باعث قیدی ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے تاکہ ایک دوسرے کے جسموں سے حرارت حاصل کر سکیں لیکن سردی کی شدت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا. اس کے ساتھ ہی ٹرک کی رفتار بھی کم ہو گئی. پختہ سڑک ختم ہو چکی تھی اور اب ٹرک برفانی میدان میں ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا. چاندنی رات میں تاحدِ نگاہ برف کی چادر پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی.

جہاز کا مشین گنر سارجنٹ رچرڈ ماس ٹرک کی دیوار سے ٹیک لگائے سکڑا بیٹھا تھا. سردی کی شدت سے اس پر کپکپی سی طاری تھی. اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے اس جاپانی کی طرف دیکھا جو مترجم کی حیثیت سے ان کے ساتھ جا رہا تھا.

”کیا یہاں ہمیشہ ایسی ہی سردی ہوتی ہے؟“

”یہ ماؤنٹ مورس ہے. ہم اس وقت سطح سمندر سے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کر رہے ہیں. جب کہ اکاساکی صرف چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے. یہ علاقہ جہاں سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں، سردیوں میں برف سے ڈھکا رہتا ہے لیکن موسم بہار میں بارشوں کے ساتھ ہی یہاں کی برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے.“ مترجم نے بتایا.

تقریباً دو گھنٹے مزید ہچکولے کھانے کے بعد وہ کھٹارا ٹرک ایک زبردست ہچکی لے کر رک گیا. رچرڈ نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا. جگہ جگہ نصب آرک لائٹس کی تیز روشنیوں میں اکاساکی جنگی کیمپ نمبر تین کے خاردار تاروں کے جنگلے کا گیٹ نظر آ رہا تھا. ٹرک کے رکتے ہی ایک ہیولا کیبن سے نکل کر ان کی طرف بڑھا.

وہ سر سے پیر تک گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا.

جہاز کا ریڈیو آپریٹر پیٹر مائر پہلا شخص تھا جس کی آنکھیں تیز روشنی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہو سکی تھیں. دوسرے ہی لمحے وہ اپنے ساتھیوں کی طرف گھوم گیا.

”عورت!“ اس کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی. ”دیکھو، وہ محافظ ایک عورت ہے. حیرت انگیز! یہ کیمپ عورتوں کی نگرانی میں ہے!“

مونرو اور رچرڈ وغیرہ بھی اب ٹرک کی کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے تھے. امپیریل آرمی کی یونیفارم میں ملبوس تقریباً ایک درجن عورتیں

گیٹ کے قریب رائفلیں سنبھالے مستعد کھڑی تھیں۔

"اوہو!" جہاز کے انجینئر چک کرد کرنے سیٹی بجائی۔ "معلوم ہوتا ہے یہاں جنگی کیمپ کے بجائے بھول کر کسی نائٹ کلب میں بھیج دیا گیا ہے۔"

ان کے ساتھ آنے والے مسلح جاپانی مترجم نے انہیں ٹرک سے اترنے کا حکم دیا۔ وہ جیسے ہی نیچے اترے دو محافظ لڑکیوں نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں رائفلوں کی زد میں لے لیا اور وہ خاردار تاروں کے گیٹ سے گزرتے ہوئے کمپاؤنڈ کے وسط میں پہنچ گئے۔ اسی لمحے چند اور محافظ لڑکیوں نے انہیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ تیز روشنی میں ان کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ جب کوئی لڑکی اپنی جگہ سے حرکت کرتی تو اس کی رائفل کے آگے لگی ہوئی سنگین روشنی میں بجلی کی طرح چمک اٹھتی۔ مونزوا انہیں دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ جاپانیوں نے عورتوں کو بھی فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا تھا، ضروری تربیت کے بعد صرف انتظامی امور ان عورتوں کے سپرد کیے گئے تھے جہاں ان کے لیے زیادہ خطرہ نہیں تھا لیکن جنگی قیدیوں کے کسی کیمپ کی نگرانی عورتوں کے سپرد کر دینا مونزوا کے نزدیک حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کیمپ کے بارے میں دل کو ہلا دینے والے قصے اسے فرضی اور من گھڑت معلوم ہونے لگے۔

مونزوا ابھی یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ ایک عورت دائرے میں کھڑی محافظ لڑکیوں کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے آگئی۔ اسے دیکھ کر ہر قیدی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس کیمپ میں کسی ایسی حسین عورت کی موجودگی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وہ قیدیوں کے سامنے تن کر کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ ریشمی بال ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ اس کے جسم پر امپیریل آرمی میجر کی وردی تھی جو کمر پر خاصی چست تھی۔ پیروں میں برفانی جوتے تھے جو پنڈلیوں تک آ رہے تھے۔ پتلون کے پائنچے نہایت سلیقے سے جوتوں کے اندر اڑسے ہوئے تھے۔

قیدیوں کے سامنے آنے والے جاپانی مترجم نے اپنی زبان میں اسی عورت سے کوئی بات کی پھر قیدیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"یہ اوکاٹسو سان ہیں تم لوگ اس کیمپ میں اپنے قیام کے دوران انہیں اسی نام سے مخاطب کرو گے۔ اس کیمپ میں تمہارا قیام کتنا طویل ہوگا؟ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری زبان میں سان میڈم کو کہتے ہیں ـــ تم لوگ اگر چاہو تو اپنی آسانی کے لیے انہیں سان کے بجائے میڈم بھی کہہ سکتے ہو۔ اوکاٹسو سان میجر رینک کی مالک اور اس کیمپ کی انچارج ہیں۔ اوکاٹسو کے بعد اس کیمپ کی نگرانی کی ذمہ داری یاکو سان اور ہارو سان پر عائد ہوتی ہے۔ تمہیں ان کے احکامات کی بلا چون و چرا تعمیل کرنا ہوگی۔ اس کیمپ کے محافظوں میں کوئی مرد شامل نہیں ہے۔ سارا انتظام ان لڑکیوں کے سپرد ہے لیکن تم انہیں مردوں سے کم نہیں پاؤ گے۔"

مترجم چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر کیمپ کی محافظ لڑکیوں کے بارے میں بتانے لگا۔ اکاساکی کے اس بدنام زمانہ جنگی کیمپ کی محافظ لڑکیوں کی تعداد صرف تیس تھی جن کی انچارج میڈم اوکاٹسو تھی جو کیمپ سے متعلق معاملات میں ہر لحاظ سے خود مختار تھی۔ البتہ بعض معاملات میں وہ صرف اور صرف فارموسا ہائی کمان کو جواب دہ تھی۔ مترجم کے بیان کے مطابق بہت عرصہ پہلے یہ کیمپ مرد فوجیوں کی نگرانی میں تھا لیکن جنرل میک آرتھر کے فلپائن واپس آنے کے بعد مرد فوجیوں کو ساحل کی حفاظت کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ مترجم نے اس یقین کا اظہار بھی کیا تھا کہ جنرل میک آرتھر کو اس علاقے میں زیادہ کامیابی نہیں حاصل ہوگی۔

"ایک بات اور!" مترجم نے قیدیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان میں پانچ لڑکیاں شادی شدہ ہیں اور ان کے شوہر بحریہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح ان لڑکیوں کو شہنشاہ کی خاص توجہ بھی حاصل ہے۔ ایک بات اور اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ یہ لڑکیاں تمہارے لیے مردوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ انہیں تم سے شدید نفرت ہے اور کسی سے نفرت کرنے کی اس سے بڑی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے شوہر، بھائی، باپ اور رشتہ دار تم لوگوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں یا مارے جا رہے ہیں۔ میں آخری مرتبہ تم لوگوں کو تنبیہ کر دینا چاہتا ہوں کہ یہاں سے تمہارے فرار کی کوئی کوشش کامیاب ثابت نہیں ہو سکتی۔ یہ بات بھی نوٹ کر لو کہ جب تک تم لوگ یہاں ہو یہ سب تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیں گی۔"

مترجم نے تقریر ختم کر کے میڈم اوکاٹسو کی طرف دیکھا۔ اوکاٹسو نے پسندیدگی کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور ایک ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ مترجم اسے سلامی دے کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میڈم اوکاٹسو اس وقت تک اس کی طرف دیکھتی رہی جب تک وہ گیٹ کے قریب کھڑے ہوئے ٹرک پر سوار نہ ہو گیا پھر وہ قیدیوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی بے رحمانہ مسکراہٹ تھی۔

"ارشیا اینو......" اس کے خوبصورت ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔

مترجم کی وارننگ کے باوجود جہاز کا کو پائلٹ لیفٹیننٹ لونان اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "بے بی! میں تمہاری زبان نہیں سمجھتا لیکن اگر تمہیں کسی محبوب کی تلاش ہے تو وہ میرے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

لیکن جب میڈم اوکانسو نے انگلش میں جواب دیا تو نونان اور اس کے ساتھی سناٹے میں رہ گئے۔ خصوصاً نونان کا تو چہرہ دھول ہو گیا تھا۔

"لیکن میں تمہاری زبان بول اور سمجھ سکتی ہوں۔" میڈم اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں نے جو الفاظ کہے تھے اس کا مطلب ہے خوش آمدید کتو۔۔۔!"

جملہ ختم کرتے ہی میڈم اوکانسو نے ایک ہاتھ اٹھا کر مخصوص اشارہ کیا۔ لیفٹیننٹ نونان کے پیچھے کھڑی ہوئی دو محافظ لڑکیوں نے نونان کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اسے اس کے ساتھیوں سے الگ کر لیا۔ اس سے پہلے کہ نونان کچھ سمجھ سکتا، دونوں لڑکیوں نے رائفلوں کے بٹ پوری قوت سے اس کی پنڈلیوں پر مارے۔ نونان چیختا ہوا زمین پر گرا۔ پنڈلیوں پر لگنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ کوشش کے باوجود اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ محافظ لڑکیوں نے رائفلوں کے بٹ مار مار کر اسے چت لٹا دیا اور اس کے بازوؤں پر کھڑی ہو گئیں۔ نونان برف پر پشت کے بل لیٹا بری طرح چیخ رہا تھا۔ اسی دوران ایک اور لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور تقریباً ڈیڑھ انچ موٹی لکڑی کا ایک ٹکڑا اس کے دانتوں میں پھنسا دیا۔ نونان اب بھی چیخ رہا تھا لیکن اس کی آواز اب عجیب سی نوعیت اختیار کر چکی تھی۔ دانتوں میں لکڑی ہونے کی وجہ سے اس کا منہ ڈیڑھ انچ کے قریب کھلا ہوا تھا۔

اور پھر وہ سب کچھ اس قدر سرعت سے ہوا تھا کہ مونرو اور اس کے ساتھی کوئی اندازہ نہ لگا سکے۔ میڈم اوکانسو نے ہپ پاکٹ سے چاقو نکال لیا اور۔۔۔ تلے تلے قدم اٹھاتی ہوئی نونان کے قریب پہنچ گئی۔ چند لمحے وہ نونان کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر ایک پیر اٹھا کر نونان کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے میڈم اوکانسو کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو آہستہ آہستہ اس پر جھک رہی تھی۔ پھر دفعتاً وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور چاقو کا پھل اس کے کھلے منہ میں داخل کر دیا۔ نونان بری طرح مچلنے لگا مگر میڈم اوکانسو نے اس کے سینے پر اپنا پورا بوجھ ڈال رکھا تھا اور اس کا چاقو والا ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ چاقو کی تیز نوک نے نونان کی زبان کو جڑ سے کاٹ دیا تھا۔ نونان کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز کے ساتھ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔

میڈم اوکانسو اچھل کر اس کے اوپر سے ہٹ گئی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے تقریباً پانچ انچ لمبے گوشت کے لوتھڑے کو، جو نونان کی زبان تھی، ہوا میں لہراتی ہوئی چیخی۔ "یا تزآئی!"

یہ خوشی کا نعرہ تھا۔ اس نے نونان کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے بہنے والا خون چہرے، گردن اور زمین پر جمی ہوئی برف کو سرخ کیے دے رہا تھا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دانتوں میں لکڑی پھنسی ہوئی ہونے کی وجہ سے وہ نہ تو خون کو نگل سکتا تھا اور نہ ہی تھوک سکتا تھا۔ لیفٹیننٹ نونان کے ساتھی خاموش کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے کھڑی ہوئی محافظ لڑکیوں کی رائفلوں کی سنگینیں ان کی گردنوں کو چھو رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام بھی نونان سے مختلف نہیں ہو گا۔

رچرڈ کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ اس نے سختی سے دانت پر دانت جما رکھے تھے۔ سفاکی کا یہ مظاہرہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ خون میں لت پت نونان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

"میں اس کتیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسے۔۔۔۔ اسے ایسی اذیت ناک موت ماروں گا کہ جاپانیوں کی آنے والی کئی نسلیں یاد رکھیں گی۔"

رچرڈ کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے اس کے ساتھیوں نے اس کی یہ بڑبڑاہٹ سن لی اور اسی لمحہ انہوں نے رچرڈ کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ اس کے جبڑوں کے ابھرے ہوئے مسل اور لہجے کی کرختگی کا احساس کر کے اس کے افسروں، مونرو، اسٹورٹ اور لائیڈ وغیرہ نے بھی تسلیم کر لیا کہ رچرڈ اس گروپ کا واحد آدمی ہو گا جو کبھی انہیں اس عذاب سے نجات دلا سکے گا۔

میڈم اوکانسو نے، جو رچرڈ کی بڑبڑاہٹ نہیں سن سکی تھی، اپنا خون آلود ہاتھ اور چاقو کا پھل نونان کے کپڑوں سے صاف کیا۔ نونان کی زبان ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ قیدیوں کی طرف دیکھتے ہوئے خونخوار بلی کی طرح غرائی۔

"میں اس کیمپ میں آنے والے قیدیوں کو ہمیشہ اسی قسم کی وارننگ دیتی ہوں تاکہ اس طرح کوئی بے ہودہ خیال ان کے ذہن میں جگہ نہیں پا سکتا۔"

اس نے خاموش ہو کر ایک طرف اشارہ کیا۔ یہ گویا استقبالیہ تقریب ختم ہونے کا سگنل تھا۔ محافظ لڑکیاں قیدیوں کو دھکیلتے ہوئے روشنی کے دائرے سے نکال لے گئیں۔

ان کی بیرک گھاس پھونس کا ایک سائبان ثابت ہوئی۔ لکڑی کے چار ستون کھڑے کر کے ان پر چھت قائم کر دی گئی تھی۔ چاروں طرف سے کھلا ہونے کے باعث یخ ہوا سے بچاؤ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نیچے کچی زمین تھی اور انہیں اوڑھنے یا بچھانے کے لیے کمبل وغیرہ بھی فراہم نہیں کیے گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد آرک لائیٹس بجھا دی گئیں۔ چند منٹ کے وقفے ہی سے ان کی آنکھیں تاریکی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہو سکی تھیں۔ ان کے اردگرد اسی قسم کے پندرہ اور سائبان

تھے جن میں موجود قیدی اپنے آپ کو سردی سے بچانے کے لیے ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیفٹیننٹ لوزان ختم ہو چکا تھا۔ اس کی لاش برف میں پڑی تھی۔ اب وہ صرف نو رہ گئے تھے۔ ٹرک سے اتر کر ان لڑکیوں کو دیکھ کر ان میں سے جن لوگوں نے سوچا تھا کہ وہ کسی جنگی کیمپ کے بجائے نائٹ کلب میں آ گئے ہیں جہاں خوبصورت لڑکیاں ان کی دل جوئی کو موجود ہیں۔ انہیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اب وہ سب یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ اس کیمپ کے بارے میں انہوں نے جو داستانیں سن رکھی تھیں ان میں ذرا بھی مبالغہ آرائی نہیں تھی۔ ان کے خیال میں یہ موت کا کیمپ تھا جہاں قدم رکھتے ہی موت ہی نے ان کا استقبال کیا تھا اور ان کے ایک ساتھی کو چاٹ لیا تھا موت . . . جو خوبصورت لڑکیوں کی صورت میں ان کے گرد منڈلا رہی تھی۔

صبح سب سے پہلے رچرڈ ہی کی آنکھ کھلی تھی۔ ایک نظر چاروں طرف دیکھتے ہی یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ یہ کیمپ "موت کے کیمپ" کے نام سے کیوں مشہور تھا۔ ایک لمحہ کو تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سترھویں صدی کے کسی عقوبت خانے میں پہنچ گیا ہو۔ ہر سائبان میں پچیس تیس قیدی تھے اور ان کی حالت دیکھ کر بمشکل ہی یہ فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ بھی انسانوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ پھٹے پرانے، غلاظت آلود کپڑوں میں لپٹے ہوئے وہ لوگ ڈھانچوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ وہ لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر متحرک ہو گئے تھے۔ ان کے جسموں اور پھٹے پرانے کپڑوں سے اٹھنے والی بدبو سے رچرڈ کو ابکائی سی آ گئی۔

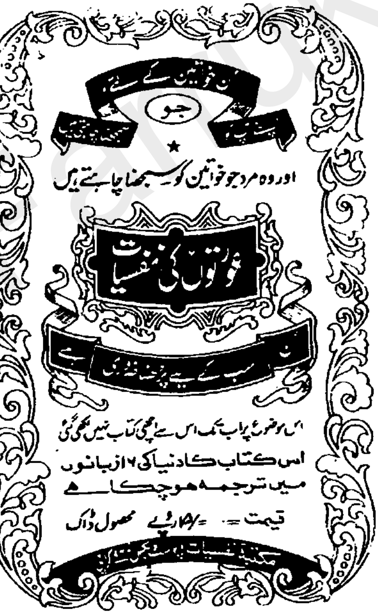
ایک سائبان کی طرف دیکھتے ہی رچرڈ چونک گیا۔ اس سائبان کے ڈھانچہ نما قیدی اپنے دو ساتھیوں کو برف پر گھسیٹتے ہوئے کیمپ کے وسط میں لے جا رہے تھے۔ وہ لاشیں تھیں، ان قیدیوں کے وہ ساتھی تھے جو گزشتہ رات زندگی کی اذیت سے نجات پا گئے تھے۔

رچرڈ یہ خوفناک منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ کسی طرف سے کانگ کی آواز سنائی دینے لگی۔ تمام قیدی اپنی اپنی بیرکوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ رچرڈ نے اپنے ساتھیوں کو جگا دیا اور وہ بھی دوسرے قیدیوں کی تقلید کرتے ہوئے اپنے سائبان کے سامنے لائن لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اسی لمحہ محافظوں کے ہٹ کی طرف سے دو محافظ لڑکیاں ٹرالی دھکیلتی ہوئی اس طرف بڑھتی نظر آئیں۔ رچرڈ اور اس کے ساتھی دو نمبر بیرک میں تھے۔ لڑکیاں پہلی بیرک کے سامنے رک گئیں۔ ایک لڑکی رائفل سنبھالے کھڑی رہی جب کہ دوسری لڑکی ٹرالی پر رکھے ہوئے پتیلے میں سے کوئی چیز ڈونگے سے نکال نکال کر اس بیرک کے قیدیوں کے سامنے برف پر ڈھیر کرنے لگی۔ وہ آٹھ قیدی تھے۔ کھانے کے لیے کوئی برتن وغیرہ نہیں تھا۔ ان کا کھانا ان کے پیروں کے قریب برف پر ڈال دیا گیا اور پھر جیسے ہی ٹرالی آگے بڑھی وہ آٹھوں قیدی بھوکے کتوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے کتوں ہی کی طرح کھا رہے تھے۔

ٹرالی مونزو وغیرہ کے سائبان کے سامنے رک گئی۔ وہ سب لائن میں کھڑے تھے۔ کھانا تقسیم کرنے والی محافظ لڑکی نے ایک ایک مگا ان کے پیروں کے نزدیک برف پر الٹ دیا۔ جہاز کے نیوی گیٹر پورٹر نے گھٹنوں کے بل جھک کر برف میں پڑا ہوا تھوڑا سا کھانا اٹھا کر چکھا اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہاں سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اس طرح ناک اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا جیسے شدید تعفن محسوس کر رہا ہو۔ مونزو اور رچرڈ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر وہ بھی جھک کر کھانے کو سونگھنے لگے۔ بڑی شدید قسم کی بدبو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی وہ ابکائیاں لیتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے۔

"کیوں کھانا پسند نہیں آیا؟ کل تک انتظار کرو۔ کل میل ڈے ہے تم پر کچھ اور انکشافات ہوں گے۔"

یہ آواز ساتھ والے سائبان سے ابھری تھی۔ پرانے قیدیوں میں سے کسی نے پہلی مرتبہ انہیں مخاطب کیا تھا۔ وہ ایک انفنٹری آفیسر تھا جسے چند ماہ قبل فارموسا سے گرفتار کر کے اس کیمپ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اس کے سامنے کے تین چار دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور شیو بے تحاشا بڑھا ہوا تھا۔



دوسرے دن سوموار تھا۔ اس روز کیمپ میں ڈاک آیا کرتی تھی اور قیدیوں کے لیے یہ دن ہفتے کا بدترین دن ہوتا تھا۔ کیمپ کی محافظ لڑکیاں اپنے نام آنے والے خطوط پڑھنے کے بعد ردِعمل کے اظہار میں زیادہ دیر نہیں لگاتی تھیں۔ یہ خطوط مختلف شہروں میں مقیم ان کے رشتہ داروں کی طرف سے آتے یا شوہروں کی طرف سے جو کسی نہ کسی محاذ پر دشمن کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ ان خطوط میں ہمیشہ کسی نہ کسی کی موت کی اطلاع ضرور ہوتی۔

"اور جب انہیں اپنے کسی رشتہ دار کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے۔ تو یہ واقعی خونخوار بلیاں بن جاتی ہیں۔" انفنٹری آفیسر نے بتایا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی موزرو اور اس کے ساتھیوں نے محافظ لڑکیوں کے رویے میں تبدیلی محسوس کرلی۔ ان کے سامنے برف پر انہیں دیا جانے والا کھانا بکھرا ہوا تھا۔ وہ غالباً چاول تھے جو کسی اور چیز میں ملا کر پکائے گئے تھے مگر ان چاولوں سے اس قدر بدبو اٹھ رہی تھی کہ اگر وہ کوئی لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈال بھی لیتے تو اسے نگلنا ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ اس کے برعکس پرانے قیدیوں نے زمین پر سے چاول کا ایک ایک دانہ صاف کر دیا تھا۔

موزرو کیمپ کے دوسرے سرے پر لکڑی کے ان ہٹس کی طرف دیکھ رہا تھا جو کیمپ کی انچارج میڈم اوکاٹسو اور دیگر محافظ لڑکیوں کے لیے مخصوص تھے۔ باہر سے دیکھنے پر بظاہر وہ ہٹ بھی اچھی حالت میں نظر نہیں آرہے تھے مگر موزرو کو یقین تھا کہ وہاں زندگی کی ہر آسائش موجود ہوگی۔

دوپہر کے لگ بھگ میڈم اوکاٹسو اپنے ہٹ سے باہر نکلی۔ یہ ہٹ اس کے دفتر کے علاوہ رہائش گاہ کا کام بھی دے رہا تھا۔ وہ چند لمحے دروازے کے سامنے کھڑی متجسس نگاہوں سے اطراف میں دیکھتی رہی پھر بڑے نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی کمپاؤنڈ کے وسط میں آکر رک گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چمڑے کا کوڑا اور دوسرے میں میگافون تھا۔ اس نے قیدیوں کی 'بیرکوں' کی طرف رخ کر کے میگافون منہ سے لگایا اور چیختے ہوئے بولی۔

"امریکی کتو! میری بات غور سے سنو! آج کی ڈاک سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ہمارے بے شمار جوان امریکی بھیڑیوں کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں لیکن میں تم لوگوں کو یقین دلا دینا چاہتی ہوں کہ ان جاپانیوں کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی اور ہم ان کے ایک ایک قطرۂ خون کا بدلہ لیں گے۔"

اس کی تقریر ختم ہوتے ہی محافظ لڑکیاں ہاتھ والی دو گاڑیاں کھینچتی ہوئی کمپاؤنڈ کے وسط میں لے آئیں۔ یہ ہاتھ گاڑیاں گدھا گاڑیوں سے مختلف نہیں تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انہیں گدھوں کے بجائے محافظ لڑکیاں کھینچ رہی تھیں۔ کمپاؤنڈ کے وسط میں پہنچ کر محافظ لڑکیوں نے گاڑیاں چھوڑ دیں۔ ایک گاڑی پر میڈم اوکاٹسو اور دوسری پر میڈم یوکا سوار ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی چمڑے کا کوڑا نظر آرہا تھا۔ محافظ لڑکیوں نے دو قیدیوں کو ایک سائبان سے گھسیٹ کر نکال لیا اور انہیں گاڑیاں کھینچنے کا حکم دیا۔ وہ دونوں ڈھانچوں سے مختلف نہیں تھے۔ ان کے لیے اپنے جسموں کے بوجھ کو گھسیٹنا مشکل ہو رہا تھا لیکن وہ گاڑیاں کھینچنے پر مجبور تھے۔ وہ چیونٹی کی رفتار سے گاڑیاں کھینچ رہے تھے دفعتاً فضا میں زناٹے کی آواز ابھری، میڈم اوکاٹسو کے کوڑے نے اپنی گاڑی کو کھینچنے والے قیدی کی پشت سے کھال اُدھیڑ دی تھی۔ یہ گویا میڈم یوکا کے لیے سگنل تھا۔ اس نے بھی اپنی گاڑی میں جتے ہوئے قیدی پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ چابک پڑتے ہی قیدیوں کی رفتار بڑھ گئی۔ دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو برف پر دوڑنے لگیں۔

میڈم اوکاٹسو اور یوکا پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر اپنی گاڑیوں سے جتے ہوئے قیدیوں پہ کوڑے برسا رہی تھیں۔ وہ اس طرح چیخ رہی تھیں.. جیسے اس ریس سے پوری طرح محظوظ ہو رہی ہوں۔

دفعتاً میڈم اوکاٹسو کی گاڑی والے قیدی کا پیر برف پہ پھسل گیا۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اپنے آپ کو گرنے سے بچا سکتا۔ وہ اوندھا پڑا تھا کہ دوسری گاڑی کا پہیہ اس کے اوپر سے گزر گیا۔ قیدی کے گرنے سے گاڑی الٹتے الٹتے بچی تھی۔ اس صورتِ حال نے میڈم اوکاٹسو پر جنون سا طاری کر دیا، وہ گاڑی سے نیچے کود آئی۔ اس نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کوڑے کے دستے سے قیدی کی پسلیوں پر ضرب لگائی مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ میڈم نے اس کے جسم پہ ٹھوکروں کی بارش کر دی مگر بے سود۔ قیدی کے جسم میں حرکت تک نہیں ہوئی۔ بالآخر میڈم اوکاٹسو چیختی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ اس طرح یہ کھیل ملتوی ہوگیا۔

اگلے سوموار کو اگرچہ کیمپ کے قیدیوں کو یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ آج کی ڈاک سے کیمپ کی محافظ عورتوں کو یہ اطلاع مل گئی تھی کہ منیلا میں جاپانی فوجوں نے جنرل میک آرتھر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور ایک اور محاذ پر میڈم اوکاٹسو کا باپ جس رجمنٹ کی کمان کر رہا تھا امریکی فوج نے اس کا مکمل صفایا کر دیا تھا لیکن میڈم اوکاٹسو اور دیگر محافظ عورتوں کے چہروں سے وہ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتے تھے۔

اس مرتبہ اپنے وحشیانہ کھیل کے لیے میڈم اوکاٹسو نے موزرو اور اس کے ساتھیوں کا انتخاب کیا۔ اوکاٹسو اور یوکا نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی ان کے سائبان کے سامنے رک گئیں اور انہیں باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ سب اپنے سائبان کے سامنے لائن میں کھڑے ہوگئے اور میڈم اوکاٹسو اس طرح ان کا جائزہ لینے لگی جیسے قصائی بکروں کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ کون سا بکرا اس کے لیے زیادہ

منافع بخش ثابت ہو سکتا ہے۔ بالآخر میڈم نے رچرڈ اور سیکنڈ ریڈیو آفیسر برٹرام کو لائن سے الگ کر لیا۔

”تم دونوں قد و قامت میں ایک جیسے لگتے ہو۔ اپنی اپنی قمیص اتار دو۔“ میڈم نے حکم دیا۔ انہوں نے قمیصیں اتار دیں ـــــ وہ خاصے تندرست اور تنومند تھے۔ میڈم کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”مجھے تم جیسے ہی تنومند اور مضبوط آدمیوں کی ضرورت تھی۔ پرانے قیدیوں میں اب اپنے آپ کو سنبھالنے کی بھی سکت نہیں رہی لیکن میں کہہ سکتی ہوں کہ آج کے مقابلے میں مزہ آجائے گا۔“

محافظ عورتیں انھیں رائفلوں کے بٹ مارتے ہوئے کمپاؤنڈ کے وسط میں لے آئیں اور ایک بار پھر درندگی اور بربریت کا ایک نیا مظاہرہ ہونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں اسی قابل بھی نہ رہے کہ اپنے قدموں سے چل سکتے۔ میڈم اداکاشو اور یوکا کے لیے اب ان میں دلچسپی کی کوئی بات نہ رہی تھی۔ وہ دونوں اس کھیل کے اختتام کا اعلان کر کے رخصت ہو گئیں۔

رچرڈ کے چہرے، سر اور جسم کے ہر حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے برٹرام کی طرف دیکھا جو اس سے بھی زیادہ بدتر حالت میں تھا۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ممکن ہے موسم کی یخ بستگی ان کے زخموں کو انفیکشن سے بچالے لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں توانائی کی بھی ضرورت تھی جس کا حصول بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

رچرڈ سوچ رہا تھا کہ اگر مناسب خوراک کا انتظام نہ ہوا تو زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے اندر اندر وہ بھی پرانے قیدیوں کی طرح ڈھانچوں میں تبدیل ہو کر رہ جائیں گے اور اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ انہیں خوراک حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

لیکن سوال تو یہ تھا کہ خوراک کہاں سے آتی؟ امریکیوں سے نفرت کے باعث کیمپ کی محافظ عورتیں انتقامی جنون میں مبتلا تھیں۔ رچرڈ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر انہیں زندہ رہنے کے لیے مناسب خوراک حاصل کرنا ہے تو اسے انہی عورتوں میں سے کسی ایک کو قابو میں کرنا پڑے گا۔

دو دن گزر گئے اور پھر بالآخر محض اتفاق سے اسے وہ موقع مل گیا جس کا وہ منتظر تھا۔ اس روز حسب معمول ان کے سامنے کتوں کی طرح کھانا ڈالا جا رہا تھا۔ رچرڈ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا محافظ لڑکی کو پتیلے میں سے چاول نکال نکال کر ان کے سامنے زمین پر ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا جب اس کی باری آئی تو برف پر لڑکی کا پیر پھسل گیا اور چاولوں سے بھرا ہوا مگا رچرڈ کے پیر پر پلٹ گیا۔

”گومن ناسائی!“ لڑکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

لڑکی کے چہرے پر ندامت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ معذرت کے ان سیدھے سادے الفاظ نے رچرڈ کے دماغ میں ایک چھماکا سا پیدا کر دیا اور وہ، یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر کیمپ کی خونخوار محافظ لڑکیوں میں سے کسی کی ہمدردی حاصل کی جاسکتی تھی تو وہ یہی ہو سکتی تھی۔

کیمپ کے پرانے قیدیوں سے رچرڈ کو اس محافظ لڑکی کا نام بھی معلوم ہو گیا، وہ ناما تھی۔ اس کا تعلق ہنان کے ایک ایسے کلب سے تھا جہاں جاپانی فوجی افسر تفریح کی غرض سے جاتے تھے۔

رچرڈ تین دن تک گہری نظروں سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ اس سے تنہائی میں بات کرنے کے لیے کسی مناسب موقعے کی تلاش میں تھا۔ بالآخر اسے یہ موقع مل ہی گیا۔ اس روز ناما محافظوں والے ہٹس کے قریب ایک شیڈ میں اسٹاک کا جائزہ لے رہی تھی کہ رچرڈ بھی نہایت خاموشی سے رینگتا ہوا شیڈ میں داخل ہو گیا۔

”ناما!“ رچرڈ نے دھیرے سے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ درد تھا۔ اس ایک لفظ سے وہ ناما کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ جس طرح اس کیمپ کے قیدی سوشل سسٹم کے مظالم کا شکار تھے اس طرح ناما بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھی۔

ناما اپنا نام سن کر چونک سی گئی۔ اس نے تیزی سے گھوم کر پیچھے دیکھا، رچرڈ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر رچرڈ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور محتاط قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

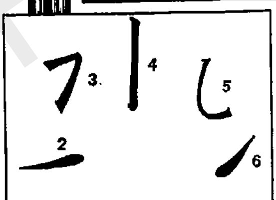
علامتوں کی شناخت کر کے اپنی زندگی سنوارنے کے رہنما اصول مرتب کریں

باخبری

قیمت ۸ روپے

ڈاک خرچ ۵ روپے

لاشعور میں دبے ہوئے خوف احساسات اور محرکات کو بے نقاب کرنیوالی عجیب و غریب کتاب۔



علامتوں کا انتخاب نہ صرف آپ کو صورت حال سے آگاہ کرے گا بلکہ یہ بھی بتائے گا کہ ان حالات میں معقول ترین راہ عمل کیا ہو سکتی ہے۔

ہر اچھے بک سٹال سے طلب کریں یا ہم سے منگوائیں

مکتبۂ نفسیات پوسٹ بکس ۹۸۸ کراچی ۱

سب کچھ رچرڈ کی توقع سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا تھا۔ ناما، رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کو چوری چھپے اضافی راشن فراہم کرنے لگی کبھی وہ انھیں چاول پہنچا دیتی اور کبھی ڈبل روٹی وغیرہ۔

مارچ کا مہینہ ختم ہوتے ہی برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ اس سائبان کے علاوہ قیدیوں کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ بارش کی تیز بوچھار میں وہ دن رات پانی میں بھیگتے اور سردی میں ٹھٹھرتے رہتے۔

اپریل کے وسط میں میڈم یوکا کو اطلاع ملی کہ اس کا شوہر اوکی ناوا کے محاذ پر امریکیوں کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔ وہ ایک بنکر میں مشین گن سے فائر کر رہا تھا کہ دشمن کی توپ کا چلایا ہوا ایک گولا بنکر کے اندر آ کر گرا اور مشین گن کے ساتھ اس کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ یوکا نے میڈم او کا ٹسو سے تشکارا کی اجازت مانگی جو بلا جھجک مل گئی اس مقصد کے لیے یوکا نے لیفٹیننٹ مونزو کا انتخاب کیا تھا۔

قیدیوں کو کچھ علم نہیں تھا کہ ان پر کیا قیامت ٹوٹنے والی تھی۔ وہ تو صرف ایک رات پہلے ناما نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور اشاروں کی زبان میں رچرڈ کو بتا دیا تھا کہ اپنے شوہر کی موت کا انتقام لینے کے لیے یوکا کیا منصوبہ بنا رہی ہے۔

دوسرے دن صبح دو محافظ لڑکیاں مونزو کو گھسیٹتی ہوئی میدان کے وسط میں لے گئیں اور مونزو کو کچھ سوچنے کا موقع دیے بغیر خونخوار بلیوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں۔ مونزو کی قمیص تار تار ہو گئی لڑکیوں کے نوکیلے ناخنوں سے اس کے چہرے اور جسم پر گہری خراشیں آ گئی تھیں جن سے خون رسنے لگا۔ ایک لڑکی نے اس کے گلے میں جھولتی ہوئی قمیص کھینچ کر دور پھینک دی پھر وہ دونوں رائفلیں تان کر دور کھڑی ہو گئیں۔ اب یوکا کی باری تھی وہ قہر برساتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے اشارے پر دو محافظ لڑکیوں نے مونزو کے بازو پشت پر جکڑ لیے۔ یوکا کے پاس اس وقت کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے مونزو کی طرف جھکتے ہوئے اچانک ہی انگلیاں اس کی ایک آنکھ میں گاڑ دیں، مونزو بلبلا اٹھا۔ یوکا نے ہاتھ کو زور دار جھٹکا دیا، مونزو کی آنکھ نکل کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ چند سیکنڈ بعد وہ مونزو کی دوسری آنکھ بھی نکال چکی تھی۔

مونزو اس گروپ کا طاقتور ترین آدمی تھا پہلی آنکھ نکلتے وقت اس کے منہ سے بس ایک چیخ نکلی تھی۔ اس کے بعد پھر اس نے اُف تک نہیں کی جب کہ یوکا اس سے کسی خاص ردِعمل کی متوقع تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ مونزو اس طرح خاموشی سے یہ اذیت برداشت کر جائے گا۔ اس کی قوتِ برداشت نے یوکا کے تن بدن میں آگ سی لگا دی اس نے ایک محافظ لڑکی سے رائفل چھینی اور چیختے ہوئے رائفل کی سنگین سے مونزو کے بازوؤں اور ٹانگوں پر وار کرنے لگی۔ اس نے سنگین اتار کر رائفل پھینک دی اور قصائی کی طرح مونزو کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر پھینکنے لگی۔ مونزو کے جسم سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کے منہ سے اب تک کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ اس کا ایک بالائی دانت نچلے ہونٹ میں پیوست تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ یوکا اب بھی بربریت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مونزو نیچے گر گیا۔ یوکا کا جنون اس وقت کم ہوا جب اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک لاش پر سنگین چلا رہی ہے۔

اس واقعے کے ایک ماہ بعد سارجنٹ میٹ ٹیلر نے کیمپ کے خاردار تاروں کو پھاند کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر اسے بھی اس طرح اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا کہ کیمپ کے قیدی لرز اٹھے۔ اس کے چند روز بعد جہاز کے گنر پورٹر نے میڈم او کا ٹسو پر حملہ کر دیا۔ اس کا شاید دماغ چل گیا تھا۔ دو محافظ لڑکیوں نے اسے سنگینوں کے کچوکے دے دے کر میڈم او کا ٹسو سے الگ کیا اور میڈم او کا ٹسو نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر پورٹر کے سر میں گولی اتار دی۔

جون کے شروع میں جب کیمپ میں اوکی ناوا کے سقوط کی بازگشت سنائی دی تو رچرڈ کے دل میں بھی امید کی کرن جگمگا اٹھی۔ اسے یقین تھا کہ اوکی ناوا کے بعد اب فارموسا کی باری آئے گی اس میں چند مہینے بھی لگ سکتے تھے اور اس دوران انھیں صبر و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کچھ برداشت کرنا تھا۔

پھر وہ ہوا جس کا رچرڈ کو خطرہ تھا۔ کیمپ کے کچن سے راشن کی چوری کا راز پوشیدہ نہ رہ سکا۔ میڈم او کا ٹسو نے کچن کی نگرانی شروع کر دی اور ایک روز ناما راشن چراتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔ پہلے تو ناما سے ویسے ہی پوچھ گچھ کی جاتی رہی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ راشن کس کے لیے چرایا کرتی تھی پھر اسے گھسیٹ کر میدان کے وسط میں لے آیا گیا اور تمام قیدیوں کے سامنے اس پر تشدد کرتے ہوئے اصل بات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ناما کا جسم خون سے تر ہو رہا تھا، وہ چیخ رہی تھی مگر اس کی۔۔۔ زبان نہیں کھل سکی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے ہٹا دیا گیا اور اس کے بعد ناما کی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کو اضافی راشن کی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہو گیا دوسری طرف امریکی فضائیہ کے بمبار طیارے جاپانیوں کی بیشتر سپلائی لائنیں کاٹ چکے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیمپ میں بھی راشن کی قلت پیدا ہو گئی۔ مزید برآں جون کی چلچلاتی دھوپ نے بھی ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ برف پگھلنے کے بعد کیمپ میں پڑی ہوئی لاشوں سے سڑاند

اٹھنے لگی۔

اگست کے شروع میں قیدیوں کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی تھی۔ رچرڈ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ بے بسی کی موت مرنے کے بجائے انہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس روز میڈم اوکانسو کے ہٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اندر سے آنے والی کھانے کی اشتہا آمیز خوشبو نے اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب کر ڈالیں اور وہ رینگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ وہ نہایت آہستگی سے اندر رینگ گیا۔ اندر پہنچنے کے بعد ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا لیکن اب سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔

میز پر مختلف قسم کے کھانے لگے ہوئے تھے جن کی خوشبو اس پر سحر سا طاری کر رہی تھی لیکن میڈم اوکانسو بھی ہٹ میں موجود تھی۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ رچرڈ نے دروازہ مقفل کر دیا اور رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ معمولی سی آہٹ سن کر میڈم اوکانسو تیزی سے گھوم گئی۔ رچرڈ کو دیکھ کر اس کا چہرہ ایک لمحے کو متغیر ہوا اور دوسرے ہی لمحے اس نے دیوار پر ٹنگے ہوئے ہولسٹر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ہولسٹر سے ریوالور نکالتے ہوئے اس نے پیر کی ٹھوکر سے کھانے کی میز اُلٹ دی۔ ہولسٹر سے ریوالور کھینچتے ہی اس نے یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیے مگر بدحواسی میں اس کی کوئی بھی گولی نشانے پر نہیں لگی تھی۔ اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ بھاری ریوالور اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔

میڈم اوکانسو کی یہ بدحواسی دیکھ کر رچرڈ کے ذہن میں ایک اور شیطانی خیال ابھرا۔ اگر وہ اوکانسو کی اَنا کو مجروح کر سکے تو۔۔۔؟

یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ میڈم اوکانسو نے ایک اور فائر کیا مگر نشانہ اس مرتبہ بھی خطا گیا۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ نے چھلانگ لگا دی۔

دنیا کی سفاک ترین عورت میڈم اوکانسو بے بس چڑیا کی طرح رچرڈ کی گرفت میں تھی۔ رچرڈ پر جنون سا طاری تھا۔ فائرنگ اور میڈم کی چیخوں کی آواز سن کر محافظ لڑکیاں ہٹ کے باہر جمع ہو چکی تھیں اور زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھیں مگر رچرڈ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس پر تو جنون طاری تھا۔ اس نے میڈم اوکانسو کو نیچے گرا کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ انتقام کا جذبہ اب بھی شدید تر تھا۔ اس نے میڈم کے جسم پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ممکن ہے وہ اسے جان ہی سے مار ڈالتا لیکن اسی لمحہ محافظ لڑکیاں دروازہ توڑ کر اندر گھس آئیں۔ وہ رچرڈ کو بڑی مشکل سے گرفت میں لینے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔

میڈم اوکانسو کے جسم اور چہرے پر لاتعداد خراشیں تھیں، ہونٹوں

سوئٹزرلینڈ کی سیاحت کے دوران ایک امریکی تاجر نے خفیہ بینک اکاؤنٹ کھولنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ہوٹل کے کلرک سے اس کا تذکرہ کیا تو کلرک نے بتایا کہ اتفاق سے اس کا ایک دوست خفیہ اکاؤنٹ رکھنے والے بینک کا مالک ہے۔ دوسرے دن ہوٹل کا کلرک امریکی تاجر کو جنیوا کی تنگ سی گلیوں میں گھماتا ہوا ایک چھوٹے سے مکان میں لے گیا۔ جہاں ایک بڈھے سے بینک کے مالک کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا۔ امریکی تاجر نے پچیس ہزار ڈالر سے اکاؤنٹ کھلوایا تو بوڑھے نے اسے ایک سربمہر لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں تمہارا خفیہ اکاؤنٹ نمبر موجود ہے۔ وہ گھر جا کر تنہائی میں اس لفافے کو کھولے اور نمبر ذہن نشین کر کے کاغذ جلا دے۔ ہوٹل پہنچ کر امریکی نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے لفافہ کھولا۔ اس سے برآمد ہونے والے کاغذ کے پُرزے پر لکھا تھا۔ ”تم ہمارے بینک کے پہلے گاہک ہو۔ تمہارا خفیہ اکاؤنٹ نمبر ایک ہے۔ براہِ کرم اپنے دوستوں کو بھی ہمارے بینک میں اکاؤنٹ کھولنے کا مشورہ دینا۔“

سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ دو محافظ لڑکیوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تو وہ ہونٹوں کا خون پونچھتے ہوئے غرائی۔

”تم امریکی کتے! تمہاری یہ جرأت۔۔۔۔ تمہیں اس جرم کی اتنی بھیانک سزا دوں گی کہ تمہاری چیخوں سے آسمان تک کانپ اٹھے گا۔“

میڈم اوکانسو، میڈم لوکا اور میڈم بارو کو بھی احکامات جاری کرتی رہی۔ رچرڈ کو ہٹ سے باہر لے آیا گیا۔ تین محافظ لڑکیوں نے اپنی رائفلیں اس کی پشت سے لگا رکھی تھیں۔ کیمپ کے آخری سرے پر خاردار تاروں کے قریب اسے روک لیا گیا۔ اس جگہ کے قریب ہی جنگلے کے دوسری طرف گندگی کا ایک جوہڑ تھا۔ رچرڈ کے ہاتھ میں ایک بیلچہ دے کر گڑھا کھودنے کا حکم دیا گیا۔ تین رائفلوں کے سائے میں وہ گڑھا کھودتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کے پانچ اور ساتھیوں کو بھی اس کام میں شامل کر دیا گیا۔ وہ سب تقریباً پانچ گھنٹے تک گڑھا کھودتے رہے۔ ان میں جو بھی ذرا سستی دکھاتا، میڈم لوکا کا ہنٹر اس کی کھال ادھیڑ ڈالتا۔

نو فٹ کی گہرائی میں پہنچنے کے بعد پانی نکل آیا۔ اس کے باوجود وہ گڑھا کھودتے رہے۔ بدبودار پانی تیزی سے گڑھے میں بھر رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب پانی پنڈلیوں تک پہنچ گیا تو انھیں رسیوں کے ذریعے باہر نکال لیا گیا۔

قیدیوں کو دو محافظوں کی نگرانی میں ان کی بیرک میں واپس

پہنچا دیا گیا اور میڈم یوکا کے حکم پر چار محافظ لڑکیاں جنگلے کے دوسری طرف جوہڑ کے بدبودار پانی سے بالٹیاں بھر بھر کر اس گڑھے میں انڈیلنے لگیں۔ ان کا یہ کام تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر اطلاع پاکر میڈم اوکاٹسو بھی اپنے ہٹ سے نکل کر وہاں پہنچ گئی۔

رچرڈ کی قمیص پھاڑ کر اس کے جسم سے الگ کر دی گئی اور پھر اسے اور اس کے ساتھیوں کو دھکیلتے ہوئے گڑھے کے قریب لے آیا گیا۔ اس وقت تک گڑھے میں تقریباً چار فٹ پانی جمع ہو چکا تھا۔ میڈم اوکاٹسو چند لمحے خونخوار نگاہوں سے رچرڈ کی طرف دیکھتی رہی پھر معنی خیز لہجے میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”لگتا ہے تم بہت اچھا کھانا کھانے کے شوقین ہو امریکی کتے! آج میں نے تمہارے لیے ایک بہت ہی خاص ڈش تیار کرائی ہے۔ اسے ہماری زبان میں لنّا ہی کہا جاتا ہے۔“

میڈم اوکاٹسو بات کرتے ہوئے رچرڈ کے قریب آگئی تھی۔ آخری الفاظ منہ سے نکالتے ہی اس نے رچرڈ کو زوردار دھکا دیا۔ رچرڈ قلابازی کھاتا ہوا گڑھے میں جاگرا۔ پانی اس کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ کمر اور ٹانگوں پر سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔ وہ پانی میں ہاتھ ڈال کر کمر سہلانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کوئی چیز اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی جسے اس نے نوچ لیا پھر اپنے ہاتھ میں تقریباً پانچ انچ لمبی جونک دیکھ کر اسے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ایک جونک اس کے پیٹ پر چپک گئی تھی جسے کوشش کے باوجود وہ نوچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اور پھر تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے پیٹ سے نیچے جسم کے ہر حصے پر نشتر سے چل رہے ہوں۔

جونکیں اب اس کی کمر اور پیٹ پر رینگتی ہوئی جسم کے ہر حصے پر پہنچ رہی تھیں اور وہ بڑی آزادی سے اس کا خون پی رہی تھیں۔ رچرڈ چیختا ہوا گڑھے کی دیوار کی طرف لپکا۔ اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر چکنی مٹی پر اس کے ہاتھ پھسلتے رہے۔ اس نے بے بسی سے اوپر دیکھا۔ اس کے ساتھی گڑھے کے کنارے پر کھڑے اسے نیچے دیکھ رہے تھے۔ ہر چہرہ خوف و دہشت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ رچرڈ اپنے جسم سے جونکیں نوچتا پانی میں ناچتا رہا۔ اس نے ایک بار پھر اوپر دیکھا۔ اس مرتبہ اسے کوئی محافظ لڑکی دکھائی نہیں دی تھی البتہ اس کا ایک ساتھی گڑھے کے کنارے پر لیٹا ہاتھ نیچے لا رہا تھا۔ رچرڈ نے پوری قوت سے اچھل کر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ ان کی انگلیاں مس ہوئیں مگر دونوں میں سے کوئی بھی کسی کے ہاتھ پر گرفت نہ جما سکا۔ بالآخر تیسری کوشش میں وہ مائر کا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ایک اور ساتھی کو بڑھنے فوراً ہی زمین پر لیٹ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچ تان کر گڑھے سے باہر نکال لیا۔

ہوا اور دھوپ کے باعث اس کے جسم پر جونکوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ رچرڈ کے ساتھی اس کے جسم سے جونکیں نوچ نوچ کر پھینکتے رہے۔

”کک ... کیا ہوا ... یہ خونخوار بلّیاں یہاں سے کیوں چلی گئیں؟“ رچرڈ نے حواس بحال ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

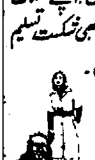
”پپ ... پتا نہیں۔“ مائر بولا۔ ”کچھ دیر پہلے ایک کار گیٹ پر آکر رکی تھی۔ نیچے اترنے والے ایک جاپانی فوجی نے چیخ کر پہرہ یا شاید اس کے ساتھ کچھ اور بھی کہا تھا۔ تمام لڑکیاں دوڑتی ہوئی کار کے قریب چلی گئیں۔ وہ دیکھو ... وہ اب بھی گیٹ کے پاس جمع ہیں۔“

رچرڈ نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ کیمپ کی تمام محافظ لڑکیاں جاپانی بحریہ کے ایک آفیسر کے گرد جمع تھیں۔ چند منٹ بعد لڑکیاں اس آفیسر کو چھوڑ کر اپنے ہٹس کی طرف چلی گئیں۔ جاپانی آفیسر کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کے قریب پہنچ گیا۔

چھ اگست کے دن ... امریکی فضائیہ کے بی ۲۹ طیارے نے ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا تھا۔ اس کے تین دن بعد ایک اور ایٹم بم نے ناگاساکی کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ چودہ اگست کو جاپان نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس طرح جنگ ختم ہو گئی تھی اور جنگی کیمپوں میں تمام امریکی قیدی اب آزاد تھے۔

رچرڈ اور اس کے ساتھیوں نے کیمپ کے تمام قیدیوں کو یہ خوشخبری سنا دی۔ ہر وہ شخص جو چلنے پھرنے کے قابل تھا خوشی سے اچھل پڑا اور پھر انہوں نے محافظ لڑکیوں کے ہٹس کو گھیرے میں لے لیا۔ اب وہ کسی چیز سے خوف زدہ نہیں تھے۔ ان کے دلوں میں شدید نفرت تھی اور وہ کیمپ کی ان درندہ صفت محافظ لڑکیوں سے انتقام لینا چاہتے تھے جنہوں نے انہیں زندہ درگور کر رکھا تھا۔

وہ مختلف ہٹس کی تلاشی لیتے ہوئے اس بڑے ہٹ کے سامنے پہنچ گئے جو میٹنگ ہال کہلاتا تھا۔ ہٹ کا دروازہ بند تھا جسے قیدیوں نے توڑ دیا۔ سب سے پہلے اندر داخل ہونے والا رچرڈ ہی تھا لیکن پہلا قدم اندر رکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے سامنے فرش پر کیمپ کی تمام محافظ لڑکیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اپنے اسلاف کی روایات پر عمل کرتے ہوئے ان جاپانی لڑکیوں نے بھی شکست تسلیم کرنے کے بجائے ہاراکاری (جاپانی خودکشی) کر لی تھی۔



CAMP AGONY GIRLS
Martin Slovit.



ہالہ

خالدہ شاد

زندگی کا وہ عرصہ جب انسان ہر متاعِ عزیز سے محروم ہو جائے، نہایت کرب آمیز ہوتا ہے۔ اس وقت ذات کے ویرانے میں پھیلا ہوا سناٹا خود ایک چیخ بن جاتا ہے۔ ایسی چیخ جو زندگی اور موت کے درمیان حدِ فاصل ہو۔

ان لمحوں کا نظارہ جب آس و یاس گلے مل رہے تھے

اُس بوسیدہ فلیٹ میں اسمتھ کی وہ دسویں صبح تھی۔ آنکھ کھلنے پر اُس نے اُس تنگ اور نیم تاریک لواب گاہ میں نظر ڈالی تو اُسے اپنا نواحی مکان یاد آ گیا۔ اگر وہ اپنے نواحی مکان میں ہوتا تو کشادہ خواب گاہ کی کھڑکی سے پھولوں کی سو‌ندھی سوندھی مہک اندر آ رہی ہوتی اور کھڑکی کے سامنے ہوا ...تی ہوئی شاخیں اُسے سلامِ صبح کر رہی ہوتیں لیکن اس نیم تاریک ...ل بدرنگ دیوار پر اُسے ایک لال بیگ نظر آ رہا تھا جو چھت کی طرف محوِ سفر تھا۔

اسمتھ اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور صورتِ حال کے بارے ...چنے لگا۔ ایک جذباتی غلطی کے باعث وہ اپنے شاندار نواحی ...ن سے تقریباً محروم ہو چکا تھا۔ امیلیا شروع میں جتنی خوبصورت معصوم نظر آتی تھی، بعد میں اتنی ہی مکار ثابت ہوئی تھی۔ اُس نے نہایت چالاکی سے اُس کا آبائی مکان اپنے نام کروا لیا تھا اور پھر موقع پاتے ہی عدالت میں طلاق کی درخواست دے دی۔ عدالت نے طلاق کا فیصلہ ہونے تک اسمتھ کو مکان سے بے دخل کر دیا تھا اور اب وہ گزشتہ دس روز سے اس بوسیدہ فلیٹ کی آلودہ فضا میں سانس لے رہا تھا۔

اُس کے دل کے کسی گوشے میں اب بھی امیلیا کے لیے محبت پائی جاتی تھی۔ اُس نے سوچا، اگر امیلیا اب بھی صلح پر راضی ہو جائے تو اُن کی خوشیاں واپس آ سکتی ہیں۔

اُس روز ہفتہ تھا۔ امیلیا دفتر جانے کی تیاری کر رہی ہو گی۔ اسمتھ کا ذہن منصوبہ بندی کرنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ اپنے نواحی مکان سے دستبردار ہونے کے بجائے اُس میں مر جانا زیادہ بہتر تھا یا وہ دونوں اُس مکان میں رہیں گے اور یا کوئی بھی نہیں رہے گا۔

اُس نے کمبل ایک طرف پھینکا اور ننگے پیر باتھ روم کی طرف چل پڑا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے اپنے کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھرائیں اور پُرخیال انداز میں مسکرانے لگا۔ شیو اور غسل کے بعد اُس نے ناشتا کیا اور اپنا بہترین سوٹ پہن کر باہر نکل گیا۔ چند لمحوں کے بعد اُس کی کار براڈوے پر دوڑ رہی تھی۔ موسمِ خزاں

Farrukh Malik

طاقت

محسن رضا

بخیر و خوبی اس مہم کو سر کرنے کے لیے اُسے شیر کے حوصلے، لومڑی کی سی عیاری اور کسی دانشور کی سی معاملہ فہمی کی ضرورت تھی۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس میں یہ خوبیاں موجود ہیں یا نہیں ــــ کیا وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا ؟ ایک سنسنی خیز مہماتی کہانی۔

امریکی بحریہ کا جنگی جہاز پُرسکون سمندر کی سطح پر تیرتا ہوا ساحل کی طرف بڑھتا رہا۔ جو اَب زیادہ دور نہیں رہا تھا.... ساحل کے ساتھ ساتھ متعدد چھوٹے بڑے تجارتی جہازوں کے ساتھ ماہی گیروں کی کشتیاں اور موٹر لانچیں لنگر انداز تھیں پس منظر میں دکھائی دینے والے شہر کی عمارتوں کے خاکے میں سب سے نمایاں قدیم تاریخی حیثیت کا حامل وہ قلعہ تھا جو اَب ایوانِ صدر کے طور پر استعمال ہوتا تھا فصیل کے مشرقی اور مغربی کناروں پر واقع دو سربلند برج سوا سو سال سے سمندر کی موجوں کے تھپیڑے برداشت کر رہے تھے مگر ابھی تک پانی ان کی بنیادوں کو ہلا نہیں سکا تھا.... لیفٹیننٹ کمانڈر فلپ نے برسوں پہلے ان بنیادوں کو دیکھا تھا تب بھی ان کی قدامت کے پُروقار حسن کا یہی انداز تھا اور آج بھی ان کا نظارہ پُرکشش تھا لیکن عر... پر کھڑے ہوئے کمانڈر فلپ نے چشمِ تصور سے اس عہدِ گزشتہ کو د... کی کوشش کی جب ان میناروں سے زیرِ زمین اترنے والے پیچ... راستوں کو طے کرنے والے پابہ زنجیر مجرم سنگ و آہن سے ترا... ہوئے قید خانوں تک پہنچائے جاتے تھے اور زندہ انسانوں کی دنیا... سے بہت نیچے تاریکی، نمی، حبس اور تعفن کی فضا میں گھٹ گھٹ... اور سسک سسک کر دم توڑنے کے لیے چھوڑ دیے جاتے تھے... سزائے موت سے کہیں زیادہ سخت عذاب کی موت اُن کا مقدر ہوتی تھی... جو بغاوت اور سرکشی کے مرتکب ہوتے تھے، جابر حکمراں کے خلاف کلمۂ... کہنے کی جرأت کرتے تھے یا ظلم کے خلاف انصاف کا نعرہ لگانے کے جر...

Farrukh Malik



یا کسی طرح بھی شاہی عتاب کو دعوت دینے کی مہلک غلطی کرتے
فلپ نے پہلی بار نیچے جاکران ویران اور آسیب زدہ نظر آنے
زنداں خانوں کو دیکھا تھا تو دیواروں سے پیوست سلاسل کے
ے دیواروں پر لہو کی وہ تحریر نظر آئی تھی جس کا کوئی وجود
اور اس کے کانوں نے درد و کرب میں ڈوبی ہوئی ظلم سہنے والوں
صدائیں سُنی تھیں، جو بہت پہلے ختم ہو چکی تھیں .... فلپ کو یوں
ے سو سال بعد بھی اس خون کی مہک فضا میں موجود ہے اور
اش آوازوں کی بازگشت کسی بدروح کی طرح قید خانے میں ہی
ہی ہے۔
ئی سال بعد لیفٹیننٹ کمانڈر فلپ پھر جنوبی امریکا میں واقع اس

چھوٹی سی ریاست کے ساحل پر قدم رکھنے والا تھا، جہاں وہ تین سال تک امریکی سفارت خانے میں ملٹری اتاشی کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ اسے دوبارہ یہاں بھیجنے کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ اس خطے کے لوگوں سے، یہاں کی زبان سے اور اس ریاست کے تاریخی و سیاسی پس منظر سے بخوبی آشنا تھا۔ ابھی چند روز پہلے اسے واشنگٹن طلب کیا گیا تھا اور فرداً فرداً صدر کے دفاعی امور کے مشیر اور امورِ خارجہ کے ڈائریکٹر سے ملاقات کے بعد انٹیلی جنس کے سربراہ نے کہا تھا.....

"فلپ ..... اب تک صورتِ حال تم پر واضح ہو جانا چاہیے، ہم تمہیں ایک ایسے مشن پر بھیج رہے ہیں جس میں طاقت سے زیادہ ذہانت کا استعمال بین الاقوامی سطح پر ہماری سیاسی پوزیشن کی ساکھ برقرار رکھنے میں

مددگار ثابت ہو سکتا ہے...... ہم طاقت کے استعمال سے گریز کرنا چاہتے ہیں، تاوقتیکہ حالات ہمیں مجبور نہ کر دیں اور ہمارے لیے فوجی مداخلت کے سوا مسئلے کا کوئی حل باقی نہ رہے...... لیکن اس سے پہلے مسئلے کو سمجھنا ضروری ہے۔ اب تک ملنے والی خبریں اور افواہیں تشویش ناک ہیں اور تمہیں یہ دیکھنا ہے کہ ان میں کس حد تک صداقت ہے اور پھر یہ طے کرنا ہے کہ کوئی ناخوشگوار قدم اٹھائے بغیر حالات پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ تمہیں امریکی حکومت کی مکمل حمایت حاصل ہے اور بحری جہاز میں موجود میرین فوجی تمہارے اشارے پر حرکت کے لیے تیار ہوں گے مگر اس کی نوبت نہ آئے تو اچھا ہے...... تمہیں وہاں بھیجنے کی دو اہم وجوہات ہیں...... ایک یہ کہ حکومت کو تمہاری ذہانت اور صلاحیت پر اعتماد ہے اور یقین ہے کہ تم غلط فیصلہ نہیں کرو گے...... دوسری زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ تم اس ریاست سے بہت اچھی طرح واقف ہو اور ضرورت پڑنے پر مقامی حالات کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے فیصلہ کر سکتے ہو...... ہمیں خونریزی نہیں کرنا ہے اور اس حلیف ریاست سے دستبردار بھی نہیں ہونا ہے...... سارا مسئلہ یہی ہے۔"

اگرچہ یہ مسئلہ اتنا سیدھا اور آسان نہیں تھا مگر فلپ اس مشن پر تنِ تنہا آکے پشیمان نہیں تھا...... یہاں اس کے بہت سے راز دار دوست تھے جو وقت پڑنے پر ہر طرح سے اس کی مدد کر سکتے تھے اور فلپ کا خیال تھا کہ برسوں بعد اگر وہ نہ ملے تو شاید اس کا کام بہت مشکل ہو جائے گا لیکن وہ ناامید نہیں تھا۔ ان میں سے کچھ یقیناً زندہ ہوں گے اور وفاداری کے پرانے رشتوں کا پاس رکھیں گے...... جہاز اب لنگر انداز ہو چکا تھا اور اسے ساحل تک لے جانے والی چھوٹی کشتی قریب آ رہی تھی۔ فلپ نے وہ بریف کیس اٹھا لیا جس میں امریکی حکومت کے متعدد اعلیٰ حکام کے مراسلے تھے اور وہ احکامات تھے جو ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے دیے گئے تھے...... اس نے ایڈمرل میسن سے اجازت لی اور کشتی میں اتر گیا۔ اس کی بے داغ سفید وردی پر ابھی تک پانی کا ایک چھینٹا نہیں پڑا تھا۔ طویل سفر کے باوجود اس کی صورت پر تھکن کے آثار مفقود تھے اور اس کے کلین شیو چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو اعتماد کے ساتھ انکسار کی مظہر لگتی تھی اور ہر جگہ اس کو دوست بنا دیتی تھی۔ بیالیس سال کی عمر میں بھی وہ اتنا ہی صحت مند، چاق چوبند اور اسمارٹ تھا، جتنا پندرہ سال قبل نیوی میں اپنے کیریئر کا آغاز کرتے وقت تھا...... یہ بڑا قابلِ فخر زمانہ تھا جس میں فلپ اپنی ذہانت کا بہترین استعمال کرتے ہوئے مسلسل ترقی اور کامیابی کی راہ پر گامزن رہا تھا اور بدنامی کے ہر داغ سے مبرّا کیریئر نے اس کے لیے ایک درخشاں مستقبل کے راستے وا کر دیے تھے۔

اس کا دوست لیفٹیننٹ کاٹن جیپ سے کر اس کا منتظر کھڑا تھا...... انہوں نے بے تکلفی سے مصافحہ کیا...... "مجھے تمہارا پیغام موصول ہو گیا تھا،" کاٹن نے کہا جو عمر میں دس سال کم ہونے کے باوجود احساسِ فرض شناسی اور ذمے داری میں فلپ کی توقعات پر پورا اترتا تھا۔ "تمہارے چار پانچ پرانے دوستوں کو خبر مل چکی ہے اور وہ مزید لوگوں سے رابطہ قائم کر رہے ہیں......" اس نے جیپ کا دروازہ فلپ کے بیٹھنے تک تھامے رکھا۔ پھر گھوم کر ڈرائیور کی جگہ آ بیٹھا۔ فلپ نے دیکھا کہ ساحل سے دور بہت سے تماشائی حیرت اور تجسس کی تصویر بنے کھڑے ہیں اور پولیس کے اہلکار ڈنڈے گھماتے ہوئے انہیں اپنی حدود اور اوقات میں رہنے کی عملی تلقین کر رہے ہیں۔ فلپ نے خوش دلی سے ان سب کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ جواب میں اس نے متعدد ہاتھوں کو جھنڈے کی طرح بلند ہوتے اور لہراتے دیکھا۔ پھر جیپ نے موڑ کاٹا اور بندرگاہ کا پورا منظر اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

"حالات کی رپورٹ کیا ہے......" فلپ نے موقع پاتے ہی سوال کیا اور اپنی سگریٹ جلانے لگا۔

"حالات یہ ہیں کہ آج سفارت خانے میں ایک ضیافت ہے،" کاٹن نے نظر سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "جنرل موریل کے اعزاز میں جو صدر کی پُراسرار علالت کے دوران صدر کے فرائضِ منصبی سرانجام دے رہا ہے...... ضیافت میں امریکی سفیر اور اس کے معزز مہمان کو یعنی تمہیں بھی مدعو کیا گیا ہے...... وہاں تمہیں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا......"

فلپ نے بے خیالی میں سر ہلایا...... اس کا ذہن بہت پرانی یادوں میں گم تھا...... وہ پرانے راستوں پر اجنبی نشانیاں تلاش کر رہا تھا مگر یوں لگتا تھا یہاں وقت بدستور ٹھہرا ہوا ہے...... جو چیز جہاں تھی جیسی تھی اب بھی وہیں اور ویسی ہی تھی، تبدیلی جو وقت کے ساتھ آدمی کی جدوجہد کے آگے بڑھنے کی علامت ہوتی ہے کہیں نظر نہ آتی تھی...... سورج کے بلندی کی جانب سفر کے ساتھ ساتھ گرمی کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تھا اور ہوا کی رطوبت کے باعث جسم سے خارج ہونے والا پسینہ خشک ہونے کے بجائے کپڑوں کو تر کرتا جسم پر بہنے لگا تھا...... جیپ ایک نسبتاً صاف ستھری اور نئی دکان کے سامنے رکی تو فلپ نے پرانے بار کے نئے شوخ رنگ کو دلچسپی سے دیکھا۔ ایئرکنڈیشنڈ بار میں موسم بالکل مختلف تھا۔ دروازے کے اوپر لگا ہوا روم ایئرکنڈیشنر کسی محافظ کی طرح باہر کی بدتمیز گرمی کو اس مہذب ماحول میں نہیں گھسنے دے رہا تھا...... ان کے ساتھ ہی دُبلا پتلا، کیٹلی مونچھوں والا دراز قامت شخص بھی اندر آ گیا تھا...... فلپ نے اس کی صورت کو بندرگاہ کے ہجوم میں شناخت کر لیا تھا چنانچہ صاف ظاہر تھا کہ وہ ان کا تعاقب کرتا ہوا پہنچا ہے۔ پھر ایک ویٹر جو معیار کے مطابق اس اعلیٰ درجے کے بار کے ویٹر کی شاندار وردی پہنے ہوئے تھا۔ ظاہری اندازِ بے نیازی سے آگے بڑھا۔ پیٹر کا آرڈر لینے کے بعد

نے تعظیم سے سر جھکایا اور زیرِ لب کہا۔ ”آج رات کو سات بجے سینور! ..... سینٹ مارٹن کا وہی پرانا گھر.....“

”تھینک یو.....“ فلپ نے یوں کہا جیسے ویٹر نے آرڈر لینے کے بعد کچھ اور حاضر کرنے کی پیش کش کی تھی جسے اس نے مسترد کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ تازہ دم ہو کے نکلے تو گرمی کی شدت پوری قوت سے ان پر حملہ آور ہوئی، مگر اس گرمی سے کہیں مفر نہ تھا ..... جیپ شکستہ سڑک پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھنے لگی۔ سڑک پر اتنی بار پیوند کاری کی گئی تھی کہ اب اس کی سطح پر دھبے دھبے دکھائی دینے لگے تھے جن کے درمیان اُکھڑ جانے والے پیوند پرانے زخم کی طرح نمودار ہو گئے تھے۔ کبھی کبھار کوئی پرانی کار کھڑکھڑاتی گزر جاتی تھی یا ٹیکسی چیختے چلاتے مسافروں سے لدی پھندی نظر آ جاتی تھی ..... بے فکروں اور بے روزگار لوگوں کے غول ہر جگہ وسیع و عریض ہیٹ لگائے انہیں گھورتے دکھائی دیتے تھے۔ لمبی نوکیلی مونچھیں رکھنے کا فیشن بھی نہیں بدلا تھا۔ خواتین حسبِ سابق مائل بہ فربہی تھیں..... بدذائقہ اور غلیظ چیزوں کو آواز لگا کے بیچنے والے بھی وہی تھے ..... فلپ کو یوں لگا جیسے وہ درمیانی وقفے میں امریکا گیا ہی نہیں اور اب بھی ملٹری اتاشی ہے..... اس کے خیالات کی رو اس وقت ٹوٹی جب ان کی جیپ امریکی سفارت خانے میں داخل ہو کے ایک جانب صف بستہ درجن بھر شاندار کاروں کے ساتھ جا کھڑی ہوئی ..... جدید ترین ماڈل کی یہ امریکن کاریں اس سترھویں اٹھارویں صدی جیسے ماحول میں بڑی اجنبی لگتی تھیں ..... اب ایک باڈی گارڈ آگے بڑھا۔ ”میں صدرِ مملکت کی جانب سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں“، وہ بولا۔

”کیا حال ہے صدرِ محترم ڈان کارلوس کا؟“ فلپ نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے مسکرا کے کہا۔ ”بہت دن بعد ان سے ملاقات ہو گی ..... شاید تمہیں نہیں معلوم ..... میں تین سال تک یہاں ملٹری اتاشی رہ چکا ہوں ..... مسٹر ڈان کارلوس.....“

”آئی ایم سوری سینور.....“ نوجوان اور شائستہ لہجے میں رواں انگریزی بولنے والے محافظ نے کہا۔ ”ان سے آپ کی ملاقات نہ ہو سکے گی ..... وہ علیل ہیں اور اپنے آبائی گاؤں کے پُرفضا ماحول میں زیرِ علاج ہیں مگر ابھی تک بہتری کے آثار نظر نہیں آتے ..... ان کی جگہ جنرل مویل تشریف لائے ہیں.....“ وہ معزز مہمانوں کی حیرانی سے لاتعلق آگے آگے چلتا ہوا انہیں ایک کمرے تک لے گیا جو دوسری منزل پر واقع تھا ..... اپنا حلیہ درست کر کے وہ دوسرے راستے سے نیچے اترے اور اس ہال میں جا پہنچے جہاں ضیافت کا اہتمام تھا ..... ایک نظر میں فلپ نے جنرل مویل کو دیکھ لیا ..... وہ امریکی سفیر کے ساتھ کھڑا وزیروں، سفیروں اور سیاست والوں سے ملکی مسائل پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ بلحاظِ عہدہ وہ ابھی تک مسلح افواج کا کمانڈر

انچیف اور نائب صدر تھا جسے آئین کی رو سے صدر کی عدم موجودگی یا علالت کے دوران صدر کے فرائض سنبھالنے کے اختیارات حاصل تھے شاہانہ طرز پر سجے ہوئے ہال میں اعلیٰ فوجی عہدیدار اپنی وردیوں پر تمغے اور میڈل سجائے موجود تھے ..... معززینِ شہر بہترین سوٹ پہن کے آئے تھے۔ خواتین میں ہر رنگ، عمر اور وضع کی عورتیں جدا جدا فیشن اور میک اپ کیے آئی تھیں اور حضرات سے زیادہ یہ سوچ کر پریشان تھیں کہ بجلی فیل ہونے سے ایئر کنڈیشنر نے کام بند کر دیا تو ان کا کیا حشر ہو گا ..... بجلی کا فیل ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی البتہ کسی پارٹی میں بجلی کا نہ جانا قابلِ ذکر واقعہ بن جاتا تھا۔

فلپ نے فوراً اندازہ کر لیا کہ اس ضیافت میں جنرل مویل سب کی توجہ کا مرکز ہے، ہر شخص کسی نہ کسی بہانے اس کے قریب جا کے اس سے ملنا اور اس کی باتیں سننا چاہتا ہے۔ لوگ اس کی موجودگی سے نفسیاتی طور پر کشیدگی کا شکار، مرعوب اور کسی حد تک خائف نظر آتے تھے۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے قد کا تندرست اور وجیہہ مرد تھا جس کی عمر قابلِ رشک صحت کے باعث پچاس کے بجائے چالیس سال لگتی تھی ..... اس کی گہرے نیلے رنگ کی وردی بہت شاندار تھی جس پر سنہرے فیتے، بِلّے اور میڈل بڑے سلیقے سے ٹنکے ہوئے تھے۔

”یور ایکسیلینسی .....“ فلپ نے جنرل مویل کی آواز سُنی۔ ”امریکی حکومت سے تعلقات کو مزید دوستانہ بنانا میری عین خواہش ہے لیکن ..... لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا.....“ اس نے اپنی مجبوری کا بھرپور تاثر دونوں ہاتھوں سے دیا..... پھر کسی نے اس سے کچھ پوچھا اور وہ اسی لہجے میں بولا..... ”بھئی آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کریں..... جب تک صدر اس قابل نہ ہو جائیں.....“

”لیکن یہ تو ممکن ہے کہ ہم خود صدر کی خدمت میں حاضر ہو جائیں .. چند منٹ کے لیے ہی سہی“ امریکی سفیر نے کہا۔

”دیکھیے میں اس ملک کا نائب صدر ہوں.....“ جنرل مویل نے کہا ....” لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں۔ میں ان سے کسی کی ملاقات کا وعدہ نہیں کر سکتا ..... مسٹر ڈان کارلوس چند مخصوص لوگوں کے سوا کسی سے ملتے ہی نہیں ..... ان کی صحت دن بدن ..... خیر میں تشویش نہیں پھیلاؤں گا ..... موجودہ حالات میں ان سے ملاقات کا کوئی سوال نہیں .....“ فلپ نے اندازہ لگایا کہ جنرل بہت عیّار ہے، اس نے بڑے سلیقے سے واضح کر دیا تھا کہ کوئی اس کی مرضی کے بغیر ڈان کارلوس کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ اس نے بیماری کی نوعیت نہیں بتائی تھی تو اس بات کو گول کر دیا تھا کہ موجودہ صورتِ حال کتنا عرصہ برقرار رہے گی۔ فلپ نے سامنے آئے بغیر جنرل کو متعدد سوالوں کے جواب دیتے سنا مگر لوگوں کی طرح اسے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ امریکی سفیر کے سامنے جا کے جنرل سے تعارف کا اعزاز حاصل کرنے سے قبل فلپ نے پرانے دوستوں اور

شناسائی کا رشتہ رکھنے والوں سے ملاقات کی اور اس طرح ہال کے اردگرد ہی گھومتا رہا .... اچانک کسی نے اس کا راستہ روک لیا۔ "کمانڈر انچیف! تم یہاں کیسے؟" لہجے میں حیرانی کا عنصر بڑا غیر حقیقی تھا۔

"کرنل یورات!" فلپ نے گول بچوں جیسے چہرے والے ادھیڑ عمر اور پستہ قامت شخص سے مصافحہ کیا۔ "دنیا گول ہے۔ مخالف راستوں پر چلنے والے پھر کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں .... تم سناؤ کیا حال ہے .... ابھی تک پولیس کے چیف ہو یا .....؟"

یورات کی سانپ جیسی گول آنکھیں فلپ پر جمی رہیں .... "میں آج وزیر داخلہ ہوں .... تمہارا قیام عارضی ہے یا .....؟"

فلپ کو اس کے اتنی دیر تک پلک نہ جھپکنے پر تعجب ہوا .... "ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا ....." فلپ نے نامکمل جملے کا مطلب سمجھ کے کہا۔ "میں امریکی حکومت کا نامہ بر ہوں .... چند اہم مراسلے لے کر آیا ہوں .... ان کا جواب ملنے پر میرے قیام کی مدت کا انحصار ہے ....."

"کمانڈر ..... اب حالات پہلے جیسے نہیں ہیں ...." یورات نے معنی خیز لہجے میں کہا .... "میرا مطلب ہے ان دنوں یہاں ایک وبا پھیلی ہوئی ہے .... ایک خطرناک متعدی مرض سمجھ لو .... میں نہیں چاہتا کہ خدانخواستہ تم بھی اس کی لپیٹ میں آجاؤ .... میں پوری کوشش کروں گا کہ مراسلات کے جواب تمہیں جلد از جلد مل جائیں ....."

"کیا صدر ڈان کاروس بھی اسی متعدی مرض کا شکار ہیں؟" فلپ نے بالکل انجان بن کے کہا۔

"بہت سی باتیں سرعام پوچھنا بھی اتنا ہی غلط ہوتا ہے جتنا ان کا جواب دینا ....." یورات نے ناگواری سے کہا .... "تمہارا قیام کم ہو یا زیادہ ..... میرا ایک مشورہ ہے .... غیر ضروری تجسس سے گریز کرو گے تو ہر آفت سے محفوظ رہو گے۔" وہ راستہ کاٹ کے نکل گیا۔

فلپ سوچتا رہا کہ کیا ان الفاظ کو دھمکی سمجھا جاسکتا ہے؟ کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یورات کو اس کی آمد کے اصل مقاصد کا علم ہو چکا ہے؟ اور کیا اس وارننگ کے بعد سے اپنے لائحہ عمل میں رد و بدل کرنا ہوگا؟ وہ ابھی کچھ طے نہیں کر پایا تھا کہ ہال کے ایک گوشے میں ہونے والی گڑبڑ نے اسے متوجہ کر لیا ..... ایک نازک اندام، خاصے دلکش خطوط کی مالک نوجوان لڑکی مجمع کو چیر کر آگے آنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ صدارتی باڈی گارڈ کے دستے کا کوئی رکن نیلی وردی پہنے اسے سمجھا بجھا رہا تھا ایک طرف لے جانے کی کوشش میں مصروف تھا مگر لڑکی اسے دھکیلتی ہوئی آگے بڑھتی جارہی تھی۔

پل بھر کے لیے فلپ کو اس کی صورت کی ایک جھلک نظر آئی۔ اس نے سفیدی مائل گندمی رنگ، بیضوی چہرے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی ہیلن کو فوراً شناخت کر لیا۔ اس کے سیاہ بال منتشر ہو گئے تھے اور وہ نوجوان باڈی گارڈ کی مداخلت پر برہم تھی، جو اس کی راہ میں حائل تھا مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنا فرض نہیں پورا کر رہا ہے اگر وہ چاہتا تو اس کمزور لڑکی کو اٹھا کے بھی باہر لے جاسکتا تھا لیکن وہ انتہائی عاجزانہ انداز میں اس سے درخواست پر اکتفا کر رہا تھا اور ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا جارہا تھا ..... ہیلن ملک کے صدر ڈان کاروس کی بیٹی تھی جس کے ساتھ زبردستی اندر گھس آنے والے گداگر جیسا سلوک نہیں کیا جاسکتا تھا .... فلپ اسے آواز دیتے دیتے رہ گیا .... آداب محفل کا خیال نہ ہوتا تو وہ دوڑ کر اس کے سامنے چلا جاتا اور کہتا "ہیلن .... تم نے مجھے پہچانا .... میں فلپ ہوں .... تمہیں یاد ہے جب میں ملٹری اتاشی تھا تو تمہارے والد سے میرے مراسم کتنے دوستانہ تھے اور کتنی بار ہم رات گئے تک تمہارے گھر کے باہر پھولوں کے کنج میں بیٹھے رہتے تھے ..... اور کیا تمہیں علم ہے کہ جب میرے کان تمہارے والد کی آواز پر لگے ہوئے ہوتے تھے تو میری آنکھیں کیا دیکھتی رہتی تھیں!"

"جنرل ....." ہیلن کی آواز نے فلپ کو چونکا دیا ..... ہر نظر گھوم کر ہیلن پر مرتکز ہوگئی۔ ہال میں ایک اعصاب شکن سکوت طاری ہوگیا ..... ہیلن اب ملک کے نائب صدر کے سامنے انتہائی سرکشی سے نظریں اٹھائے کھڑی تھی۔ "مجھے کچھ پوچھنا ہے۔"

"میں حاضر ہوں خاتون ...." جنرل موریل نے انتہائی نرم اور شائستہ لہجے میں کہا۔

"میں یہ بات سب لوگوں کے سامنے پوچھنا چاہتی تھی جنرل ...." ہیلن نے بے خوفی سے کہا .... "میرے والد کہاں ہیں؟"

"سینوریتا .... معلوم ہوتا ہے تم ہوش میں نہیں ہو۔" جنرل موریل نے اسی شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ پھر وہ امریکی سفیر سے مخاطب ہوا جو خود بھی ہیلن کے سوال کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھا۔ "بیچاری لڑکی اعصابی کشیدگی کے باعث ذہنی مریض بن گئی ہے۔ میرا خیال ہے اسکی تربیت صحیح نہیں ہوئی۔ ڈان کاروس نے اسے حد سے زیادہ آزادی دے کر غلطی کی ....."

"جنرل .... میں اپنا سوال دہراتی ہوں ...." ہیلن نے چیخ کر کہا .... "مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرو ..... یہ تمہارا ایوانِ صدر نہیں ہے یہاں مجھے سفارتی تحفظ حاصل ہے .... مجھے بتاؤ میرا باپ کہاں ہے؟ ان سب کے سامنے ....."

"کرنل یورات!" جنرل موریل نے چٹکی بجائی ...... "دیکھو سفارتخانوں میں ہنگامہ نہیں ہونا چاہیے ..... یہ ہماری ذمے داری ہے ..... خاتون کو باہر لے جاؤ ..... آئی ایم سوری یور ایکسیلینسی ....." وہ امریکی سفیر سے معذرت کرتے ہوئے بولا۔ اس کے پرسکون انداز اور اعتماد میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا اور اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اتنے بڑے مجمع کی نظریں کیا کہہ رہی ہیں۔

"میں پاگل نہیں ہوں ...." ہیلن چلائی .... "تم میرے سوال

Farrukh Malik

کا جواب دینا نہیں چاہتے کیونکہ ....."

کرنل یورات نے آگے بڑھ کر ہسٹریا میں مبتلا ہیلن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے کھینچ کر لے جانے لگا مگر ہیلن ... تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی .... "..... کیونکہ .... تم نے.... تم نے میرے باپ کو قتل ....." وہ گرفتاری کے لیے آگے بڑھنے والوں سے لڑتے لڑتے چیخی .... سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا ..... دو نوجوان پولیس آفیسر اب کرنل یورات کی مدد کے لیے آگئے تھے اور ہیلن کا منہ بند کر کے اسے زینے کے راستے اوپر لے جا رہے تھے ..... اچانک وہ نوجوان باڈی گارڈ جو پہلے منت سماجت سے ہیلن کا راستہ روکنے کی ناکام کوشش کر چکا تھا، تلوار میان سے نکال کے کرنل یورات پر حملہ آور ہوا۔ یورات نے بڑی پھرتی سے خود کو بچا لیا مگر ہیلن اس کی گرفت سے نکل گئی .... فلپ اتنی دیر میں ہجوم سے گزر کر ہیلن کے قریب جا پہنچا تھا... "ہیلن ...." اس نے سرگوشی میں کہا... "پاگل مت بنو... اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا... زینے سے اوپر چلی جاؤ....." ہیلن نے پلٹ کر دیکھا اور کچھ کہتے کہتے رک گئی .... پھر وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی..

...کرنل یورات پر حملہ کرنے والا نوجوان باڈی گارڈ اب جنرل موریل کے سامنے کھڑا تھا... تلوار اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

"تم نے ہیلن کے سوال کا جواب نہیں دیا ہے جنرل...." وہ بولا.... پھر اس کا الٹا ہاتھ گھوم کر جنرل کے گال پر پڑا۔ مکمل خاموشی میں اس کے تھپڑ کی آواز کسی پٹاخے کی طرح گونجی۔ موریل کا چہرہ غصے اور احساسِ ذلت سے زرد پڑ گیا...." اس... اس بیہودہ کو لے جاؤ...." اس نے بمشکل تمام کہا .... کرنل یورات کے ساتھ تین چار محافظ اس کی طرف لپکے۔

"خبردار جو کوئی میرے قریب آیا...." نوجوان نے تلوار سونت لی مگر کرنل نے اس کے سر پر بھاری پستول کا دستہ مارا۔ نوجوان کے حلق سے ایک کراہ نکلی، سنبھلنے سے پہلے اسے محافظوں نے تھام لیا اور گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ فلپ نے محسوس کیا کہ اس وقت ہر نگاہ نوجوان پر ہے جو اس ضرب کے باوجود بے ہوش نہیں ہوا تھا اور رہائی پانے کی بے مصرف کوشش کر رہا تھا۔ موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فلپ ایک بغلی دروازے سے نکل گیا۔ وہ ایک اسٹور روم کے راہداری میں پہنچا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں ایک دھکے ... ایک چیخ کی دبی دبی آواز پہنچی ..... وہ دوڑتا ہوا راہداری کے آخری حصے میں نظر آنے والے دروازے کو کھول کر عقبی باغ میں آیا تو اسے وہی باڈی گارڈ زمین پر بے حس و حرکت الٹا پڑا نظر آیا۔ اس کے سینے کے شگاف سے بہنے والا لہو سرخ بجری کے اوپر پھیلتا جا رہا تھا اور اسے گھسیٹ کر لانے والے چند قدم کے فاصلے پر حلقہ بنائے کھڑے تھے ..... فلپ کو دیکھتے ہی ان کی صورت پر نظر آنے والے نفرت اور حقارت کے جذبات یکلخت حیرت اور صدمے کی کیفیت میں بدل گئے۔

"بے وقوف آدمی ...." ان میں سے ایک نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "ایک عورت کے پیچھے مر گیا...."

"تمہارا مطلب ہے کسی نے اسے مارا نہیں ہے؟" فلپ نے طنز آمیز حیرانی سے سوال کیا۔

"نو سر .... مارنے کا مطلب تو ہے قتل..." دوسرے نے کہا ..." اور وہ بھی ایک سفارت خانے میں....."

"ہم قانون کا پورا احترام کرنا جانتے ہیں جناب!" تیسرے نے ہمنوائی کی۔ "ہمیں اس کو سزا دینا ہوتی تو اس پر مقدمہ چلاتے۔"

"اور یہ خودکشی نہ کرتا تو اس پر مقدمہ ضرور چلتا..." دوسرے نے تائید میں سر ہلا کے کہا۔

"لیکن خودکشی نہ کرتا تو بیچارہ کیا کرتا...." تیسرے نے پھر بات آگے بڑھائی۔ "اپنی محبوبہ کا ذہنی توازن بگڑ جانے سے یہ بہت مایوس اور دل شکستہ تھا...."

"اور اس کی منگیتر کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ اس کے دماغ کا خلل دور نہیں ہو سکتا۔" پہلے نے باری آتے ہی کہا۔

وہ تینوں کسی ڈرامے کے کرداروں کی طرح مسلسل مکالموں کی ادائیگی میں مصروف تھے اور فلپ کو سوال کرنے کا موقع دیے بغیر جوابات فراہم کر دینا چاہتے تھے.... کرنل یورات کسی کامیاب ہدایت کار کی طرح مطمئن کھڑا تھا۔

"یہ واقعہ امریکی سفارت خانے کی حدود میں پیش آیا ہے۔" فلپ نے سکون سے کہا۔ "کرنل یورات.... تم اس وقت امریکی زمین پر کھڑے ہو اور میں اس حکومت کا نمائندہ ہوں .... میں مطالبہ کرتا ہوں کہ سفیرِ محترم کو مطلع کیا جائے۔ تحقیقات ہم خود کریں گے۔"

یورات نے برا سا منہ بنایا مگر یہ بین الاقوامی ضابطوں کی بات تھی جسے ٹالا نہیں جا سکتا تھا.... اس کے جاتے ہی فلپ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا.... قاتل مطمئن تھے کہ انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے مگر فلپ نے نوٹ کر لیا تھا کہ ابھی اس نوجوان میں زندگی کی رمق موجود ہے .... وہ مرنے والا تھا مگر مرا نہیں تھا.... فلپ کو دیکھ کر اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔

"ہیلن .... ہیلن کو.... اسے بتا دینا...." وہ بمشکل تمام بولا۔ اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ فلپ کو جھک کر اپنے کان اس کے لبوں سے لگانے پڑے، تب بھی چند الفاظ ہی اس کی سمجھ میں آئے ...." قلعہ .... زیرِ زمین .... قید .... خانہ ...." وہ خون اگلتے ہوئے بڑبڑایا .... پھر الفاظ لبوں سے پھوٹنے والے لہو کے بلبلے بن گئے اور اس کا سر

Farukh Malik

نیچے جا لگا۔ ۔ ۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی ۔۔۔ فلپ کچھ دیر ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ جب وہ اٹھا تو اسے کرنل یورات نظر آیا جو۔۔۔ اس منظر کو بڑی حقارت آمیز بے رحمی اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"کمانڈر فلپ۔۔۔ کیا اس نے تم سے کوئی بات کی ہے؟" یورات بولا۔۔۔" مرنے سے پہلے اگر کوئی بیان دے تو اس کی صداقت کو قانون بھی چیلنج نہیں کرتا۔۔۔ بشرطیکہ مرنے والے کا ذہنی توازن درست ہو اور جو کچھ اس نے کہا ہو بقائمی ہوش وحواس کہا ہو۔۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے۔۔۔۔" فلپ نے بے اعتنائی سے کہا۔۔۔" مگر مر جانے کے بعد لوگ بیان نہیں دے سکتے۔"

"ویسے بھی اس لڑکی کے عشق اور عشق کے صدمات نے اسے پاگل کر رکھا تھا۔۔۔" یورات بولا۔۔۔" خودکشی دیوانے ہی کرتے ہیں!" یہ بات اس نے جنرل موریل اور امریکی سفیر کو سنانے کے لیے بھی کہی تھی جو اندر سے ایک ساتھ باہر آ گئے تھے۔

"مجھے اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگتی ہے۔۔۔" امریکی سفیر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تم نے اسے میرے ساتھ دیکھا ہوگا۔" موریل نے کہا۔۔۔" یہ میرا ایڈی کانگ تھا۔۔۔ کیپٹن پیڈرو۔۔۔ اس کے گھر والوں کو بڑا دکھ پہنچے گا۔۔۔ وہ پہلے ہی کم پریشان نہ تھے۔۔۔۔ اچھا بھلا لڑکا ایک ایسی لڑکی کے چکر میں پڑ گیا تھا جو پیدائشی طور پر ذہنی مریض ہے!"

فلپ کے لیے جنرل موریل کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرنا ممکن نہیں تھا ورنہ وہ بتا دیتا کہ ہیلن کتنی تعلیم یافتہ ذہین اور باشعور لڑکی ہے اور اس کے ساتھ کتنی خوبصورت شاموں کی یاد وابستہ ہے جب وہ گھنٹوں باتیں کرتے تھے اور ایک دوسرے سے ذہنی مطابقت کے احساس پر شاداں رہتے تھے۔۔۔۔ واقعات کی صحیح تصویر فلپ کے سامنے تھی۔۔۔ ہیلن اپنے باپ کے سیاسی منظر سے یکلخت غائب ہو جانے سے زیادہ اس کی گمشدگی پر پریشان تھی۔۔۔۔ نوجوان ایڈی کانگ کے لیے ایک طرف محبت کی آزمائش تھی تو دوسری طرف فرض شناسی کے تقاضے تھے۔۔۔ جیت بالآخر محبت کی ہوئی تھی مگر اسے اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑا تھا۔

"ہیلن کہاں ہے؟" موریل نے یکلخت سوال کیا۔۔۔" یہ نہ ہو کہ وہ بھی کوئی حماقت کر بیٹھے۔۔۔۔"

"میں دیکھتا ہوں سر۔۔۔" فلپ نے کسی کے جواب دینے سے پہلے کہا اور اندر گھس گیا۔۔۔ زینے کے اوپر ایک خادم دست بستہ کھڑا تھا جس نے فلپ کے پوچھنے پر اسی کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں فلپ نے اپنا سامان رکھا تھا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا لیکن تکیے پر کاغذ کا ایک پرزہ پڑا تھا۔۔۔ پنسل سے چند سطریں گھسیٹنے کے بعد اسے پنسل سے ہی دبا کر رکھ دیا گیا تھا۔ ہیلن نے لکھا تھا۔

"میں یہاں ٹھہرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی، یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میرا باپ اپنے آبائی گاؤں والے گھر میں موجود نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ زندہ ہو لیکن کسی اور جگہ قید ہو۔۔۔ ۔۔۔ خدا کے لیے اس کا سراغ لگانے کے لیے میری مدد کرو۔۔۔۔ تمہیں اس نیکی کا اجر ملے گا۔۔۔۔ ہیلن!"

فلپ نے کاغذ کے پرزے کو سگریٹ لائٹر سے جلا دیا اور اس کی راکھ کو زمین پر اپنے جوتوں سے مسل ڈالا۔

11

سینٹ مارٹن کے قدیم گرجے کا نواحی علاقہ غربت زدہ لوگوں کی بستی تھا۔ ایک گمنام سی گلی کے ایک خستہ حال مکان میں جو باہر سے مقفل اور غیر آباد نظر آتا تھا، دو افراد بند کھڑکی سے لگے کھڑے تھے ان میں سے ایک فلپ تھا جس نے قلعے اور ایوانِ صدر کے گارڈ دستے کے افسر کی وردی پہن رکھی تھی۔ دوسرا وہی ویٹر تھا جس بار میں فلپ کو سات بجے اس جگہ پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ "حالات دن بدن بگڑتے جا رہے ہیں سینور۔۔۔۔" ویٹر نے کہا۔" ملک کے بدنظمی ہے اور انتشار ہے۔۔۔ کسی کی جان و مال اور آبرو کو تحفظ نہیں رہا۔ لوگ ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔۔۔ کیونکہ حکومت کے جاسوس قدم قدم پر بھیس بدلے پھرتے ہیں یہ غدار انعام کے لالچ میں پل پل کی خبر آگے پہنچاتے ہیں۔۔۔ آج دن لوگوں کے دوست رشتے دار غائب ہو جاتے ہیں اور کوئی نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔۔۔۔ جس پر شبہ ہو اسے راتوں رات اٹھا لیا جاتا ہے پولیس اپنی لاعلمی ظاہر کرتی ہے۔ عدالت انصاف کے تقاضے پورے کرے، جب ملک میں قانون کے سرپرست خود ہی لاقانونیت سے دہشت کی فضا قائم کیے ہوئے ہوں۔۔۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ہزاروں لاشیں جلا دی گئی ہیں یا گمنام قبروں میں اکٹھی دفن کر دی گئی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ میں خود اپنے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ کل تک زندہ رہوں گا یا نہیں۔۔۔ کیا خبر یورات کے کسی مخبر خوار نے مجھے یہاں آتے دیکھ لیا ہو۔۔۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔۔۔۔ یورات سب کچھ ہے۔۔۔۔"

"مینوئل۔۔۔۔ یہ سب کچھ ڈان کارلوس کو بدنام کرنے کی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑکانے کی سازش ہے۔" فلپ نے کہا۔۔۔" کرتا سب جنرل موریل ہے مگر الزام کو دیا جاتا ہے۔ حالانکہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ کتنا شریف اور اصول پرست آدمی ہے۔۔۔ وہ اپنے عوام اور اپنے ملک کے مفاد کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔"

Farukh Malik

"یہ بات لوگ بھی سمجھتے ہیں ....." مینوئل نے کہا۔ "ڈان کاروس
یہاں کے عوام میں بے حد مقبول تھا لیکن اب کیا ہو رہا ہے۔ امریکی حکومت
... ہمارے تعلقات اس حد تک کشیدہ ہیں کہ جنگی جہاز ہمارے ساحل
لنگر انداز ہیں ..... ذرا سی چنگاری بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے
کو اڑانے کے لیے کافی ہوگی ..... ہم امن پسند لوگ ہیں
ہمارے چھوٹے سے ملک کا امریکا جیسی طاقت سے کیا مقابلہ ....
ہمارے کھیت بیماری سے تباہ ہو جائیں گے اور ہمارے مویشی مر جائیں گے
ملک میں قحط پڑ جائے گا اور آدمی کو آدمی کھا جائے گا ... بھوک
بیماری یہاں پہلے ہی کم نہیں ہے، جنگ سے ہمیں کیا ملے گا سینور
یہ اقتدار پرستوں کی عیاشی ہے، جس کے متحمل غریب عوام نہیں
سکتے۔"

"اگر میں صرف آدھے گھنٹے کے لیے کاروس سے ملاقات کر
لیتا تو سارے معاملات ٹھیک ہو جاتے۔" فلپ نے کہا۔ "لیکن اب کون
جانے وہ اس ملک میں ہے بھی یا نہیں ....."

"وہ ملک میں ہی ہے سینور ....." مینوئل بولا ... "آخری
بار وہ دو ماہ قبل پبلک کے سامنے آیا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ باہر
جاتا تو مجھے معلوم ہو جاتا ..... ہر جگہ ہمارے مخبر موجود ہیں جو بندرگاہ
اور ہوائی اڈے کی نگرانی دن رات کرتے ہیں۔"

"تم نے اور میرے سب پرانے دوستوں نے جس طرح میری مدد
کی ہے، وہ قابلِ قدر ہے۔" فلپ بولا۔ "خدا کرے ہم سب
کی کوشش بارآور ثابت ہو ..... اگر دونوں ملکوں کے پرانے دوستانہ
روابط کسی خونریزی کے بغیر برقرار رہیں تو بہت اچھا ہے کیونکہ جنگ ہم
نہیں چاہتے ..... میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ڈان کاروس جیسا
معقول آدمی موجودہ تعلقات میں کشیدگی کا ذمے دار ہو سکتا ہے ....
کوئی اس کے نام پر یہ خرابی پھیلا رہا ہے ..... اگر ہم سب
ڈان کاروس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے تو حالات پھر
ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ہم سب خلوصِ نیت کے ساتھ یہی کوشش کر رہے ہیں سینور
کہ کاروس کا پتا مل جائے۔" مینوئل بولا۔ "اب میں اجازت چاہتا
ہوں ... جیسے ہی کوئی کام کی بات معلوم ہوگی میں بتا دوں گا۔"
پہلے حصے کے صحن کی دیوار پھاند کر گلی میں اتر گیا جس میں دور دور
تک کوئی نہیں تھا اور اسٹریٹ لائٹ صرف چاند کی روشنی فراہم کر رہی
تھی۔ فلپ کو اب آخری آدمی کا انتظار تھا۔ تمام پرانے ایجنٹ اپنی
رپورٹیں دے کر اور ہدایات لے کر جا چکے تھے اور فلپ کے لیے یہ بات
اطمینان کا باعث تھی کہ ان سب نے وفاداریوں کے معیار اور پیمان
نبھائے تھے ..... آخر میں آنے والا ایک نوجوان انتونیو تھا جو رشتے
میں مینوئل کا چچا زاد بھائی بھی ہوتا تھا اور وہ سرکاری فوج کا ایک معمولی
سا افسر تھا۔

اسی نے فلپ کے لیے یہ وردی فراہم کی تھی اور اب اسی کی حاصل
کردہ معلومات پر فلپ کی قلعے کے زیرِ زمین زنداں تک رسائی کا انحصار
تھا ..... قلعے کے حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے اور قواعد و ضوابط
اور طریقۂ کار کی پابندی کیے بغیر اندر قدم رکھنا محال تھا مگر انتونیو نے
وعدہ کیا تھا کہ وہ سب معلوم کر کے فلپ کو بتا دے گا۔ آگے فلپ کی
تقدیر ..... اندر داخل ہو جانے کے بعد بھی ہر قدم پر جان لیوا مرحلے
تھے جن سے فلپ کو تنہا ہی گزرنا تھا۔ قلعے کے راستے فلپ کے
ذہن میں تھے اور وہ جانتا تھا کہ زیرِ زمین قید خانے کا راستہ جنوبی
گوشے کے برج سے نیچے جاتا ہے ..... کمرے میں صرف ایک
موم بتی جل رہی تھی لیکن اس کا اجالا بھی باہر نظر نہیں آ سکتا تھا کیونکہ
تمام کھڑکیوں اور دروازوں کے سامنے بھاری سیاہ پردے
پھیلا دیے گئے تھے۔ فلپ ... بے چینی سے کمرے کے اندر ٹہلتا
رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا ..... اس کی نگاہ بار بار گھڑی پر جاتی تھی ...
آخر انتونیو اب تک کیوں نہیں آیا ..... وہ ہمیشہ وقت کی پابندی
کرنے والا شخص تھا مگر اب مقررہ وقت سے پون گھنٹا اوپر ہو چکا
تھا ..... فلپ کو تشویش ہونے لگی تھی اور اس کا ذہن وسوسوں کا شکار
ہو رہا تھا ..... اس نے طے کیا کہ اگر ایک گھنٹے کی تاخیر کے بعد بھی
انتونیو نہ پہنچا تو انتظار بے سود ہوگا، پھر اسے معلوم کرنا پڑے گا کہ
انتونیو کسی آفتِ ناگہانی کا شکار تو نہیں ہو گیا ..... اسی وقت دیوار پر
ایک سایہ سا دکھائی دیا اور مینوئل خاموشی سے اندر اتر آیا ... موم بتی
کی روشنی میں فلپ نے دیکھا کہ اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑا ہوا ہے
"سینور ..... وہ ..... انتونیو ....." اس نے رندھے ہوئے
گلے سے چند الفاظ ادا کیے اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے
لگا ..... وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے رونے کی آواز بلند نہ ہونے پائے۔
"مینوئل ....." فلپ نے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کر لینے
کے بعد مینوئل کے کندھے پر شفقت اور محبت سے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔
"کیا بات ہے ..... کیا ہوا ہے انتونیو کو؟"
"انہوں نے ..... انہوں نے سینور ..... انتونیو کو ..... گولی ..
..... گولی مار دی ہے ....." وہ پھر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔
"تمہیں کیسے معلوم ہوا .....؟" فلپ نے اسے تسلی دے کر

مطالعہ کرنے، امتحان دینے اور یادداشت بڑھانے کیلئے ایک بے حد کارآمد نفسیاتی کتاب۔
امتحان میں کامیابی حاصل کیجیے
قیمت ۱۰ روپے ڈاک خرچ ۵ روپے
مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس نمبر ۹۲۲ کراچی نمبر ۱

چُپ کرانے کے بعد پوچھا۔

"مجھے اس کے ایک دوست نے بتایا ہے کہ وہ اپنے طور پر قلعے کے تہہ خانے کا راستہ دیکھتا پھر رہا تھا۔" مینوئل بولا۔ "اور اس نے کسی پہریدار سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ تہہ خانوں میں کتنے قیدی ہیں اور ان میں کوئی مشہور شخصیت بھی ہے یا نہیں کسی نے اس کی باتیں سن لیں یا خود پہریدار نے بتادیا... وہ قلعے کے صحن سے گزر رہا تھا تو نہ جانے کس نے اسے شوٹ کر دیا۔"

"انتونیو کو یہ باتیں پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟" فلپ نے رنج سے کہا۔

"شاید اس نے سوچا ہوگا کہ وہ اس طرح آپ کو زیادہ کارآمد معلومات فراہم کرسکے گا۔" مینوئل نے کہا۔

ہر نیا اور نو آموز ایجنٹ اگر ضرورت سے زیادہ مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے تو اسی طرح مارا جاتا ہے... فلپ نے افسوس سے سوچا... یہ ناتجربے کار لوگ احکامات کی حد تک پابند رہیں تو اپنے لیے اور دوسروں کے لیے خطرے کی کوئی بات نہ ہو... مگر خطرات اور غیر متوقع حادثات اس پیشے کا ایک جزو تھے، جن سے مفر نہ تھا۔

"اس کے ماں باپ بوڑھے ہیں۔" مینوئل نے دردناک لہجے میں کہا... "اس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔"

"ہم اس کے وارثوں کو جانبازی کا معقول کفارہ ادا کریں گے!" فلپ نے کہا... "تاکہ وہ مالی مشکلات کا شکار نہ ہوں!"

"سینور... کیا آپ واقعی قلعے کے زنداں میں اترنے کا ارادہ رکھتے ہیں...؟" مینوئل نے مطمئن ہوکے کہا۔ "یہ بہت خطرناک کام ہے!"

"اس کے بغیر چارہ نہیں مینوئل۔" فلپ بولا۔ "میرا خیال ہے، اب ہم دونوں کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ الگ الگ راستوں پر روانہ ہوگئے

..... آدھے گھنٹے بعد فلپ قلعے کی بیرونی فصیل کا جائزہ لے رہا تھا۔ ... اس فصیل میں متعدد دروازے تھے، جن پر مسلح پہریدار ہر وقت موجود رہتے تھے، اس کے بعد فصیل کے اندر کی چار دیواری تھی جس میں گزرنے کا صرف ایک راستہ تھا... اندر داخل ہونے والے کو باہر ہی اپنی شناخت کرانے کے علاوہ یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ اس کا تعلق ڈیوٹی پر مامور عملے سے ہے۔ فوج کا عام افسر خواہ اس کا عہدہ کچھ بھی ہو بلا ضرورت اندر داخل ہونے کا مجاز نہ تھا... محافظ ہر روز بدل جاتے تھے اور قلعے کے منتظم ہر صبح ڈیوٹی سنبھالنے والوں کو نیا کوڈ پاس جاری کرتے تھے۔ غیر متعلق اور مبہم الفاظ پر مبنی کوئی جملہ جس سے ظاہر ہو جاتا کہ اندر جانے والا آج ڈیوٹی دینے والوں میں شامل ہے اور گزشتہ ہفتے اگر کسی نے سازباز کرکے قلعے اور زنداں کا بھید پالیا ہو تو وہ نئے کوڈ پاس سے ناواقفیت کے باعث پھر اندر نہ گھس سکے ہر روز نیا کوڈ پاس بتانے سے پہلے نئے محافظوں سے رازداری کا حلف لیا جاتا تھا اور انہیں افشائے راز کے ہولناک نتائج سے آگاہ کردیا جاتا تھا... چنانچہ فلپ کے لیے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ وہ آج کے کوڈ پاس کے الفاظ کیسے معلوم کرے جو انتونیو بتانے والا تھا...

... اگر وہ صلاحیت اور کارکردگی کا غیر معمولی مظاہرہ کرنے کے چکر میں نہ پڑتا تو خود بھی زندہ ہوتا اور فلپ کے لیے کوئی بھی مسئلہ نہ چھوڑ جاتا۔ وہ بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ پہرے پر کھڑے ہوئے ہر سپاہی کے سیلوٹ کا جواب اشارے سے دیتا ہوا چلا گیا جو صرف اس کی وردی دیکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ پہریداروں کو یا حفاظتی انتظامات کو چیک کرنے نکلا ہے... اس نے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چنانچہ ابھی تک کوڈ پاس کے الفاظ دہرانے کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا... وہ مختلف دروازوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے یہ دیکھتا جا رہا تھا کہ کون پہریدار کتنا مستعد ہے اور کس پر آسانی سے قابو پایا جاسکتا ہے۔ ابھی تک اس نے کسی کو غافل نہیں پایا تھا اور آہستہ آہستہ وہ مایوسی کا شکار ہونے لگا تھا۔ شاید اسے اپنے مشن کو التوا میں رکھنا پڑے گا... خطرہ مول لینے میں کوئی ہرج نہیں مگر خودکشی کا کوئی فائدہ نہیں... اچانک اس کی نگاہ نے چھٹے دروازے پر متعین محافظ کو دیکھا... وہ مشین گن کا بوجھ دیوار کے ساتھ رکھے بند دروازے پر ٹیک لگائے سو رہا تھا یا آنکھیں بند کیے کھڑا تھا... غالباً وہ حد سے زیادہ تھکا ہوا تھا... دن میں آرام نہیں کرپایا تھا کہ رات کی ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا تھا یا نشے کا عادی تھا... فلپ نے دبے پاؤں قریب جاکے اس کی مشین گن اٹھالی اور پھر آہستہ سے دستہ اس کے سینے پر مارا... سپاہی نے چونک کر آنکھیں کھولیں ...... اپنی مشین گن ایک افسر کے ہاتھ میں دیکھ کر اس کی سٹی گم ہوگئی۔ ... اس نے بوکھلا کر سیلوٹ کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"یہ ڈیوٹی دے رہے تھے تم؟" فلپ نے سخت لہجے میں کہا اور مشین گن کا رُخ سپاہی کی طرف کیا۔ سپاہی کی گھگھی بندھ گئی ...... خدا کے لیے سر... مجھے معاف کردیں... میں... میں دو دن سے ...... خدا کی قسم میری بیوی بہت سخت بیمار ہے... میں کئی دن کا جاگا ہوا ہوں... مجھ سے غلطی ہوگئی ..."

"اس غلطی کی سزا کیا ہے...؟" فلپ نے نرمی سے کہا... "تمہیں معلوم ہے...؟"

"میں جانتا ہوں سر..." سپاہی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے شوٹ کرسکتے ہیں... آپ رپورٹ کرسکتے ہیں اور کورٹ مارشل کے بعد مجھے سزائے موت ہوسکتی ہے... میں مرگیا تو میری بی

بھی مر جائے گی۔"

"بکواس بند کرو ....." فلپ نے گرج کر کہا ...." یہ اداکاری ہے .... تم نشے میں ہو .... جھوٹ بول رہے ہو۔"

سپاہی نے قسمیں کھانا شروع کیں ....." خدا کی قسم .... یسوع کی قسم میں نے کبھی زندگی میں نشے کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"ابھی معلوم ہو جائے گا ....." فلپ نے طنز آمیز تلخ لہجے میں کہا۔ "آج کا پاس ورڈ یاد ہے تمہیں؟"

"یس .... یس سر .... کیا آخری بس گزر گئی ہے ...." سپاہی نے مستعدی سے کہا ...." میں بالکل نشے میں نہیں ہوں سر!"

فلپ اسے یوں دیکھتا رہا جیسے تذبذب کا شکار ہے۔ سپاہی کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے زیادہ جوش و خروش سے منت سماجت شروع کی کہ اسے بخش دیا جائے .... اپنے دردناک حالات بیان کرتا رہا کہ وہ رحم کا مستحق ہے اور وعدہ کرتا رہا کہ آئندہ اس کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوگا .... بالآخر فلپ نے اسٹین گن اس کے حوالے کر دی۔

"یہ لو ..... آج میں ترس کھا کے تمہیں معاف کر رہا ہوں۔"

فلپ نے دروازہ کھول کر اندر جاتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھو دوسرے افسر اتنے رحمدل نہیں ہوتے ..... وہ چیک کرنے آئیں گے اور تمہیں سوتا دیکھیں گے تو کچھ پوچھے بغیر گولی مار دیں گے۔"

سپاہی نے جان بچنے پر خدا کا شکر ادا کیا اور اس فرشتہ سیرت افسر کے اندر جاتے ہی اسٹین گن لے کر اٹینشن ہو گیا۔ فلپ اطمینان سے اندرونی فصیل کے ساتھ ساتھ چلتا گیا ..... قلعے میں داخل ہونے کا واحد راستہ اب اس کے سامنے تھا اور وہاں باقاعدہ چیک پوسٹ قائم تھی .... دروازے پر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ "کیا آخری بس گزر گئی ہے؟" اس نے بیزار لہجے میں بے نیازی سے کہا .... مختصر کمرے کی کھڑکی میں ایک سپاہی کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

"یس سر ....." سپاہی نے سیلوٹ کے بعد جواب دیا اور مقفل دروازے کو چابی لگا کے کھول دیا .... اندر دائیں بائیں دو اور محافظ کھڑے تھے .... فلپ نے اسی اندازِ بے اعتنائی سے سوال دہرایا، سیلوٹ کا جواب دیا اور آگے چل پڑا۔

یہ اس کے دیکھے بھالے راستے تھے۔ چنانچہ اسے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔ قلعے کی فصیل کے اندر ایک پوری بٹالین موجود تھی .... وسط میں ایک خیمہ نصب تھا اور اردگرد بہت سے فوجی وردیاں پہنے پھر رہے تھے ..... ایک طرف فوجی ٹرک کھڑے تھے جن کے پیچھے فلپ کو بکتر بند گاڑیاں بھی دکھائی دیں، اس تمام ہلچل کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ سب فوجی کسی یلغار کے احکام کے منتظر ہیں ....

جنوبی حصے میں برج کے دروازے پر سرچ لائٹس کی روشنی میں سخت ترین حفاظتی انتظامات کا اندازہ ہوتا تھا چنانچہ اس راستے سے زمین دوز تہہ خانے میں اترنے کی کوشش کرنا حماقت تھی .... فلپ نے قلعے کے اندر سے زنداں میں پہنچنے کا فیصلہ کیا .... وہاں سے گزرا اور ذہن میں موجود نقشے کے مطابق مختلف کمروں اور راہداریوں سے ہوتا ہوا اس دروازے تک آ گیا۔ جہاں سے ایک زینہ قید خانے کی گہرائی تک جاتا تھا .... یہ راستہ تمام لوگوں کے لیے نہیں تھا .... قید خانے کے حکام اور محافظ دوسرا راستہ استعمال کرتے تھے جو صحن میں جنوبی برج سے شروع ہوتا تھا .... ابھی تک کسی نے فلپ کو نہیں ٹوکا تھا۔ قلعے کے اندر مختلف راستوں پر اسے صدارتی عملے کے ارکان .... ویٹر، خادم، صفائی کرنے والے، شوفر اور کچن کے ملازم وغیرہ ملے تھے جو اس کی طرف دیکھے بغیر گزر گئے تھے ..... مسلح فوجی اور سادہ کپڑوں میں پھرنے والے حفاظتی عملے کے ارکان نے فلپ کے پُراعتماد انداز اور اس کی وردی دیکھ کر کسی شبہے کے بغیر سیلوٹ کیا تھا .... ایک بار اس نے سامنے سے کسی سینئر افسر کو آتے دیکھ لیا تھا تو اسے ایک تاریک گوشے میں پناہ لینا پڑی تھی ..... دوسری بار غیر متوقع طور پر ایک بند کمرے سے کوئی معزز صورت شخص نکل آیا تھا مگر اس کے ساتھ ایک عورت تھی اور وہ دونوں نشے میں تھے۔ چنانچہ لڑکھڑاتے، ہنستے وہ چند قدم چل کے دوسرے کمرے میں گھس گئے تھے ....

فلپ جانتا تھا کہ وہ کتنے بڑے خطرے سے دوچار ہے ... اس کے چاروں طرف دشمن تھے اور ذرا سا شک اس کی موت کا سامان بن سکتا تھا مگر ایک بار اس راہِ پُرخطر پر قدم رکھنے کے بعد موت کا خوف خود بخود ختم ہو گیا تھا اور اب فلپ کی تمام ذہنی و جسمانی صلاحیت منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے وقف ہو چکی تھی۔

اس نے دروازے کو آہستہ سے کھولا اور بند کر دیا ... مختصر سے کمرے میں ایک تابوت نما صندوق رکھا تھا جسے دیکھتے ہی فلپ کو خیال آیا کہ یہ ڈان کارلوس کے لیے یہاں لایا گیا ہے .... کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔ بائیں جانب ایک کھڑکی تھی مگر اس کے سامنے پردے پھیلے ہوئے تھے .... ایسے ہی پردے دائیں جانب بھی تھے مگر فلپ جانتا تھا کہ اس کے مقابل کی دیوار کا دروازہ زینے کا راستہ ہے .... ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ آگے قدم بڑھائے یا چھپ کر انتظار کرے کہ اسے کسی کے زینے کے راستے اوپر آنے کی آہٹ سنائی دی .... وہ لپک کر دائیں ہاتھ والے

مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گرانقدر معاوضے پر چراتا ہے

ان چوریوں کی دلچسپ کہانیاں

نک ویلوٹ کی چوریاں

یہ تمام کہانیاں جو ابھی تک لکھی گئی ہیں

قیمت ۱۵/- روپے

ڈاک خرچ ۵/- روپے

کتابیات پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی ۱

دروازے کے پردے کی اوٹ میں ہوگیا..... پردے کی جھری سے اس نے کرنل یورات کو اوپر آتے دیکھا۔ یورات نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے ایک پٹ کھولا اور نیچے جھانک کر دیکھنے کے بعد اطمینان کے اظہار کے طور پر سر ہلایا..... پھر وہ تابوت کی طرف بڑھا۔ اس نے ڈھکنا کھول کے خالی تابوت میں ایک سرسری نظر ڈالی، وہ ڈھکنا بند کر کے سیدھا نہ ہو پایا تھا کہ فلپ پردے کے پیچھے سے نکل آیا۔ کرنل یورات ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور اس کا ہاتھ بے اختیار ریوالور کی طرف بڑھا مگر فلپ نے اُسے آواز تک نکالنے کی مہلت نہ دی..... اس نے دوبار کھڑی ہتھیلی سے بھرپور وار کیا اور یورات ریت کی دیوار کی طرح منہدم ہوگیا..... فلپ نے پردے پھاڑ کے یورات کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھے، ایک کپڑا اس کے منہ میں ٹھونسا اور اسے گھسیٹ کر ایک تاریک گوشے میں ڈال دیا جہاں کسی گزرنے والے کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی کیونکہ اس گوشے کے سامنے لکڑی کی الماری کھڑی تھی جو شاید اسی گوشے میں نصب کرنے کے لیے لائی گئی تھی۔

نیچے جانے والا دروازہ کسی قفل کے بغیر یوں بند تھا جیسے سپاٹ دیوار کا ایک حصہ ہے مگر قدیم شاہی زنداں کے یہ اسرار فلپ پر بہت پہلے کھل چکے تھے۔ اس نے دہلیز کے ایک گوشے میں نظر نہ آنے والے چوکور حصے کو دبایا اور دروازہ کسی آواز کے بغیر شق ہوگیا..... فلپ کے اندر قدم رکھتے ہی اس کے دونوں پٹ جو دیوار میں گھس گئے تھے پھر آپس میں مل گئے۔ فلپ نے زینے کے بعد چکردار ڈھلوان راستے پر چلنا شروع کیا۔ اندر نمی تھی اور دیواروں میں اتنی سیلن تھی کہ سہارا لینے سے ہاتھ گیلے ہوجاتے تھے..... لیکن زمین کی اتنی گہرائی میں بھی گھٹن نہیں تھی..... ایک موڑ پر فلپ نے لوہے کی موٹی سلاخوں والے روشن دان دیکھے جو اس کے سر سے بہت اوپر تھے..... ان میں سے تاروں بھرے آسمان کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ایک اور دروازے سے چھتے تنگاف سے سمندر کی موجوں کا شور صاف سنائی دیتا تھا اور اس کی دیواروں سے ٹکرانے والے پانی کی صدا آتی تھی ..... زنداں کی فضا میں سمندر کی مخصوص بُو بس گئی تھی اور فلپ کو تعجب تھا کہ اس قیدخانے میں جہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں اور ہوا میں اتنی زیادہ رطوبت ہے لوگ کئی سال کیسے زندہ رہ لیتے ہیں۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ اب اس کے کانوں میں قیدیوں کے کراہنے کی آہ و بکا اور ان کی درد بھری اذیت ناک فریاد کی آوازیں آنے لگی تھیں مگر وہ دل کو اس زنداں کی دیواروں کی طرح پتھر کیے چلتا گیا..... اُسے صرف ایک آدمی کی تلاش تھی جس کی رہائی باقی سب اسیروں کی رہائی کی ضمانت بن سکتی تھی ..... وہ ایک آدمی اس زنداں کی کلید تھا اور اس کی زندگی پر سب کی زندگی کا دارومدار تھا۔ فلپ کو یقین تھا کہ موریل نے ڈان کارلوس کو سب سے الگ رکھا ہوگا..... اس لیے نہیں کہ وہ ملک کا صدر تھا۔ بلکہ اسے قیدِ تنہائی کا عذاب دینے اور دوسروں سے بات کر کے ان کے ذہنوں کو مسموم کرنے کا موقع نہ دینے کے لیے ..... راستہ یکلخت ختم ہوگیا اور فلپ نے اپنے مقابل ایک ایسا آہنی دروازہ دیکھا جسے بند کرنے کے لیے چوڑائی کے رخ پر لوہے کی تین پٹیاں سی تھیں..... ہر پٹی کم سے کم آدھا انچ موٹی تھی اور اس کا آخری کنارہ پتھر کی دیوار میں لگے ہوئے ہک سے مل جاتا تھا..... ہر ہک میں کئی پونڈ وزن کا ایک تالا تھا..... فلپ سلاخوں کو تھامے کھڑا رہا..... اس کے لیے سلاخوں کو یا پٹیوں کو کاٹنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا تالوں کو توڑنا ..... زنداں کی تعمیر کرنے والے اناڑی نہیں تھے..... انہوں نے آخری مرحلے کو ناقابلِ تسخیر بنادیا تھا..... مکمل خاموشی میں جسے سمندر کی آواز بھی منتشر نہیں کرتی تھی، فلپ نے کسی کے زیرِلب گفتگو کرنے کی آواز سنی..... کوئی آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہا تھا..... آواز کو پہچان کے فلپ کا دل تیزی سے دھڑکا..... یہ ڈان کارلوس کی آواز تھی جو دعا مانگ رہا تھا..... رفتہ رفتہ الفاظ واضح ہونے لگے..... بوڑھا اور نیک دل کارلوس خدا سے صرف یہ التجا کر رہا تھا کہ اگر اس کی زندگی اس ملک اور عوام کی فلاح وبہبود کے کام آجائے تو اسے یہ حقیر نذرانہ دے کر خوشی ہوگی..... وہ آواز دے کر ڈان کارلوس کو متوجہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے کوئی اس پر توپ کے گولے کی طرح آپڑا..... فلپ حملہ آور کے ساتھ ہی نیچے گرا..... اس کی زندگی خطرات سے کھیلتے گزری تھی جو متوقع بھی ہوتے تھے اور غیر متوقع بھی اور وہ ناگہانی آفات کا مقابلہ اپنی حیوانی جبلت سے کرتا تھا جو وقتِ ضرورت اسے بلا سوچے سمجھے ایک خودکار عمل کے ذریعے مقابلے کی صلاحیت کو بروئے کار لانے کا حوصلہ عطا کردیتی تھی ..... گرتے گرتے بھی اس نے پیچھے کی طرف ایک زبردست دولتی جھاڑی اور حریف کو کراہتے سنا۔ گر کے کروٹ لینے اور گھٹنوں کے بل اٹھ جانے میں اس نے اتنی پھرتی کا مظاہرہ کیا کہ خنجر جو اس کے سینے میں پیوست ہوسکتا تھا وہ اس کی ران کے گوشت کو چھیلتا ہوا گزر گیا..... فلپ نے بائیں ہاتھ سے وار کیا اور ضرب دشمن کے سینے پر پڑی، دشمن لڑکھڑا گیا۔ فلپ کا ہاتھ ریوالور نکال چکا تھا اور نادیدہ دشمن کا نشانہ لینے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ دشمن نے چلّا کر محافظوں کو پکارا اور فلپ نے موریل کی آواز پہچان لی..... پلک جھپکتے میں قیدخانے کی فضا بھاری بوٹوں کی دھمک سے گونجنے لگی ..... فلپ نے ریوالور جیب میں ڈالا اور زقند لگا کے نکل گیا..... مقابلے کا مطلب تھا خودکشی اور وہ موت جس کی خبر اس کے ساتھ ہی اس تہ خانے میں دفن ہوجاتی

لیکن فرار کی کوشش کے کامیاب ہونے کی صورت میں وہ اپنی پہلی کامیابی کے نتائج سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتا تھا.... وہ مشن پر روانہ کرنے والوں کو مطلع کر سکتا تھا کہ ڈان کارلوس کہاں قید ہے.... موریل کو دھمکی دے سکتا تھا کہ ڈان کارلوس کی رہائی کے لیے طاقت کا استعمال بعید از قیاس نہیں اور میلن کو خوشخبری سنا سکتا تھا کہ اس کا باپ زندہ ہے بصورتِ دیگر کسی کو کبھی معلوم نہ ہو پاتا کہ وہ لیفٹیننٹ کمانڈر جو بخیر و عافیت اس ملک کے ساحل پر اترا تھا کسی وجہ کے بغیر کہاں غائب ہو گیا اور کیوں غائب ہو گیا.... وہ اندھیرے میں بے تحاشا بھاگا.... خون کا ایک دھارا اس کی ٹانگ کے زخم سے بہتا جا رہا تھا اور یہ خون اس کے جوتے میں جمع ہو رہا تھا لیکن ابھی زخم کی ٹیس شدید نہیں تھی.... اس کی آنکھیں اب اندھیرے کی اس حد تک عادی ہو گئی تھیں کہ نشیبی راستے کا ہر موڑ دیکھ سکتی تھیں.... موریل ابھی چلا رہا تھا مگر خود فلپ بھی مخالف سمت سے آنے والے محافظوں کو چیخ چیخ کر ہدایات دیتا جا رہا تھا۔ جو دوڑتے دوڑتے لمحہ بھر کے لیے رکتے تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں اپنے سامنے ایک افسر کو دیکھتے تھے اور سیلوٹ کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے تھے.... "میرا منہ مت دیکھو.... آگے جاؤ.... دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے...." فلپ گرج کر کہتا تھا.... "تم سب نااہل ہو..... حرام خور..... وہ تمہارا باپ آخر اندر کیسے گھس گیا...." محافظ بوکھلا کر آگے بھاگتے تھے اور پریشان ہو کے سوچتے تھے کہ نہ جانے ان سے کیا کوتاہی سرزد ہوئی ہے اور اب اس کا کیا خمیازہ بھگتنا ہوگا.... افراتفری کے عالم میں وہ طے نہ کر پاتے تھے کہ آگے جائیں یا پیچھے.... موریل چلا رہا تھا کہ اندھے کے بچو..... تمہارا باپ تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو رہا ہے۔ اسے پکڑو..... وہ پیچھے دیکھتے تھے تو انہیں دوسرا افسر نظر آتا تھا جو گالیاں دیتا انہیں آگے جانے کا حکم دے رہا تھا..... وہ دشمن جسے دونوں طرف سے ان کا باپ کہا جا رہا تھا محافظوں کو کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔

فلپ نے اسپرنگ والا دروازہ کھول کے کمرے میں قدم رکھا پھر دوسرا دروازہ کھول کے باہر آیا تو اسے خطرے سے وقتی طور پر تحفظ کا احساس ہوا مگر وہ پوشیدہ راستوں سے گزرتا گیا اس نے اوپر سے جھانک کر دیکھ لیا تھا کہ کھڑکی کے عین نیچے ایک کار موجود ہے.... یورات نے تابوت والے کمرے کی کھڑکی سے اسی کار کو دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کار کسی خاص مقصد کے لیے لائی گئی تھی.... تابوت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ شاید ڈان کارلوس کو تابوت میں لٹا کر تابوت کو کار میں قلعے سے باہر نکال کے کسی نامعلوم مدفن تک منتقلی کے انتظامات میں کرنل یورات اور جنرل موریل برابر کے شریک تھے شاید اب وہ فوری طور پر اس پروگرام پر عمل درآمد نہ کر سکیں.... ڈان کارلوس کی بیٹی نے سرِعام یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس کے باپ کو قتل کر دیا گیا ہے۔

اب اس کے علاوہ کمانڈر فلپ نے ڈان کارلوس کو قید خانے میں زندہ دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ موریل کے لیے یہ قتل پریشانی کا سبب بن سکتا تھا..... امریکی سفیر کی معرفت امریکی حکومت کارلوس کی پُراسرار گمشدگی پر اظہارِ تشویش کے بعد یہ مطالبہ کر سکتی تھی کہ اگر صدر بیمار ہے تو امریکہ کے ماہرین پر مشتمل ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کو اس کا معائنہ کرنے کی اجازت دی جائے یا اسے اخباری نامہ نگاروں کے سامنے پیش کر کے اس کے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا جائے.... موریل اس بات کو غیر اہم سمجھ کے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ فلپ نے ڈان کارلوس کا سراغ لگا لیا ہے.... اس کے برعکس یہ بھی ممکن تھا کہ جنرل موریل سوچے سمجھے بغیر اور انجام کی پروا کیے بغیر انتہائی قدم اٹھا لے۔ جس کا نتیجہ فوج کشی اور خونریزی کی صورت میں برآمد ہو جو واشنگٹن میں اعلیٰ حکام کے نزدیک ایک مشکل سیاسی صورتِ حال سے نمٹنے کا آخری ناقابلِ قبول اور ناپسندیدہ حل تھا۔

باہر آتے ہی اس نے کار کو اسٹارٹ ہوتے دیکھا.... اس کے سیڑھیوں سے اترتے ہی کار کا اگلا دروازہ کھل گیا اور وہ سیٹ پر گر گیا.... "چلاؤ..... گاڑی چلاؤ...." اس نے اپنا تحکمانہ انداز برقرار رکھا.... "جلدی سے نکل چلو...." ڈرائیور نے سر ہلایا اور نئی طاقتور کار کا انجن کسی وحشی درندے کی طرح غرایا۔ کار ایک جست لگا کے آگے بڑھی.... مگر اسی وقت فلپ نے اپنے سر کے پیچھے کسی سخت اور سرد چیز کا دباؤ محسوس کیا۔

"جلد بازی ہمیشہ بری ہوتی ہے...." کرنل یورات کی آواز آئی۔ ..."جلدی میں تم نے میرے ہاتھ پیر ٹھیک طرح سے نہیں باندھے تھے اور ان پرانے پردوں کا کپڑا بھی زیادہ مضبوط نہیں تھا۔"

فلپ نے سر گھما کے دیکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا.. یورات نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ کار کو گھما کے واپس وہیں لے چلے.... "ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا.... ہو سکتا ہے انہیں ہماری ضرورت محسوس ہو...." یورات نے کہا... مگر کار اتنی دیر میں دروازے تک پہنچ چکی تھی.... فلپ منجمد بیٹھا تھا اور اس کا ایک ہاتھ ابھی تک دروازے کے ہینڈل پر تھا.... فیصلہ کن لمحہ گزرنے والا تھا.... فلپ کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا.... جہاں موت یقینی ہو وہاں زندگی کے ایک فیصد امکان پر جوا نہ کھیلنے میں کوئی ہرج نہیں.... اس نے بلا تذبذب دروازہ کھولا اور کار میں سے باہر لڑھک گیا... یورات کے لیے یہ حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ اسے چونک کر سنبھلنے اور فائر کرنے میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر ہو گئی..... نشانہ خطا گیا اور فلپ نے اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑ لگائی — "دروازہ بند کرو...." وہ گلا پھاڑ کے چیخا۔ ..."اس کار میں ایک قیدی فرار ہو رہا ہے...."

پیچھے آنے والی کار رک گئی تھی اور... گالیاں بکتا کرنل یورات

پچھلے دروازے کو کھول کر باہر آنے کی جدوجہد کر رہا تھا..... دروازے پر موجود گارڈ نے احکامات کی تعمیل میں دروازہ بند کردیا تھا اور اب تین محافظ بندوقیں اٹھائے کار کی جانب لپک رہے تھے۔ فلپ باہر نکل جانے کے باوجود محفوظ نہیں تھا.... وہ جانتا تھا کہ چند منٹ میں محافظوں کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا.... یہ بھی کہ کار میں قیدی نہیں، وزیر داخلہ بنفسِ نفیس موجود ہیں۔ یہ بھی کہ فرار وہ شخص ہوا ہے جس نے فوجی افسر کی وردی پہن کر انہیں بے وقوف بنا دیا تھا اور یہ بھی کہ وہ اس جعلی فوجی افسر کو نہ پکڑ سکے تو کرنل یورات خود انہیں شوٹ کر دے گا.... فلپ اب بیرونی فصیل کے اسی دروازے کی جانب جا رہا تھا، جہاں اس نے پہرے پر سو جانے والے سپاہی کو اس کی نوکری اور زندگی بخش کے زیرِ بارِ احسان کیا تھا۔ شکر گزارانہ انداز میں کیے جانے والے سیلوٹ کا جواب سر کی جنبش سے دینے کے بعد وہ ساحل کی طرف جانے والی سڑک سے ہٹ کر دوڑنے لگا.... اسے اندازہ تھا کہ بحری جہاز سے ساحل تک لانے والی کشتی کہاں لنگر انداز ملے گی مگر یہ فاصلہ کم نہ تھا.... اگر دشمن کے تعاقب میں آنے سے پیشتر وہ کشتی لے کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا تو بحری جہاز تک چند منٹ میں پہنچ سکتا تھا اور کنارے سے گولیاں برسانے والوں کی کامیابی کے امکانات بہت کم رہ جاتے۔ کیونکہ متلاطم سمندر میں رواں کشتی کا نشانہ لینا آسان نہیں ہوتا.... اس کے علاوہ فلپ کے لیے غوطہ مار کے پانی میں نیچے ہی نیچے تیر کر نکل جانا بھی ممکن تھا مگر سر گھما کے دیکھنے سے فلپ کو یقین آگیا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ مسلح محافظ اب بیرونی فصیل کے دوسرے دروازے سے کرنل یورات کی کار میں سوار ہو کر نکلے تھے اور کار طوفانی رفتار سے سڑک پر دوڑتی ہوئی آرہی تھی.... فلپ نے موڑ کاٹا اور چوک سے گزر کر ایک گلی میں گھس گیا..... چند سیکنڈ کے وقفے سے کار کی ہیڈ لائٹس نے گلی روشن کر دی۔ فلپ نے کرنل یورات کے چلانے کی آواز صاف سنی۔

..... اچانک سامنے سے ایک اور کار نمودار ہوئی اور فلپ نے خود کو محصور پا کے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکنا چاہا۔ کار سیدھی گزر گئی.... کار کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں مگر فلپ نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی صورت کو ایک جھلک دیکھ کر شناخت کر لیا..... اندھی کار پوری رفتار سے دوڑتی ہوئی اس کار میں گھس گئی جو فلپ کے تعاقب میں آرہی تھی.... دھماکا اتنا زبردست تھا کہ فلپ رک کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا.... پرانی خستہ حال کار تباہ ہو گئی تھی مگر اس نے یورات کی نئی ڈیو پیجو کار کا حلیہ بھی بگاڑ دیا تھا اور اس کا راستہ روک کر یورات کی کامیابی کو پل بھر میں ناکامی سے دوچار کر دیا تھا ...... تعاقب کرنے والوں کی پیش قدمی رک گئی تھی اور اب وہ اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے مگر فلپ ان کی زد سے نکل چکا تھا... ایک پرانے وفادار دوست مینوئل نے اپنی جان دے کر اس کی جان بچا لی تھی اور حقِ دوستی یوں ادا کیا تھا کہ فلپ کو اپنی زندگی پر شرمندگی ہونے لگی تھی.... مینوئل کے بچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اگر وہ اس ٹکراؤ کے بعد بچ بھی گیا ہوگا تو اس کا جسم گولیوں نے چھلنی کر دیا ہوگا۔

پانچ منٹ بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھا تو اُس نے مینوئل کی آواز سنی..... رات کی خاموشی میں یہ بازگشت بالکل واضح تھی جو اس کے ذہن سے اٹھی تھی..... ابھی چند گھنٹے پہلے ہی مینوئل نے کہا تھا... خود میں اپنے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کل تک زندہ رہوں گا یا نہیں.... اور وہ واقعی صبح کا سورج دیکھنے سے پہلے مر گیا تھا۔

ایڈمرل مینس کا کمرہ مختصر اور زیادہ آراستہ نہیں تھا مگر اس کی سادگی میں نفاست تھی..... وہ تینوں ایک سینٹر ٹیبل کے گرد کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ فلپ کی ران کا زخم سطحی تھا اور مرہم پٹی کے بعد درد کے احساس کو مٹانے والی دوا کے استعمال نے کسی زخم کی موجودگی کا خیال بھی مٹا دیا تھا.... وہ اب پورے اعتماد کے ساتھ اپنی کارگزاری کا خلاصہ پیش کر رہا تھا مگر ایڈمرل اور امریکی سفیر کی صورت پر تذبذب کے آثار تھے۔

"میں تسلیم کرتا ہوں فلپ کہ تم نے فیصلے میں غلطی نہیں کی...." سفیر نے کہا..." لیکن تمہارا فیصلہ اندازے پر مبنی ہے تم نے دیکھا کچھ نہیں.... صرف آوازیں سنی ہیں۔"

"اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ ڈان کارلوس کی آواز تم نے کئی سال بعد سنی تھی۔" ایڈمرل نے کہا۔" وہ بھی ایک قید خانے میں اور خود تمہارے کہنے کے مطابق وہ سرگوشی میں دعا مانگ رہا تھا۔"

"غالباً نقاہت کے باعث وہ اونچا نہیں بول سکتا تھا...." فلپ نے کہا۔

"پھر تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ڈان کارلوس ہی تھا؟" امریکی سفیر نے کہا۔" کیا ثبوت ہے؟"

"مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔" فلپ نے برہمی سے کہا۔ "عرصہ کم یا زیادہ ہونے سے آواز یا لب و لہجہ نہیں بدلتا... اور کئی سال گزر چکے ہیں تو کیا، تم یہ بھی تو ذہن میں رکھو کہ میں نے صدر ڈان کارلوس سے گھنٹوں بہت قریب رہ کر گفتگو کی ہے۔ تین سال تک میں وہ آواز مسلسل سنتا رہا تھا.... اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھ سے اس آواز کی شناخت میں غلطی ہو جائے؟"

"ٹھیک ہے.... مگر ہم کسی ثبوت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے....." سفیر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا..." کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ جنرل موریل نے ڈان کارلوس کو قلعے میں اسیر کر رکھا ہے؟ کوئی شہادت کوئی دستاویز لا سکتے ہو؟"

"لاسکتا ہوں....." فلپ نے چیلنج قبول کرنے کے انداز میں کہا... "مگر تاخیر کا نتیجہ ڈان کاروس کی موت کی صورت میں نکلا تو اس کا ذمے دار کون ہوگا مسٹر؟ موریل اس کی جان لینے کا فیصلہ کرچکا ہے۔"

"موریل کوئی دہشت پسند نہیں ہے" امریکی سفیر نے کہا... "وہ کاروس کے ساتھ بھی نائب صدر تھا اور کسی احمقانہ اقدام کے نتائج کا بخوبی اندازہ کرسکتا ہے..... اس کے خلاف طاقت کے استعمال سے گریز ہماری پالیسی ہے۔"

"یہی پالیسی اس کی حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔" فلپ بولا۔ "تعلقات کی کشیدگی کو بڑھانے کے لیے ہر قدم خود موریل اٹھاتا ہے مگر احکامات پر دستخط کس کے ہوتے ہیں؟ ڈان کاروس کے.... اب امریکی حکومت کے احتجاجی مراسلے کا جواب خود موریل لکھوائے گا مگر یہ جواب امریکی حکومت کو موصول ہوگا تو اس پر ڈان کاروس کے دستخط ہوں گے.... بالآخر امریکی حکومت سے تعلقات کی خرابی اس انتہا کو پہنچ جائے گی جہاں طاقت کے استعمال کے سوا چارہ نہ ہوگا مگر خونریزی کا ذمہ دار کون ٹھہرے گا؟ ڈان کاروس، اس کے اپنے ساتھی۔ اس کے حامی اور ہموطن اس کے خلاف ہوجائیں گے.... موریل اقتدار پر قابض ہوجائے گا اور پھر ڈان کاروس سامنے آیا بھی تو کسی کورٹ مارشل میں غدار اور وطن دشمن کے روپ میں آئے گا.... ظاہر ہے اس کی سزائے موت کا فیصلہ سماعت کے ڈرامے سے قبل ہی کرلیا جائے گا.... کیا امریکی حکومت جانتے بوجھتے ان حقائق سے روگردانی کرسکتی ہے؟"

"کمانڈر فلپ..... یہ تمام صورتِ حال ہمارے سامنے ہے۔" سفیر نے ناگواری سے کہا۔ "میں اس مسئلے کے ہر پہلو پر واشنگٹن کے اعلیٰ حکام سے تفصیلی گفتگو کرچکا ہوں..... سردست ہمارے پاس موریل کے خلاف کوئی الزام نہیں اور ہم یہی کرسکتے ہیں کہ وہ آئینی طور پر اقتدار سنبھالے تو اس کی حیثیت کو تسلیم کرلیں تاکہ کشیدگی اور نہ بڑھے..... طاقت کے استعمال کا ایک منفی ردِعمل بھی ہوسکتا ہے جو زیادہ خطرناک ہے.... ہاں تم ثابت کرسکو کہ موریل نے واقعی ملک کے آئینی صدر کو قید خانے میں ڈال رکھا ہے تو موریل مجرم ہوجاتا ہے..... ہمارے لیے ہی نہیں.... اس ملک کے عوام اور قانون کی نگاہ میں بھی..... اس ثبوت کے بغیر ہم موریل کو مجبور نہیں کرسکتے کہ وہ ڈان کاروس کو امریکی ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رکھے یا اخباری نامہ نگاروں کے سامنے پیش کرے.... یہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت سمجھی جائے گی۔"

فلپ خاموشی سے ہونٹ کاٹتا رہا..... اس کے پاس وہ احکامات تھے جو ہنگامی ضرورت سے نمٹنے کا آخری مؤثر حربہ بن سکتے تھے.... جن کی مدد سے وہ ایڈمرل یا سفیر کو قائل کیے بغیر اپنی مرضی کے مطابق صرف تعمیل پر مجبور کرسکتا تھا مگر اسے ہدایت تھی کہ وہ حتی الامکان ان احکامات سے حاصل ہونے والے اختیارات کو کام میں نہ لائے۔

"میں دستاویزی ثبوت فراہم کروں گا۔" فلپ نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا... "لیکن مجھے تھوڑے سے تعاون کی ضرورت ہوگی..... ایک تو یہ کہ بحری جہاز کو جنوبی ٹاور کے قریب ترین حصے میں لنگر انداز کیا جائے۔ میں آج رات کسی وقت وائرلیس پر جو پیغام دوں، اس پر عمل کیا جائے... ظاہر ہے یہ پیغام گولہ باری شروع کرنے کے لیے نہیں ہوگا... اس کے لیے مجھے ایک پورٹیبل وائرلیس سیٹ فراہم کیا جائے اور ایک کیمرا.... جو اندھیرے میں بھی تصویر اتار سکے۔"

"یہ تعاون کوئی مسئلہ نہیں....." ایڈمرل نے کہا... "جہاز پہلے ہی ساحل سے زیادہ دور نہیں.... اس کا رخ تھوڑا سا بدلنا ہوگا... لیکن اتفاق سے اس وقت ہمارے پاس اندھیرے میں تصویر اتارنے والا کیمرا نہیں ہے... اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین ہے.... وائرلیس سیٹ البتہ مل جائے گا۔"

یہ رات بھی گزشتہ رات کی طرح سنسان اور اندھیری تھی۔ سمندر کے متلاطم سینے پر چیونٹی کی طرح رینگنے والی کشتی قلعے کی جنوبی دیوار کے قریب پہنچتی جارہی تھی.... فلپ نے دوربین کو آنکھوں سے لگا کر دیکھا۔ رات کی سیاہی میں وہ قلعہ یوں نظر آنے لگا جیسے ہر طرف چودھویں کے چاند کا اجالا پھیلا ہو۔ فلپ نے کشتی کا رخ بدلنے کا اشارہ کیا.... کشتی چلانے والا بہت محتاط تھا اور اس کی پوری کوشش تھی کہ چپو چلانے سے پانی میں آواز پیدا نہ ہو.... ایک گھنٹے میں انہوں نے تیسری بار رخ بدل کے جنوبی برج کے سمندر کی جانب کھلنے والے تیسرے روزن کا جائزہ لیا تھا.... ہر روزن میں آدمی کی کلائی سے موٹی آہنی سلاخیں نصب تھیں.... ہر روزن سطحِ سمندر سے بہت اوپر تھا اور ہر روزن سے تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا.... اردگرد کے سمندر میں چٹانیں تھیں چنانچہ کسی کے جنوبی برج سے سمندر میں چھلانگ لگا کر فرار ہونے کا قطعی کوئی امکان نہ تھا۔ فلپ نے ذہن میں وہ نقشہ رکھا جس کے مطابق چل کے وہ گزشتہ شب ڈان کاروس کے قید خانے تک پہنچا تھا.... سمت کا تعین کیا اور کشتی کو ایک چٹان کے قریب روک لینے کا حکم دیا جو برج کے دامن میں تھی۔

چٹان پر قدم جمانے کے بعد اس نے تینوں چیزوں کو سنبھالا جو اس کے گلے میں آویزاں تھیں یعنی کیمرا.... دوربین اور وائرلیس سیٹ۔ پھر اس نے کشتی میں سے رسی طلب کی اور اس کا پھندا بنا کے اوپر کی جانب پھینکا.... چوتھی کوشش میں رسی نے ایک سلاخ کو گرفت میں لے لیا.... فلپ نے اس کی مضبوطی کو آزمایا اور کشتی کو چٹان سے

دور طے شدہ مقام پر لے جانے کی ہدایت دے کر اوپر چڑھ گیا...
"گڈ لک سر!" کشتی کے ملاح نے آہستہ سے کہا اور فلپ کو سرکس کے بازیگر کی طرح قلعے کی پرانی دیوار پر چڑھتے دیکھتا رہا... پھر اس نے کشتی کا رُخ پلٹا اور اسے آہستہ آہستہ کھیتا ہوا سو گز دور لے گیا۔

فلپ نے روشن دان تک پہنچ کے احتیاط سے رسّی کو کمر کے گرد لپیٹا اور اس کے دوسرے سرے کو دوسری سلاخ کے ساتھ یوں باندھ دیا کہ وہ خود ایک جھولے میں روشندان کے سامنے فٹ ہو گیا۔ اس نے دوربین لگا کے دیکھا ... زنداں کے اندر کا پورا منظر اس کے سامنے پھیل گیا ... وہ بالکل ٹھیک جگہ پہنچا تھا... ٹھیک بیس فٹ نیچے وہ راستہ تھا جس کا اختتام ڈان کارلوس کے درِ زنداں پر ہوتا تھا۔ ... اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور انتظار کرنے لگا... اس انتظار کی کوئی حد نہ تھی ... یہ بھی ممکن تھا کہ ساری رات بے مصرف گزر جائے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پوری رات رات کو کسی بھی وقت اسے دستاویزی ثبوت حاصل کرنے کا موقع فراہم کر دے... وہ اپنے انتظامات سے مطمئن تھا اور اب اسے فکر تھی تو صرف یہ کہ کہیں وقت پر کیمرا یا وائرلیس سیٹ جواب نہ دے جائیں ... اس نے دونوں چیزوں کو آزمایا تھا مگر مشینی نظام کبھی اور کہیں سو فیصد قابلِ اعتماد نہیں ہوتا... قید خانے میں اسیروں کی دبی دبی فریاد و فغاں کا ملا جلا شور تھا اور پہریداروں کی آوازیں تھیں جو ایک دوسرے کو "سب ٹھیک ہے" کا سگنل دیتے تھے یا کسی قیدی کو غیر ضروری ہنگامہ آرائی سے روکنے کے لیے گالیوں اور دھمکیوں سے کام لیتے تھے... ڈان کارلوس کی کوٹھری فلپ کے سامنے تھی مگر خود ڈان کارلوس شاید کسی گوشے میں پڑا تھا کہ نظر نہ آتا تھا... فلپ کو اس کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی چنانچہ وہ اس اندیشے کا شکار بھی تھا کہ کہیں گزشتہ رات ہی موریل نے اس کا کام تمام کر کے تابوت کے ذریعے باہر تو نہیں نکال دیا تھا۔ بیک وقت قید سے اور قیدِ حیات سے رہائی کے سوا سابق صدر کے لیے باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

دو گھنٹے بعد اس کی مایوسی یکلخت نئی امید میں ڈھل گئی۔ اس نے موریل کو آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ تین محافظ بھی تھے، جنھوں نے بھاری بھر کم چابیوں سے تینوں تالے کھولے اور پیچھے ہٹ گئے۔

فلپ اب پوری طرح مستعد ہو چکا تھا۔

"بڈھے خبیث ...!" موریل نے کسی دیوار پر لگے ہوئے بٹن کو دبا کے وہ بلب روشن کیا جس کی روشنی لالٹین سے زیادہ نہ تھی ... "تو زندہ ہے ابھی تک ... بہت بے غیرت ہے ... میں نے تجھے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تھی ... کچھ فیصلہ کیا ہے تو نے یا نہیں؟" بائیں ہاتھ کی جانب ڈان کارلوس بالکل مقابل کی دیوار پر زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا... اس کے ہاتھوں اور پیروں کے گرد آہنی حلقے تھے اور ان حلقوں سے پیوست زنجیریں الگ الگ اور مخالف سمت میں جا کے دیوار میں پیوست ہو جاتی تھیں۔

"میں ہر روز یہاں کتّے کی طرح بھونکنے نہیں آتا۔" موریل نے پوری قوت سے ڈان کارلوس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔ اس کی آواز کوٹھری میں پٹاخے کی طرح گونجی ... تصویر اتارنے کی خواہش کو زیادہ مناسب وقت تک ملتوی کرنے کے لیے فلپ کو ضبط سے کام لینا پڑا... "میں آخری بار پوچھ رہا ہوں ڈان کارلوس ...!" موریل کی آواز پھر آئی۔ "کیا تجھے سب کے سامنے خرابیٔ صحت کی بنا پر استعفیٰ دینا منظور ہے؟"

"نمک حرام ... میں ... میں اس طرح ... اس طرح کبھی... ... کبھی مستعفی نہیں ... نہیں ہو سکتا ..." ڈان کارلوس نے بمشکل تمام کہا... موریل نے اس کے منہ پر دوسرا تھپڑ مارا... مگر وہ بولتا رہا... "موریل میں اس ملک کا صدر ہوں ... میں آخری... آخری سانس تک ... عوام کی خدمت ... اپنے ملک کی خدمت.. ... کروں گا ... یا ... جب تک لوگ ... لوگ مجھے خود نہیں ہٹاتے ......"

فلپ نے دیکھا کہ موریل نے میان سے خنجر نکال لیا ہے... اس نے کیمرے کو فوکس کیا اور وائرلیس کو آن کر دیا۔ موریل نے خنجر کی نوک ڈان کارلوس کے سینے پر رکھ دی تھی ... "ڈان کارلوس! ... میں تجھے جینے کا موقع دینا چاہتا تھا"

"کتے ... مجھے اس زندگی ... سے کوئی ... کوئی پیار نہیں ... جو ... کسی ... کسی کے کام ... کام نہ آئے ..." وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

یکلخت موریل کا ہاتھ بلند ہوا... خنجر ڈان کارلوس کے سینے میں اتر گیا ... کیمرے کی فلیش لائٹ نے بروقت اس منظر کو محفوظ کر لیا... اس چکاچوند نے موریل کو دہشت زدہ کر دیا۔ اس کا دوسری بار اٹھنے والا ہاتھ اٹھا رہا ... کیمرے کی روشنی میں یہ منظر بھی ریکارڈ پر آ چکا تھا۔ اسی وقت موریل گلا پھاڑ کے چلایا... "یہ کون ہے..." اس نے محافظوں کو پکارنا شروع کیا... مگر فلپ اس وقت تک وائرلیس پر بحری جہاز سے رابطہ قائم کر چکا تھا... جواب میں چند سیکنڈ بعد جہاز کی خیرہ کن سرچ لائٹس نے جنوبی برج کا احاطہ کر لیا... یہ روشنی ہر روزن سے قید خانے میں داخل ہو گئی ... موریل حواس باختہ ہو کے بھاگا... فلپ نے پھر تصویر اتاری ... رسّی کی گرہ کھولی اور نیچے پھسلنے لگا ... بحری جہاز کی باقی سرچ لائٹس اس کی ہدایات کے مطابق برج کے اوپر پڑ رہی تھیں اور محافظوں کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا... اس تیز روشنی نے ان کو اندھا کر دیا تھا... یوں جیسے بیک وقت ان کے سامنے متعدد سورج طلوع ہو گئے ہوں ... موریل کے احکامات

کی تعمیل میں رنر فائر کر رہے تھے مگر انہیں اپنے نشانے کا علم نہ تھا ۔۔۔ فلپ نے نیچے اتر کر چٹان پر قدم جمائے اور تیرتا ہوا کشتی کی طرف بڑھنے لگا۔

صبح ہونے کو تھی جب بحری جہاز کے ڈارک روم سے فوٹو گرافر نے فلمیں دھونے کے بعد پرنٹ بنا کے پیش کیے، ہر تصویر میں وہ لمحہ تمام درد و کرب کے ساتھ اتر آیا تھا، جب دستِ قاتل نے خنجر سے رشتۂ جسم و جاں منقطع کیا تھا... ہر تصویر زبانِ خنجر بن کے پکارتی تھی کہ کس کی آستین پر کس کا لہو ہے اور ہر تصویر ایک فردِ جرم تھی .... ان منجمد لمحوں کے وجود سے انکار ناممکن تھا جو ڈان کارلوس کی زندگی کی بھینٹ لے کر گزر گئے تھے مگر اپنا نقش چھوڑ گئے تھے کہ سند رہے اور دقتِ ضرورت کام آئے ... ایڈمرل میسن اور امریکی سفیر اس ناقابلِ تردید شہادت پر حیرت زدہ، شرمندہ اور افسردہ بیٹھے تھے۔

"غالباً اب شکوک کے امکانات باقی نہیں رہے ؟" فلپ نے طنز سے کہا ۔" اگر میری شہادت پہلے ہی قبول کر لی جاتی تو تم یقیناً کارلوس کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے .... خیر اب ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ اس قاتل کو منصبِ صدارت پر فائز نہ ہونے دیں "

"ہاں ....." امریکی سفیر نے کہا ..." یہ ہو سکتا ہے .... بلکہ ہونا چاہیے ..... مگر فلپ ..... جنرل موریل مسلح افواج کا کمانڈر انچیف بھی ہے .... اسے عہدے سے ہٹانے کے لیے واحد طریقہ فوج کشی کا ہے ..... وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گا اور فوجی کارروائی سے بہت کشت و خون ہو گا ..... میں اس کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا ..... مجھے واشنگٹن سے احکامات لینے ہوں گے "

"مجھے ڈر تھا کہ سُرخ فیتے کی کارروائی مکمل کیے بغیر تم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے " فلپ نے برہمی سے کہا ۔" حالانکہ وقت بہت کم ہے ... موریل اب صدر ڈان کارلوس کی طبعی موت کا اعلان کر دے گا اور آئینی طور پر وہ خود ہی صدر بن جائے گا ... وہ ڈان کارلوس کے لیے سرکاری سوگ کا اعلان کرے گا اور اس کی آخری رسوم بھی پورے تزک و احتشام سے ادا کی جائیں گی۔ اس وقت ہمارے لیے کچھ کرنا ناممکن ہو گا کیونکہ ایک طرف موریل ثابت کر چکا ہو گا کہ ڈان کارلوس کی غلط پالیسی ملک کو نقصان پہنچا رہی تھی تو دوسری طرف وہ ایک مقبول صدر کے غم میں عوام کی طرح شرکت کا ڈھونگ رچا کے عوام کی حمایت بھی حاصل کر چکا ہو گا .... ہم آخری رسومات کے دوران نہ پوسٹ مارٹم کا مطالبہ کر سکیں گے اور نہ لاش کشی .... انتظار بے سُود ہے ..... "

"ہمارے پاس اس کے سوا کوئی صورت نہیں فلپ " سفیر نے کہا ..." ہم مجبور ہیں "

"اچھا ..... " فلپ نے تصویریں سمیٹ کر اٹھتے ہوئے کہا ..." مگر میں مجبور نہیں ہوں .... میرے پاس ایک صورت اور بھی ہے "

شام کا سورج ڈھلنے لگا تھا کہ مشتعل ہجوم نے ایوانِ صدر کو گھیر لیا .... موریل نے آخری وقت میں جان بچا کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر کچھ لوگوں نے اسے بدلے ہوئے بھیس میں بھی شناخت کر لیا .... وہ اس کے پیچھے دوڑے .... موریل نے گلیوں سے گزر کر بندرگاہ تک پہنچنے کی راہ اختیار کی مگر ہجوم اس کے پیچھے لپکا اور آہستہ آہستہ موریل کے لیے فرار کے تمام راستے بند ہونے لگے .... وہ ساحل تک پہنچا ہی تھا کہ مشتعل ہجوم نے اسے آ لیا۔ اگر اسے چند منٹ کی بھی مہلت مل جاتی تو وہ ساحل پر لنگر انداز تیز رفتار لانچ میں بیٹھ کے فرار ہو جاتا اور اس قاتل ہجوم کی دسترس سے دور چلا جاتا مگر .... ڈان کارلوس کے قتل کا کفارہ ادا کرنے کا وقت آ چکا تھا ... جب بالآخر ہجوم منتشر ہوا تو ساحل پر ایک مسخ شدہ لاش پڑی تھی جس کا حلیہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ اس کی شناخت ناممکن تھی .... ہجوم نے جنرل موریل کی ہڈیوں کا سرمہ کر دیا تھا اور اس کی لاش کا قیمہ بنا دیا تھا .... ہر شخص نے اس کارِ ثواب میں حصہ لیا تھا اور جو مرے کو مارنے کے قائل نہ تھے وہ لاش پر تھوک کر چلے گئے تھے۔

متعدد افراد بحری جہاز کے عرشے پر دوربین لگائے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے تھے.... ان میں ایڈمرل میسن اور سفیر کے علاوہ ہیلن بھی تھی ..... اور فلپ بھی تھا جو سارا دن غائب رہا تھا ... تھکن سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"مبارک ہو سفیرِ محترم ....." اس نے طنز سے کہا ..." آپ کو اعلیٰ حکام سے اجازت نہیں لینا پڑی ... ڈان کارلوس کے وفادار عوام نے خود قاتل سے انتقام لے لیا "

"لیکن فلپ " ہیلن بولی " یہ ہوا کیسے ؟"

"یہاں کے لوگ اگر سیاسی ریشہ دوانیوں کو نہیں سمجھتے تو کیا ہوا" فلپ بولا ..." تصویر کی زبان تو سمجھتے ہیں...." اور تصویر دیکھنے کے بعد کسی تقریر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میں نے ان تصویروں کے پرنٹ بنوائے اور سارے شہر میں بانٹ دیے، ان ہدایات کے ساتھ کہ ان کے اور پرنٹ بنا کے آگے پہنچا دیے جائیں ... تم نے جنگل کی آگ پھیلنے کا محاورہ سنا ہے .... یہ شہر کی آگ تھی، جس نے شام تک پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ... انجام تمہارے سامنے ہے ..... لوگ تو تمہیں آئندہ صدر بھی منتخب کر چکے ہیں۔ نتیجہ بہت جلد سامنے آ جائے گا "

DANGE-

دراڑ

اثر نعمانی

زمین وجائیداد کی چھینا جھپٹی میں لوگ کس طرح ایک دوسرے کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں، یہ عبرتناک تماشا آئے دن ہمارے اردگرد ہوا کرتا ہے. یہ ایسی ایک دوشیزہ کا قصّہ ہے جس کی زندگی کے کئی قیمتی برس اسی کشمکش کی نذر ہوگئے. اس کا ورثہ ہتھیانے کے لیے اس پر کیا کیا ستم نہیں توڑے گئے. اس ماہ کے سرورق کی دوسری کہانی.

نئی حویلی میں رات کا کھانا عموماً ساڑھے آٹھ بجے کھالیا جاتا تھا اور یہ دستور پرانی حویلی سے اب تک جوں کا توں بغیر کسی بڑی تبدیلی کے چلا آرہا تھا۔ اس رات کچھ گرمی زیادہ تھی اس لیے نجمہ کھانے سے فارغ ہوکر حویلی کے باغ میں ٹہلنے چلی گئی لیکن اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ وہاں اکبر اس کی آمد کا منتظر ہے تب وہ یقیناً اپنے کمرے میں جانے کو ترجیح دیتی۔ اکبر اس کے چچا چودھری اصغر علی کا اکلوتا بیٹا تھا اور جاگیردارانہ مزاج اور خصوصیات میں بالکل اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ چودھری اصغر علی کے بارے میں عزیز اور رشتہ دار ہی نہیں پوری جاگیر کے لوگ جانتے تھے کہ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں بڑے رنگین مزاج رہ چکے تھے۔ اسی آوارگی کے باعث ان کے بڑے بھائی چودھری انور علی نے انھیں نہ صرف حویلی بلکہ اپنی جاگیر سے بھی نکال دیا تھا اور یہ جلاوطنی کم و بیش بیس برس کے بعد اس وقت ختم ہوئی جب چودھری انور علی اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

اکبر پچھلے ایک ہفتے سے اس کوشش اور موقع کی تلاش میں تھا کہ اسے کسی طرح نجمہ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل جائے۔ چودھری انور علی کی وفات کے بعد جاگیر ان کے دو بچوں نجمہ اور آصف کی قانونی ملکیت تھی۔ لیکن نجمہ گریجویٹ ہونے کے باوجود لڑکی تھی اور سترہ سالہ آصف ابھی ایف اے کا طالب علم تھا۔ دونوں ہی جاگیر کے نظم و نسق کو بخوبی سنبھالنے سے قاصر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ باپ کے سوئم کے دن جب چودھری اصغر علی نے اچانک حویلی میں آکر آنسو بہاتے ہوئے نجمہ کو اپنے گلے سے لگا لیا تو وہ بھی چچا کی پذیرائی کرنے پر مجبور ہوگئی۔ پھر بظاہر چودھری اصغر علی بھی بہت کچھ بدل گئے تھے۔ انھوں نے داڑھی رکھ لی تھی، نماز پڑھنے لگے تھے، بیوی کو گھر میں آباد کرلیا تھا۔ پرانے وفاداروں نے بھی نجمہ کو یہی رائے دی کہ اس وقت جاگیر کو سنبھالنے کے لیے چودھری اصغر علی کی موجودگی ضروری ہے اور جب چھوٹے چودھری آئے تو ان کی بیوی اور اکلوتا بیٹا اکبر کہاں جاتے، وہ بھی حویلی میں ہی آباد ہوگئے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ چودھری اصغر نے ابھی تک جاگیر کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال رکھا تھا۔

نجمہ ٹہلتی ہوئی باغ میں داخل ہوئی تو اسے گمان بھی نہ تھا کہ وہاں اکبر اس کی تاک میں بیٹھا ہے۔ وہ اکبر کی آوارہ مزاجی ... خود کو دوسروں پر بڑی بے غیرتی کے ساتھ مسلّط کرنے کی ... سے عاجز تھی اور اس کے دل میں اپنے چچازاد بھائی کے لیے ... بڑھتی جارہی تھی مگر وہ اسے اس لیے برداشت کرلیتی تھی کہ ...


POIS

علی صاحب کو بُرا نہ لگے۔ جاگیر کا انتظام ہاتھ میں لینے کے بعد سے وہ اندر باہر ہر چیز پر حاوی ہو گئے تھے۔ بلاشبہ وہ اپنی حیثیت یاد رکھتے تھے۔ ہر ضروری بات میں نجمہ سے مشورہ کرتے تھے مگر نجمہ کبھی کبھی سوچنے لگتی تھی کہ اپنے چچا کو حویلی میں جگہ دے کر جاگیر کا منتظم بنا کر اس نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟

باغ میں رات کی رانی کی خوشبو سے مہکتی ہوئی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بہت خوشگوار لگ رہے تھے۔ نجمہ پندرہ بیس منٹ تک ٹہلتی رہی اور پھر پھولوں کے ایک کنج میں سبزے پر لیٹ گئی۔ اکبر نے یہاں بھی ہوشیاری سے کام لیا۔ وہ نجمہ کے باغ میں قدم رکھتے ہی سامنے نہیں آگیا، بلکہ انتظار کرتا رہا کہ نجمہ ٹہلنے سے تھک کر کہیں بیٹھ جائے۔ وہ آتے ہی اس کا راستہ روکتا تو قوی امکان تھا کہ نجمہ وہیں سے حویلی میں واپس لوٹ جاتی۔ اس نے نجمہ کو بیٹھتے دیکھا تو چند لمحہ توقف کے بعد بڑے اطمینان سے کنج کی طرف بڑھنے لگا۔

قدموں کی آہٹ سنی تو نجمہ نے چونک کر نگاہ اٹھائی۔ باغ میں روشنی کا انتظام گھر کی طرح تو نہ تھا پھر بھی محرابی دروازے پر لگے ہوئے بلب کی روشنی اتنی کافی تھی کہ اس نے دور ہی سے اکبر کو آتے دیکھ لیا اور ایک احساسِ ناگواری کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اکبر کو کھانے کی میز سے غائب پا کر اس نے یہی سوچا تھا کہ اکبر اپنے آوارہ گرد دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا ہے اور اب رات کے گیارہ بجے سے پہلے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔

”میں اس وقت خدا سے کچھ اور بھی مانگ لیتا تو مل جاتا۔“ اکبر نے مسکرا کر قریب آتے ہوئے کہا۔ ”پتا ہے، میں یہی دعائیں کرتا آرہا تھا کہ خدا کرے تم مجھے باغ میں مل جاؤ۔“

”صبح سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔“ نجمہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”دن بھر دھڑکا لگا رہا کہ خدا جانے کیا مصیبت آنے والی ہے۔ شام ہوئی تو قدرے اطمینان ہوا کہ شاید آفت ٹل گئی۔ خاص طور سے اس لیے کہ آپ بھی گھر میں موجود نہیں تھے۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ بُری گھڑی سے مفر نہیں، وہ کسی وقت بھی آسکتی ہے۔“

”آج تم کچھ بھی کہہ لو، میں بُرا نہیں مانوں گا۔“ اکبر ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

”کیوں، آج کیا خاص بات ہے؟“

”میں تم سے ایک نہایت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔“ اکبر نے کہا۔ ”اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں؟“

”ضرور بیٹھیے مگر پانچ گز کے فاصلہ پر۔“ نجمہ نے جواب دیا۔ ”اور اس طرح کہ ہوا آپ کو چھو کر مجھ تک نہ پہنچے۔“

”اتنی دور بیٹھوں گا تو بات کیسے کروں گا؟“ اکبر نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تو مت کیجیے۔“

”واہ — پھر فیصلہ کیسے ہوگا؟“

”کیسا فیصلہ؟“ نجمہ کچھ چونکی۔

”میرے اور تمہارے مستقبل کا۔“ اکبر نے سنجیدہ ہونے کی کوشش کی۔ ”دیکھو نجمہ! میں جانتا ہوں کہ تم ایک بڑی جاگیر کی مالک ہو، مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی ہو لیکن محبت کسی اونچ نیچ، کسی امتیاز کو نہیں مانتی۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں، تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ہمارے خاندان میں میرے علاوہ کوئی اور لڑکا تمہارے قابل نہیں ہے اور اگر تم نے خاندان سے باہر شادی کی تو یہ وسیع جاگیر ہمارے خاندان سے نکل کر غیروں کی ملکیت بن جائے گی۔ اس جاگیر کو قائم رکھنے کے لیے ہی ہماری خاندانی روایت یہ رہی ہے کہ جاگیر کا مالک بڑا لڑکا ہوتا ہے اور اس کی شادی خاندان میں کی جاتی ہے۔ یہاں اتفاق سے تم بڑی ہو اور آصف چھوٹا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ایسی صورت میں قانونی پوزیشن کیا ہے لیکن تم مجھ سے شادی کر لو تو کوئی الجھن یا مشکل پیش نہیں آسکتی۔“

”میں اس موضوع پر آپ سے کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتی تھی۔“ نجمہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔ ”لیکن آپ نے بات چھیڑ دی ہے تو جواب دینا ضروری ہو گیا ہے تاکہ آپ کو اگر کوئی غلط فہمی ہے تو دور ہو جائے۔ میں اپنی یا آصف کی شادی کے معاملے کو جاگیردارانہ مصلحتوں سے الگ رکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہوا تو میں آصف کے حق میں یا آصف میرے حق میں جاگیر سے دستبردار ہو سکتا ہے۔ اس لیے آپ جاگیر کی فکر میں دُبلے نہ ہوں۔ رہا آپ کی پیش کش کا جواب۔ تو میں اس حیثیت سے آپ کو پسند نہیں کر سکتی۔ آپ میرے چچا زاد بھائی ہیں اور میرا مشورہ ہے کہ بس اسی رشتے پر قناعت کریں۔“

”کیا اس لیے کہ دوسرے رشتے کے لیے تم نے کسی اور کو پسند کر لیا ہے؟“ اکبر کے لہجے میں طنز تھا۔

”ایسا ہی سمجھ لیں۔“ نجمہ نے بے پروائی سے کہا۔

”کیا میں اس خوش نصیب کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“

”جی نہیں۔“ نجمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اپنے نجی معاملات میں کسی کو بھی مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتی۔“

”تم کیا سمجھتی ہو کہ دوسرے تمام لوگ اندھے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

"یہ کہ تمھارے بتائے بغیر بھی میں جانتا ہوں کہ وہ کون ہے۔" اکبر نے جواب دیا۔ "اور مجھے تمھاری حماقت پر ترس آتا ہے۔ اس شاخ پر آشیانہ بنانا چاہتی ہو جہاں پہلے ہی کسی نے گھونسلا بنا رکھا ہے۔"

"میں نہیں جانتی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" نجمہ اٹھنے لگی۔ "اور نہ ہی جاننا چاہتی ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ۔" اکبر نے درشت لہجے میں کہا۔ "آج تم میری پوری بات سنے بغیر نہیں جاسکتیں۔"

اپنی تمام حوصلہ مندی کے باوجود نجمہ ایک لڑکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اکبر ایک آوارہ مزاج اوباش نوجوان ہے اور وہ اس وقت باغ میں اس کے ساتھ تنہا بیٹھی ہے۔ اس نے اکبر کے انداز اور لہجے میں کوئی ایسی ہی بات محسوس کی کہ وہ کچھ سہم کر بیٹھ گئی۔

"تمھارا بچپن آفتاب کے ساتھ کھیلتے گزرا ہے۔" اکبر نے پھر کہا۔ "اس ساتھ کی بنیاد پر تمھیں یہ خوش فہمی ہے کہ اگر تم اسے پسند کرتی ہو تو وہ بھی تمھیں چاہتا ہے۔ بچپن اور لڑکپن کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس وقت میں یہاں موجود نہیں تھا۔ مگر پچھلے دو تین برسوں میں جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا ہے اس کی بنیاد پر یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ آفتاب کو یونیورسٹی میں پڑھنے والی ایک لڑکی عزالہ سے محبت ہے۔ وہ دونوں ہر جگہ ہمیشہ ساتھ ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ عزالہ بھی ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے، شہر میں رہتی ہے۔ اس کے والدین آفتاب کو جانتے ہیں۔ اس کا ان کے گھر میں آنا جانا ہے۔ ممکن ہے پہلے کبھی بچپن میں آفتاب تم سے کچھ دلچسپی رکھتا ہو۔ لیکن جب سے وہ یونیورسٹی میں پڑھنے لگا ہے اور وہیں شہر میں، ہوسٹل میں رہتا ہے، تم اس کے دل و دماغ سے قطعی طور پر نکل چکی ہو۔"

"میں اس بکواس کے ایک لفظ پر بھی یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" نجمہ غصّے اور جوش میں کھڑی ہوگئی۔

"مت کرو۔ مگر یہ حقیقت ہے۔" اکبر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمھیں اس دن ہوش آئے گا جب آفتاب تمھیں ٹھکرا کر عزالہ سے شادی کرے گا۔ اس کے علاوہ تم ایک اور اہم بات بھی بھول رہی ہو۔"

"وہ کیا؟"

"سعیدہ پھوپھی کو بزرگوں نے خاندان سے باہر نکال دیا تھا کیونکہ انھوں نے والدین کے طے کردہ رشتے کو مسترد کر کے اپنی پسند سے شادی کر لی تھی۔ یہ سچ ہے کہ جب ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا تو تایا ابا... تمھارے ابّو، عزیزوں کی مرضی کے بغیر انھیں گاؤں لے آئے۔ حویلی کے قریب ان کے رہنے کے لیے مکان بنوا دیا۔ ان کی اور ان کے اکلوتے بیٹے آفتاب کی ہر طرح سرپرستی کی اور آج آفتاب ان کی مہربانیوں کے طفیل علم کی سیڑھی پر اتنی بلندی تک جا پہنچا ہے مگر ان تمام باتوں کے باوجود نہ خاندان والوں نے سعیدہ پھوپھی کو معاف کیا ہے اور نہ پھوپھی اپنے دل کے زخموں کو بھول سکی ہیں انھیں تو یہ بھی شبہ ہے کہ پھوپھا کی موت حادثہ نہیں تھی بلکہ اس میں کچھ خاندان والوں کا ہاتھ تھا۔ ایسی صورت میں نہ وہ اپنے بیٹے کی شادی خاندان میں کرنا چاہیں گی اور نہ خاندان والے ایسی کسی شادی کو برداشت کریں گے، خواہ وہ جاگیردار کے گھر میں ہی کیوں نہ ہو۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو میرے مستقبل کے بارے میں اتنی فکر ہے۔" نجمہ نے بڑے طنز سے کہا۔

"مجھے نہیں ہوگی تو اور کسے ہوگی؟" اکبر مسکرایا۔ "آخر میں تمھارے چچا کا بیٹا ہوں۔ میں تمھیں اور جاگیر کو برباد ہوتے دیکھ سکتا ہوں اور نہ غیروں کے قبضے میں جاتے ہوئے۔"

"میرا نام لینے کا تکلف کیوں کر رہے ہو۔" نجمہ کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔ "صرف جاگیر کیوں نہیں کہتے؟"

"تم اسے جو چاہو سمجھو۔ لیکن حقائق جاننے کے بعد ٹھنڈے دل سے غور کروگی تو تمھیں اس سے بہتر کوئی اور حل نظر نہیں آئے گا جس کی پیشکش میں ابھی کر چکا ہوں۔"

"اچھی بات ہے تو پھر میرے دل کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کیجیے۔" نجمہ نے کہا اور آگے چل دی۔

"ضرور، ضرور۔" اکبر خوش ہوگیا۔ "کب تک ٹھنڈا ہو جائے گا؟"

"جب اس میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہے گی۔" نجمہ نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

اکبر کے چہرے سے غصّے کی سرخی نمودار ہونے لگی۔ وہ قدم بڑھا کر نجمہ کے قریب پہنچ گیا۔ "کیا میں یہ سمجھوں کہ میرے اس قدر سمجھانے کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا؟" وہ بولا۔

"اتنی دیر میں آپ نے ایک یہی عقلمندی کی بات کی ہے۔"

نجمہ محرابی دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔ سامنے حویلی کی عمارت نظر آرہی تھی۔ ارادے کے باوجود اکبر اسے یہاں زبردستی روکنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چند قدم تیزی سے آگے بڑھا مگر پھر رک گیا اور غصّے کے عالم میں مٹھیاں بھینچ کر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

نجمہ نے اس وقت تو اکبر کی باتوں کو بے پروائی ظاہر کر کے ٹال دیا تھا مگر دل ہی دل میں وہ محسوس کر رہی تھی کہ اکبر تمام

FarrukhMalik

تر غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ جب سے آفتاب نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا وہ خود بھی اس کے طرزِ عمل میں ایک انجانی سی تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ وہ اور آفتاب بچپن کے ساتھی تھے۔ ایک ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ ہر چند ان کے درمیان کبھی پسند و ناپسند کے موضوع پر بات نہیں ہوئی تھی مگر نجمہ کا خیال تھا کہ آفتاب اس کے ساتھ ایک خاص انسیت رکھتا ہے۔ ایسی چاہت جو رشتے کے بہن بھائی کی محبت سے الگ تھی مگر جہاں محبت ہوتی ہے وہاں شک و شبہ بھی ہوتا ہے۔ اب سے پہلے نجمہ نے کبھی اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب اکبر کی باتوں کی روشنی میں اس نے گزشتہ دو تین برس کے اندر آفتاب کے طرزِ عمل کا تجزیہ کیا تو اس کے ذہن نے ایسی کئی مثالیں پیش کر دیں جہاں آفتاب کا وہ سلوک نہیں رہا تھا جس کی نجمہ اس سے توقع رکھتی تھی اور جب اس نے یہ سب کچھ سوچا تو آپ ہی آپ دل میں یہ شبہ پیدا ہونے لگا کہ اپنی تمام چھوٹی سچی باتوں کے باوجود اکبر کہیں اس بارے میں سچ ہی تو نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کی تصدیق یا تردید صرف آفتاب ہی کر سکتا تھا۔

چنانچہ نجمہ نے فیصلہ کر لیا کہ اس مرتبہ جب وہ چھٹیوں میں حویلی آئے گا تو اس سے اس موضوع پر ضرور بات کرے گی۔ خواہ اسے اس کی بے شرمی ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔ عیدِ قرباں قریب ہی تھی اس لیے یہ موقع بھی جلد ہی آ گیا۔ آفتاب عید گزارنے گاؤں آیا اور حسبِ عادت نجمہ سے اسی خلوص اور بے تکلفی کے ساتھ ملا جس طرح اب تک ملتا چلا آیا تھا۔ وہ اس کے لیے ایک خوب صورت ہار اور چوڑیوں کا تحفہ بھی ساتھ لایا تھا۔

"یہ میری طرف سے تمہارے لیے عید کا تحفہ۔" اس نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔" نجمہ نے ہار اور چوڑیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ "کتنے دن کے لیے آئے ہیں؟"

"بس یہی کوئی چار پانچ دن کے لیے۔"

"جب سے آپ یونیورسٹی میں گئے ہیں آپ نے یہاں آنا کم نہیں کر دیا ہے؟"

"کیا واقعی! میں نے کبھی خیال نہیں کیا۔"

"شاید اس لیے کہ اب آپ کا دل شہر میں زیادہ لگنے لگا ہے۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" آفتاب مسکرایا۔ "ہاں یہ ضرور ہے کہ اس مرتبہ میں پہلے سے زیادہ محنت کر رہا ہوں۔ میری کوشش ہے کہ اس بار میں ٹاپ کروں تاکہ مجھے مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کا موقع مع وظیفہ مل جائے۔"

"جتنا آپ پڑھ چکے ہیں، کیا وہ کافی نہیں ہے؟"

"میں نے جو خواب دیکھے ہیں ان کے اعتبار سے ناکافی ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں نے اور امی نے بڑی عسرت میں زندگی گزاری ہے اور یہ سب اس لیے کہ امی نے بڑی جرأت سے آزادیٔ رائے کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں اس رویّہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو خاندان والوں نے اب تک ہمارے ساتھ روا رکھا ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن میں اس شان سے گاؤں میں داخل ہوں کہ یہی سب لوگ میری اور میری امی کی عزت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔"

"آپ نے شاید کبھی غور نہیں کیا۔" نجمہ دوسری جانب منہ پھیر کر بولی۔ "ورنہ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے دوسرے طریقے بھی ہیں۔"

"ہو سکتے ہیں۔" آفتاب نے جواب دیا۔ "مگر میں اپنے دست و بازو سے اپنا مقام بنانا پسند کرتا ہوں۔"

وہ دونوں اس وقت باغ میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ نجمہ کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ اس نے آصف کو آتے دیکھا۔

"چچا جان آپ کو کھانے کے لیے بلا رہے ہیں۔" اس نے آتے ہی کہا۔

"اچھا۔ تم چلو، ہم ابھی آ رہے ہیں۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"جلدی آئیں، مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" آصف نے واپس جاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے ایک ضروری مسئلے پر بات کرنا چاہتی تھی۔" اس کے دور چلے جانے پر نجمہ بولی۔ "آج شام کو آ ہیں؟ کل سے تو عید کا ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔"

"مجھے بھی تم سے کچھ اہم گفتگو کرنا تھی۔" آفتاب سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر شاید یہ آج شام ممکن نہ ہو"

"وہ کیوں؟"

"میں امی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتا ہوں۔ ان صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے۔"

"احمد پور تک ہی تو جانا ہے۔" نجمہ نے کہا۔ "آپ کو جا کر مغرب تک واپس آ سکتے ہیں۔"

"کوشش کروں گا، وعدہ نہیں کر سکتا۔" آفتاب اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم حویلی کی جانب لگے۔ نجمہ پہلے سے کچھ زیادہ مطمئن تھی۔ اس کے لیے یہ بات خوش آئند تھی کہ آفتاب بھی کسی اہم موضوع پر اس سے بات کر

چاہتا ہے اور حالات کو دیکھتے ہوئے وہ موضوع ان دونوں کے مستقبل کے علاوہ اور کیا ہوسکتا تھا؟

مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد نجمہ اپنی لائبریری میں چلی گئی۔ اسے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا اور کسی خاص موضوع یا قسم کی تخصیص کے بغیر اپنے علم اور جنرل نالج میں اضافے کے لیے وہ ہر نوعیت کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی، اس لیے جس کتاب کے بارے میں سنتی یا پڑھتی شہر سے منگوا لیا کرتی تھی۔ یوں رفتہ رفتہ اس کے پاس کتابوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ جب وہ سیکڑوں سے تجاوز کر گئیں تو اس نے حویلی کا ایک چھوٹا کمرہ خالی کر کے اسے لائبریری کی شکل دے دی اور الماریاں بنوا کر تمام کتابوں کو موضوع کے اعتبار سے یکجا کر کے ان الماریوں میں سجا دیا۔

اس کا دل تو باغ میں جانے کو چاہ رہا تھا تاکہ وہ اپنے پسندیدہ رات کی رانی کے کنج میں بیٹھ کر آفتاب سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں سوچ سکے اور نہ صرف اس سے تنہائی میں ایسے نازک مسئلہ پر بات کرنے کا حوصلہ پیدا کرے بلکہ یہ بھی سوچے کہ اپنے شبہات دور کرنے کے لیے اسے آفتاب سے کس قسم کے سوالات کس انداز میں کرنا چاہئیں کہ وہ بُرا مانے بغیر جواب دے سکے۔ لیکن اسے اندیشہ تھا کہ اکبر جو اس کے گرد و پیش منڈلاتا رہتا تھا کہیں باغ میں نہ آجائے۔ آفتاب کے بارے میں نہ جانے کیوں اسے یہ یقین تھا کہ وہ اگر ملنے آئے گا تو رات کے کھانے کے بعد ہی نو دس بجے تک آئے گا۔ چنانچہ وہ لائبریری میں آ گئی۔ دوسروں کو بظاہر مصروف نظر آنے کے لیے اس نے افسانوں کی ایک کتاب نکال لی اور آرام کرسی پہ کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔ اگرچہ اس کا ذہن کتاب کا کوئی افسانہ نہیں بلکہ آنے والے دنوں کی داستان پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ابھی اسے بیٹھے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ کمرے میں ایک سات آٹھ سالہ لڑکی داخل ہوئی۔ آہٹ سن کر نجمہ نے چونکتے ہوئے نگاہ اٹھائی اور لڑکی کو پہچان لیا۔ وہ ہاجراں تھی جو گاؤں کے دوسرے بچوں کے ساتھ صبح کے وقت اس سے قرآن شریف پڑھنے آتی تھی۔

"کیا بات ہے ہاجراں؟" نجمہ نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔

"ماسٹر جی نے یہ کاغذ دیا ہے کہ آپ کو دے دوں۔" ہاجراں نے جواب دیا۔

آفتاب یونیورسٹی جانے سے قبل کئی ماہ تک گاؤں کے پرائمری اسکول میں اعزازی طور سے پڑھاتا رہا تھا اس لیے گاؤں کے تمام بچے اسے ماسٹر جی کہنے لگے تھے۔ نجمہ کو کچھ حیرت تو ہوئی، وہ آفتاب کو محبت بھرے خطوط لکھنے والے نوجوانوں میں شمار نہیں کرتی تھی اور نہ ہی کبھی آج تک ان دونوں میں کسی قسم کی خط و کتابت ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے ہاتھ بڑھا کر ہاجراں سے خط لے لیا۔ ہاجراں خط دیتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی جیسے اسے ڈر ہو کہ اب ایک لمحہ بھی ٹھہری تو استانی جی اسے ڈانٹ دیں گی۔

نجمہ نے تیز ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ لفافے میں سے خط نکالا۔ لفافہ بند نہیں تھا۔ خط جس کاغذ پر لکھا گیا تھا، نجمہ اسے پہچانتی تھی۔ وہ اس قسم کے رائٹنگ پیڈ آفتاب کے پاس دیکھ چکی تھی۔ اس نے خط کی تہہ کھولی لکھا تھا۔

"ڈیئر نجمہ!

میں تم سے جس موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے حویلی میں کوئی بھی جگہ مناسب نہیں ہے۔ وہاں ہر وقت کوئی آسکتا ہے۔ خاص طور سے اکبر جو تمہارے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ اس لیے میں نے طے کیا ہے کہ ہماری اس یادگار ملاقات کے لیے پرانی حویلی کی شکستہ عمارت سے زیادہ موزوں کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی چنانچہ تم آج رات بارہ بجے کے بعد پرانی حویلی آجانا۔ میں بڑی بے تابی سے تمہارا انتظار کروں گا۔

مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔

تمہارا بچپن کا ساتھی۔

تاکید ہے کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد پھاڑ دینا۔"

خط کے آخر تک پہنچتے پہنچتے نجمہ کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہوگئی تھی کہ اس کے خیال میں، اگر اس وقت وہاں کوئی اور بھی موجود ہوتا تو ضرور سن لیتا۔ نجمہ نے خط کو بار بار پڑھا اور ہر مرتبہ ایک عجیب سے نشے نے اسے سرشار کر دیا۔ ہر چند یہ کوئی محبت



نامہ نہیں تھا اور نہ خط کے کسی بھی فقرے میں اظہارِ محبت کیا گیا تھا مگر خط کی عبارت پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ عنقریب ہونے والی ملاقات میں آفتاب اس سے کیا کہنے والا ہے؟

اس نے خط کو تہہ کر کے لفافے میں رکھا اور اسے ضائع کرنے کی تاکید کے باوجود وہ لفافہ ایک موٹی سی کتاب کے اندر محفوظ کر دیا۔ یہ اس کے خوابوں میں بسے ہوئے خوشگوار مستقبل کی پہلی جھلک تھی۔ وہ اسے کس دل سے ضائع کرتی۔ جہاں تک اس کے نصف شب کے بعد پرانی حویلی جانے کا تعلق تھا تو اس میں کوئی سوچنے والی بات تھی ہی نہیں۔ اسے ہر صورت میں جانا تھا کیونکہ بُلانے والا آفتاب تھا۔

پرانی حویلی گاؤں کے ندی کنارے پر واقع تھی۔ نئی حویلی سے اس کا فاصلہ کم و بیش ایک میل تھا۔ نصف صدی قبل گاؤں کے قریب بہنے والے دریا میں شدید سیلاب آیا۔ اس سیلاب کی وجہ سے گاؤں کے کچے مکان ہی تباہ نہیں ہوئے بلکہ قدیم سالخوردہ حویلی کا بیشتر حصّہ بھی زمیں بوس ہو گیا۔ باڑھ اترنے کے بعد اس وقت کے جاگیردار نے نہ صرف گاؤں کو تقریباً ایک میل ہٹ کر آباد کرنے کا حکم دیا بلکہ قدیم حویلی چھوڑ کر نئی حویلی تعمیر کرائی۔ پرانی حویلی کے بارے میں ان کا ارادہ تھا کہ اس کی شکستہ عمارت کو گرا کر وہاں ایک سیکنڈری اسکول بنوا دیں جو نہ صرف اس گاؤں بلکہ آس پاس کے دیہات کے لیے بھی علم کے ایک سرچشمے کا کام کرے مگر ان کے انتقال سے یہ منصوبہ سردخانے میں چلا گیا۔ بعد میں آنے والے جاگیرداروں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی اور قدیم حویلی کی عمارت رفتہ رفتہ ایک کھنڈر بن گئی اور پھر جیسا کہ ایسی عمارتوں کے بارے میں ہوتا ہے، گاؤں والوں نے اس سے بھوتوں، چڑیلوں کی داستانیں منسوب کرنا شروع کر دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ رات تو رات، دن کے وقت بھی پرانی حویلی کا رُخ نہیں کرتے تھے۔

نجمہ رات کے ٹھیک بارہ بجے ایک چادر اوڑھ کر حویلی سے باہر نکل آئی۔ اسے ایک ایسا راستہ معلوم تھا جس سے پرانی حویلی کا فاصلہ نصف میل کے قریب رہ جاتا تھا۔ مگر اس کے باوجود رات کے وقت قدیم حویلی میں جانا بڑی ہمت کا کام تھا۔ نجمہ جانتی تھی کہ اگر محبت اسے یہ حوصلہ نہ دیتی تو وہ کبھی اس شکستہ عمارت میں جانے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

تیز تیز قدموں سے راستہ طے کرنے اور دل ہی دل میں آفتاب اور اس سے ہونے والی باتوں کا تصور کرتے ہوئے وہ تقریباً بیس منٹ میں پرانی حویلی پہنچ گئی۔ عید کی رات ہونے کی وجہ سے بیشتر گھروں میں لوگ.... خاص طور سے نوجوان لڑکے لڑکیاں جاگ رہے تھے مگر یہ اتفاق ہی تھا کہ اسے راستے میں کوئی بھی نہیں ملا اور نہ ہی کسی نے اسے پرانی حویلی کی طرف جاتے دیکھا۔

آفتاب نے خط میں لکھا تھا کہ وہ پرانی حویلی میں نجمہ کا انتظار کرے گا مگر حویلی پہنچ کر اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے باوجود اسے آفتاب کہیں نظر نہیں آیا۔ یہ سوچ کر شاید وہ ابھی نہیں آیا ہے، نجمہ ایک گرے ہوئے ستون پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ انتظار کرتے ہوئے اسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر وہ متوقع انداز میں گھومی تو اسے وہاں آفتاب کے بجائے اکبر کھڑا دکھائی دیا۔

”خوب! خوب!“ اس نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اتنی رات گئے تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”میں سیر کرنے آئی تھی۔“ نجمہ نے غصّے سے جواب دیا۔ ”کیا تم کسی وقت میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے؟“

”کیسے چھوڑ دوں؟“ اکبر ہنسنے لگا۔ ”مجھے تمہاری سلامتی اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔“

نجمہ مایوسی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اکبر کو موجود پا کر آفتاب کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ایک آخری صورت یہی ممکن تھی کہ وہ ابھی نئی حویلی واپس جائے اور پھر کچھ دیر کے بعد کسی طرح اکبر کی آنکھ بچا کر دوبارہ آنے کی کوشش کرے۔ یہی سوچ کر وہ چلنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اکبر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اپنے مجنوں کا انتظار نہیں کرو گی؟“

”میں کہہ چکی ہوں کہ میں یہاں سیر کرنے آئی تھی۔“ نجمہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ”لیکن تمہاری موجودگی ہر خوب صورت منظر کو برباد کر دیتی ہے اس لیے واپس جا رہی ہوں۔“

”آفتاب تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے نجمہ!“ اکبر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ”جتنی تم اس کے لیے دیوانی ہو، اگر اس کی آدھی محبت بھی مجھے دو تو میں تمہاری پوجا کر سکتا ہوں۔“

”مجھے تم سے اپنی پوجا کرانے کا کوئی شوق نہیں ہے“ نجمہ نے غصّے سے کہا۔ ”میرا راستہ چھوڑ دو۔“

”راستہ تو خیر نہیں، البتہ اس وقت تمہیں ضرور چھوڑ دوں گا۔“ اکبر بولا۔ ”مگر اپنے سوال کا جواب پانے کے بعد۔“

”وہ جواب میں تمہیں کل ہی دے چکی ہوں۔ تم سے شادی

کرنے کے بجائے میں مرنا زیادہ پسند کروں گی۔"

"یہ تمہارا آخری جواب ہے؟"

"بالکل آخری اور قطعی۔"

"پھر اب تمہیں مرنا ہی پڑے گا۔" اکبر نے دانت پیستے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے نجمہ کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ سنبھلنے کی کوشش کے باوجود اس گرے ہوئے ستون سے جا ٹکرائی جس پر چند لمحے قبل بیٹھی تھی۔ اس کا سر بڑے زور سے ستون کے نوکیلے کنارے سے ٹکرایا، آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑیں، ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا محسوس ہوا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

پھر نہ جانے کتنی دیر کے بعد نجمہ کو ہوش آیا تو اس کے سامنے اکبر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے کھڑا تھا۔ نجمہ کے ہوش و حواس پر ایک بجلی سی گری۔ معلوم نہیں یہ سر کی چوٹ کا اثر تھا یا اپنی بربادی کا صدمہ کہ وہ دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی۔ یہاں تک کہ اس کے ہذیانی قہقہوں نے اکبر کو بھی بوکھلا دیا۔ پرانی حویلی گاؤں سے بہت دور تھی مگر اسے خوف ہوا کہ کہیں نجمہ کی چیخیں گاؤں والوں کے کانوں تک نہ پہنچ جائیں۔ اس نے نجمہ کو خاموش کرانے کی بہت کوشش کی، اس کے منہ پر تھپڑ مارے، اسے جھنجھوڑ ڈالا اور جب اس پر بھی وہ چپ نہ ہوئی تو اس کے مضروب سر پر ایک گھونسا مار کر اسے پھر بے ہوش کر دیا۔

اس صورت حال نے اکبر کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر نجمہ کو واپس حویلی لے جائے تو اس کی موجودہ کیفیت کا کیا جواز پیش کرے گا اور سرِدست کسی بہانے سے وہ لوگوں کو مطمئن کر بھی دے تو کیا نجمہ ہوش میں آنے کے بعد اس کی درندگی کا راز فاش نہ کر دے گی؟ بہت سوچنے کے بعد بھی اس گھبراہٹ میں اسے اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نظر نہیں آیا کہ وہ اپنے باپ کے پاس جائے اور انہیں سب کچھ بتا کر اس بگڑی بات کو سنبھالنے کے لیے درخواست کرے۔

بے ہوش نجمہ کو اٹھا کر ایک تاریک گوشے میں لٹانے کے بعد وہ حویلی واپس گیا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ چودھری اصغر علی اتنی رات گزرنے کے باوجود جاگیر کے حساب کتاب میں الجھے ہوئے تھے۔ اکبر زرد چہرے کے ساتھ گھبرایا ہوا ان کے کمرے میں داخل ہوا تو چودھری صاحب اسے دیکھتے ہی تاڑ گئے کہ کوئی غیر معمولی حادثہ پیش آگیا ہے۔

"کیا بات ہے؟" انہوں نے چونک کر پوچھا۔ "تم اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو؟"

"ابا جان! میں ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔" اکبر نے جواب دیا۔ "اور آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو مجھے اس مصیبت سے نکال سکے۔" یہ کہہ کر اس نے مختصر الفاظ میں تفصیل بیان کر دی۔ "میرا خیال تھا کہ اس طرح وہ میرے قبضے میں آجائے گی اور خود کو بے عزتی سے بچانے کے لیے مجھ سے شادی کرلے گی۔ مگر... مگر وہ تو پاگل ہوگئی۔"

"لیکن وہ اتنی رات گئے پرانی حویلی گئی کیوں تھی؟" چودھری صاحب نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم؟" اکبر نے جھوٹ بولا۔

"میرا خیال ہے تم جانتے ہو اور اندازہ تو میں بھی لگا سکتا ہوں۔"

"مگر اب کیا کیا جائے؟" اکبر بری طرح نروس ہو رہا تھا۔

"تم انتہائی احمق نوجوان ہو۔ میں کب تک تمہیں بچاتا رہوں گا۔"

"پلیز ابا جان..."

"اچھا، تم یہیں ٹھہرو، میں کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔" چودھری صاحب نے جواب دیا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ اکبر تھکے تھکے انداز میں ایک کرسی پر لڑھک گیا۔ اسے کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ چودھری صاحب تقریباً تیس پینتیس منٹ کے بعد واپس آئے۔

"گاؤں میں دو تین آدمی میرے بھروسے کے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔ "میں ان کے گھر گیا تھا مگر وہ سب عید کی خریداری کے لیے شہر گئے ہوئے ہیں، نہ جانے کس وقت واپس آئیں۔ اب اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں کہ ہم خود پرانی حویلی جائیں۔ اگر وہ سچ مچ پاگل ہوگئی ہے تو میں لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی بہانہ سوچ لوں گا اور اگر اس کی بہکی ہوئی کیفیت صدمے کی وجہ سے عارضی ہے تو میں نہیں جانتا کہ وہ ہوش میں آکر تمہارے اور میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔"

"ہم... ہم اسے ہوش میں ہی کیوں آنے دیں۔" اکبر بولا۔ "پرانی حویلی کا کھنڈر بہترین قبرستان بن سکتا ہے۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ قتل ایک انتہائی سنگین جرم ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والا اول تو قانون سے ہی نہیں بچ سکتا اور کسی طرح بچ بھی جائے تو اسے قدرت بڑی عبرتناک سزا دیتی ہے۔"

"نجمہ کا کچھ نہ کچھ علاج تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"وہ بعد میں اس کی حالت دیکھ کر سوچ لیں گے۔" چودھری

صاحب نے جواب دیا۔ "ہمیں فوراً پرانی حویلی پہنچنا چاہیے۔"
وہ تیز رفتاری سے چلتے ہوئے شارٹ کٹ راستے سے دس منٹ میں پرانی حویلی پہنچ گئے۔ چودھری صاحب نے ادھر اُدھر دیکھا۔ "کہاں ہے وہ؟" انھوں نے سوال کیا۔
"میں اسے اس تاریک گوشے میں لٹا گیا تھا۔" اکبر نے اشارے سے بتایا۔
دونوں لپک کر وہاں پہنچے مگر نجمہ کا کوئی پتا نہ تھا۔
"کہاں گئی! کہاں جاسکتی ہے!" اکبر نے گھبرا کر کہا۔ "میں تو اسے اسی جگہ بے ہوش چھوڑ گیا تھا۔"
"تم اپنے ساتھ مجھے بھی برباد کرکے رہوگے۔" چودھری صاحب نے غصّے سے کہا۔ "میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو! اسے آس پاس تلاش کرو۔ اگر وہ ہوش میں آکر گاؤں کی طرف نکل گئی ہے تو پھر تمہارا اور میرا خدا ہی حافظ ہے۔"
دونوں باپ بیٹے تقریباً ایک گھنٹے تک نجمہ کو حویلی کے کھنڈرات اور گرد و نواح میں دور دور تک تلاش کرتے رہے مگر نجمہ کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ تھک ہار کے دونوں نئی حویلی واپس آگئے۔
"جاؤ اب اپنے کمرے میں جاکر سونے کی کوشش کرو۔" چودھری صاحب نے کہا۔ "ابھی صبح ہونے میں چار پانچ گھنٹے باقی ہیں۔ تم اپنی زبان بالکل بند رکھنا۔ بلکہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر کمرے میں ہی رہنا، بہت کم باہر آنا۔ میری سمجھ میں کوئی معقول بہانہ آگیا تو آصف اور گاؤں والوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔ ورنہ پھر میں بھی خاموش رہوں گا۔"

☆

دوسرے دن نجمہ کے غائب ہونے کی خبر پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ چودھری صاحب نے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ مگر اپنے دو تین وفاداروں کے ذریعے یہ افواہ ضرور پھیلا دی کہ گزشتہ رات نجمہ کو کسی نوجوان کے ساتھ جو اپنے لباس سے شہر کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا، پرانی حویلی کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔
نو عمر آصف کو اپنی بڑی بہن سے اس درجہ محبت تھی کہ وہ اس کی گمشدگی کے صدمے سے بے ہوش ہوگیا اور اس کے لیے قصبے سے ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ جس نے کوئی انجکشن اور دوا وغیرہ دے کر مکمل آرام کرنے کی ہدایت کی۔
نجمہ کی پُراسرار گمشدگی سے سب سے زیادہ حیرت اور شبہ آفتاب کو تھا۔ اس نے نزدیکی پولیس چوکی میں رپورٹ کر دی اور بیان دیا کہ گزشتہ روز دوپہر کو اس کی نجمہ سے آخری ملاقات ہوئی تھی اور اس وقت اس کی باتوں سے اس قسم کا کوئی تاثر نہیں ملتا تھا کہ وہ کہیں جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس نے نجمہ کے کسی نوجوان کے ساتھ فرار ہونے کے نظریے کو قطعی مسترد کردیا۔
قصبے کے پولیس اسٹیشن کے انچارج انسپکٹر بھٹی کو اس کیس کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا گیا۔ انسپکٹر بھٹی نے حویلی پہنچ کر چودھری صاحب سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے وقت اکبر بھی موجود تھا۔
"آپ کے خیال میں نجمہ بیگم کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟" انسپکٹر بھٹی نے ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد پوچھا۔
"میری بھتیجی تعلیم یافتہ مگر سیدھی سادی طبیعت کی مالک تھی۔" چودھری صاحب نے جواب دیا۔ "وہ اس کا کردار بے داغ اور پاکیزہ تھا۔ اس نے شہر کے کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یا تو کالج میں یا پھر یہاں گاؤں میں کسی چالاک اور چرب زبان نوجوان نے اسے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے شیشے میں اتار لیا۔ مقصد ظاہر ہے کہ وہ نجمہ کے ذریعے اس کی جاگیر پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہا ہوگا۔ ممکن ہے نجمہ اس سے ملاقات کرنے پرانی حویلی جاتی رہی ہو مگر وہ بدکردار نہیں تھی۔ اس نے اس شخص کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا ہوگا۔ عید کی رات کو بھی وہ اس سے ملنے گئی مگر اس رات اس شخص کے سر پر شیطان سوار ہوگیا۔ اس نے زبردستی کرنے کی کوشش کی ہوگی، نجمہ نے مزاحمت کی۔ اس کش مکش کا ثبوت پرانی حویلی میں اس مقام پر بھی ملتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس شخص نے قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہوکر یا تو نجمہ کو مار دیا ہے یا پھر اسے زبردستی کہیں لے جاکر قید کردیا ہے۔"
"آپ اس نوجوان کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے؟" انسپکٹر بھٹی نے سوال کیا۔
"ایک اندازہ تو میں پیش کرسکتا ہوں۔" اکبر بول اٹھا۔
"وہ کیا؟"
"آفتاب! پھوپھی سعیدہ کا بیٹا۔" اکبر نے جواب دیا۔ "وہ بچپن سے نجمہ کے ساتھ رہا ہے۔"
"اکبر!" چودھری صاحب نے ڈانٹا۔ "تمہیں بغیر ثبوت کے اس طرح کسی کا نام نہیں لینا چاہیے۔"
"آپ اکبر کو بولنے دیں چودھری صاحب۔" انسپکٹر بھٹی نے کہا۔ "میرا تجربہ ہے کہ بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی حویلیوں میں عموماً اس طرح کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں، تم کھل کر بات کرو اکبر۔"
"میں شرمندہ ہوں۔" اکبر نے کہا۔ "مجھے واقعی اس

طرح کسی کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔"

"آپ لوگ تعاون نہیں کریں گے تو پولیس یہ کیس کیسے حل کر سکے گی؟"

"قانون کی مدد کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔" اکبر بولا۔ "لیکن یہ سچ ہے کہ آفتاب کے خلاف میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے، صرف ایک اندازہ ہے۔"

"مجھے تمہارے اندازے سے بھی کام کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔" انسپکٹر بھٹی نے کہا۔ "آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ تمہارا ذہن آفتاب کی طرف منتقل ہوا؟"

"پہلی وجہ تو یہی ہے کہ گاؤں کے کچھ افراد نے نجمہ کو ایک ایسے نوجوان کے ساتھ دیکھا تھا جس نے شہری لباس پہنا ہوا تھا اور ہمارے گاؤں میں ایسا لباس صرف آفتاب پہنتا ہے۔" اکبر نے جواب دیا۔ "دوسری وجہ ایک خاندانی تنازع ہے۔ برسوں پہلے سعیدہ پھوپھی کو خاندان سے نکال کر ان کے تمام حقوق ختم کر دیے گئے تھے۔ میرے مرحوم تایا نے سعیدہ پھوپھی کو پناہ دی، ان کی اور آفتاب کی پرورش اور سرپرستی کی مگر آفتاب اپنی ماں کے ساتھ کیے گئے سلوک کو نہیں بھولا تھا۔ ممکن ہے نجمہ پر قابو پا کر وہ اپنی ماں کے ساتھ کیے گئے سلوک کا انتقام لینا چاہتا ہو۔"

"ہوں۔" انسپکٹر بھٹی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تمہارا یہ اندازہ درست بھی ہو سکتا ہے۔ میں ایک بار پھر آفتاب سے ملوں گا۔ کوشش کروں گا کہ جرح کر کے اس کی زبان سے کوئی مفید بات معلوم کر لوں لیکن جب تک اس کے خلاف کوئی عینی گواہ نہیں ملے گا یا پھر خود نجمہ کو برآمد نہیں کر لیا جائے گا، ہم اس پر کوئی مقدمہ قائم نہیں کر سکتے۔"

"انسپکٹر صاحب!" چودھری اصغر نے کہا۔ "میرا بیٹا جوشیلا اور نادان ہے۔ آپ اپنی تحقیقات کھلے ذہن کے ساتھ کریں۔ میں ذاتی طور پر کسی کے خلاف کوئی شبہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ یہ نجمہ کی اپنی حرکت بھی ہو سکتی ہے۔"

انسپکٹر بھٹی نے چودھری صاحب کو کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ حویلی سے رخصت ہو کر آفتاب کے گھر پہنچا۔ دستک کے جواب میں خود آفتاب نے دروازہ کھولا۔

"میں تم سے کچھ مزید سوالات کرنا چاہتا ہوں۔" انسپکٹر بھٹی نے کہا۔

"ضرور۔ آئیے تشریف لائیے۔" آفتاب نے کہا۔

وہ انسپکٹر کو کمرۂ نشست میں لے گیا۔

"فرمائیے؟" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"واقعے کی رات کو کچھ گواہوں نے تمہیں نجمہ کے ساتھ دیکھا تھا۔" انسپکٹر بھٹی نے کہا۔

"مجھے نہیں، ایک ایسے نوجوان کو جس نے شہری لباس پہن رکھا تھا۔" آفتاب نے جواب دیا۔ "بشرطیکہ وہ گواہ سچ بول رہے ہوں جس کا مجھے یقین نہیں ہے۔"

"تمہاری، چودھری خاندان سے کوئی رنجش تو نہیں؟"

"نہیں، کبھی میری والدہ کو تھی۔ مگر تایا ابا مرحوم چودھری انور علی نے اپنی شفقت اور مہربانیوں سے ان تمام زخموں کو بھر دیا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ میرے والد کے انتقال کے بعد سے انھوں نے ہی ہمارے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔ میں آج جو کچھ ہوں، انھی کی وجہ سے ہوں۔"

"لیکن گاؤں میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ تم نجمہ کو ورغلا کر جاگیر پر قبضہ کرنا چاہتے تھے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ میرے خلاف یہ بے بنیاد شبہ کس نے آپ کے ذہن میں پیدا کیا ہے۔" آفتاب نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ "لیکن آپ اس نقطۂ نظر سے بھی سوچیں تو مجھ سے زیادہ کچھ اور لوگ جاگیر کے حریص نظر آئیں گے۔ ذرا سوچیے، جاگیر کا نظام کس کے ہاتھ میں ہے، نجمہ اور آصف کے بعد کون قانونی طور پر جاگیر کا مالک بن سکتا ہے؟ اگر نجمہ کو غائب کر کے آصف کو مٹھی میں لے لیا جائے تو کسے جاگیر پر مکمل دسترس حاصل ہو سکتی ہے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا سمجھوں اور کیا نہ سمجھوں!" انسپکٹر بھٹی اُلجھ کر بولا۔ "دونوں طرف ہی شبہ جا سکتا ہے.... بہرحال، میں تحقیقات کے مزید آگے بڑھنے تک کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔"

"میری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں۔" آفتاب نے کہا۔ "میں کل شہر واپس جا رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ میں یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔ جب بھی میری ضرورت ہو، مجھے یونیورسٹی کے ذریعے اطلاع کر سکتے ہیں، میں فوراً آ جاؤں گا۔"

آصف کے دماغ پر نجمہ کی گمشدگی کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد بھی نارمل نہ ہو سکا۔ جب بھی اسے ہوش آتا، وہ بہکی بہکی باتیں کرتا۔ قصبے کا ڈاکٹر اگرچہ بڑی توجہ سے اس کا علاج کر رہا تھا مگر اس کے علاج سے کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چودھری صاحب نے اسے شہر کے کسی اچھے اسپتال میں داخل کرنے کا خیال ظاہر کیا لیکن ان کی بیوی نے اس کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسپتال میں کسی نہ کسی کو آصف کے ساتھ رہنا پڑے گا اور حویلی میں کون ہے جو اس کے ساتھ

رہ سکتا ہو۔ اس لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر کو گاؤں بلا کر آصف کو دکھایا جائے۔ جتنا بھی خرچ ہو، آصف کا علاج گھر پر ہی ہونا چاہیے تاکہ اس کی مناسب دیکھ بھال بھی کی جاسکے اور پھر کیا معلوم کہ شہر میں ایسے مریضوں کو پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہو۔ چودھری صاحب نے اس مشورے سے اتفاق کیا اور شہر کے ایک معروف ڈاکٹر کو جو ذہنی امراض کے سلسلے میں اسپیشلسٹ سمجھے جاتے تھے گاؤں بلا کر آصف کو دکھایا۔ پھر ان کی تشخیص کے مطابق علاج بھی شروع ہوگیا۔

اس ایک ہفتے میں پولیس اپنی تمام دوڑ دھوپ کے باوجود نہ تو نجمہ کو برآمد کرسکی تھی اور نہ اس کی پُراسرار گمشدگی کا معما حل کرسکی لیکن ساتویں دن علی الصبح انسپکٹر بھٹی کو رپورٹ ملی کہ ایک دیہاتی نے گاؤں سے دس میل شمال میں واقع ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن سے کچھ آگے ریل کی پٹڑی پر ایک کٹی ہوئی لاش دیکھی ہے۔ لاش کسی عورت کی معلوم ہوتی ہے۔

انسپکٹر بھٹی فوراً تین چار کانسٹیبلوں کو اپنے ساتھ جیپ میں لے کر موقعے پر پہنچا۔ لاش بلاشبہ موجود تھی اور کچھ ایسے عجیب و غریب طریقے سے کسی گزرنے والی ٹرین کے نیچے آئی تھی کہ جسم کے کئی ٹکڑے ہونے کے علاوہ چہرہ بھی بالکل کچل کر اور کٹ کر ناقابلِ شناخت ہوگیا تھا۔ لاش کے کپڑوں اور کٹے ہوئے ہاتھ پیروں سے یہ اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں تھا کہ وہ کوئی عورت تھی۔ نجمہ کی گمشدگی کچھ اس طرح انسپکٹر بھٹی کے ذہن پر مسلط ہوئی تھی کہ بظاہر شناخت کی کوئی علامت نہ ہوتے ہوئے بھی وہ لاش کے ٹکڑے سمیٹ کر تھانے پہنچانے کے بعد سیدھا حویلی پہنچا۔

"ریلوے لائن پر ایک کٹی ہوئی زنانہ لاش ملی ہے۔" اس نے چودھری صاحب کو بتایا۔ "میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ضرور ہی نجمہ بیگم کی لاش ہوگی۔ پھر بھی ایک نظر دیکھ لیں تو اچھا ہے۔"

چودھری صاحب فوراً تیار ہوگئے اور انسپکٹر بھٹی کے ساتھ قصبے کے پولیس اسٹیشن پہنچے۔ لاش کے ٹکڑوں کو غور سے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے گہری افسردگی کے عالم میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یقینی طور پر پہچاننا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔" انہوں نے کمرے سے باہر آکر انسپکٹر بھٹی سے کہا۔ "پھر بھی لاش کے جسم پر جو کپڑے ہیں وہ نجمہ کے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، میں نے اس شام کھانے کی میز پر اسے اسی لباس میں دیکھا تھا۔"

"لباس کے علاوہ کوئی شناخت نہیں ہے؟" انسپکٹر بھٹی نے پوچھا۔

"ہے۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی ہے۔" چودھری صاحب نے جواب دیا۔ "نجمہ اسی طرح کی انگوٹھی پہنا کرتی تھی۔"

"پھر تو کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہ لاش نجمہ بیگم ہی کی ہے۔" انسپکٹر بھٹی نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ وہ اس انجام سے دوچار ہوئیں۔"

"مگر یہ سب ہوا کیسے؟" چودھری صاحب نے حیرت سے کہا۔

"میرا اندازہ ہے کہ نجمہ بیگم کے ساتھ جو نوجوان تھا اس نے انہیں دھوکا دیا، وہ انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ نجمہ بیگم نے غیرت اور شرمندگی کے احساس سے مغلوب ہوکر ٹرین کے نیچے آکر خودکشی کرلی۔"

"شاید یہی بات ہو۔" چودھری صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اب آپ لاش لے جانے کی اجازت دیں تاکہ میں اپنی بدنصیب بھتیجی کی تجہیز و تدفین کے فرض سے سبکدوش ہوسکوں۔"

"آپ چاہیں تو لاش ابھی لے جاسکتے ہیں۔" انسپکٹر بھٹی نے کہا۔ "میں غیر ضروری کاغذی کارروائی میں اُلجھا کر آپ کو مزید دکھ دینا نہیں چاہتا۔ خدا آپ سب کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دے اور مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔"

چودھری صاحب نے انسپکٹر بھٹی کا شکریہ ادا کیا اور لاش اپنے ساتھ ہی حویلی لے گئے جہاں شام ہونے سے پہلے ہی اسے آبائی قبرستان میں دفن کردیا گیا۔

آصف کی دماغی حالت بدستور اسی طرح چل رہی تھی۔ یوں اس کی عام جسمانی صحت بالکل ٹھیک تھی مگر ذہن ابھی تک نجمہ کی موت کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ گاہے بگاہے کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آتا تو اس طرح باتیں کرتا جیسے نجمہ حویلی میں موجود ہو۔ اب چونکہ وہ جاگیر کا واحد وارث اور مالک تھا اور اس کی یہ کیفیت جاگیر کے انتظام و انصرام میں حارج ہو رہی تھی۔ اس لیے چودھری صاحب نے نجمہ کے سوئم کے بعد ہائی کورٹ میں درخواست دی کہ انہیں آصف کا سرپرست اور جاگیر کا منتظم قرار دیا جائے۔

بات بالکل سیدھی سادی تھی۔ ہائی کورٹ نے ڈاکٹروں کے ایک بورڈ سے آصف کا معائنہ کرایا۔ بورڈ کی رپورٹ کہ آصف اپنی موجودہ ذہنی حالت میں کوئی بھی ذمہ داری

Farukh Malik

سنبھالنے کے قابل نہیں ہے۔ عدالت نے بورڈ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے چودھری اصغر علی کو اپنے بھتیجے آصف کا قانونی سرپرست اور اس کی ذہنی صحت بحال ہونے تک منتظم اعلیٰ قرار دیا اور انھیں ہر قسم کے کاغذات پہ دستخط کرنے کی اجازت دی۔ مگر ساتھ ہی یہ پابندی بھی لگادی کہ وہ آصف کا علاج پوری توجہ اور بہترین انداز سے کراتے رہیں گے۔ نیز جاگیر کے جملہ حسابات سال کے سال کورٹ کے سامنے پیش کریں گے تاکہ عدالت کا مقرر کردہ آڈیٹر انھیں چیک کر سکے۔

*

ایک سال گزر گیا۔ گاؤں کے لوگ بجنہ کے واقعہ کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ آصف کی حالت اسی طرح چل رہی تھی۔ مگر چودھری صاحب نے جاگیر کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال رکھا تھا۔ ان کے طرزِ عمل سے کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہ سچ تھا کہ روپے پیسے کے معاملے میں ان کا رویہ بڑا سخت تھا۔ وہ اپنے واجبات کے سلسلے میں کسی سے کوئی رعایت نہیں کرتے تھے مگر کسی کے ساتھ زیادتی بھی نہیں کرتے تھے، عام جاگیرداروں کی طرح بیگار نہیں لیتے تھے۔ موڈ میں ہوتے تو غریبوں کی مدد بھی کر دیا کرتے تھے۔ آصف کا بہت خیال رکھتے تھے۔ دور دور سے ڈاکٹر بلا کر انھوں نے اس کا علاج کرایا تھا مگر انھوں نے ڈاکٹروں کے اس مشورے سے کبھی اتفاق نہیں کیا کہ آصف کو کسی بڑے اسپتال میں داخل کر دیا جائے تو اس کی صحت یابی کا امکان بڑھ جائے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اسے اسپتال کے ڈاکٹروں اور نرسوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا اور پھر جب گھر پر اس کا کمرہ الگ ہے، ایک نرس مستقل اس کی تیمارداری کرتی ہے تو اسپتال لے جانے سے ایسا کیا فرق پڑ جائے گا۔ عجیب بات یہ تھی کہ جب بھی کوئی نیا ڈاکٹر تبدیل کیا جاتا تھا، فائدہ کی رفتار تیز ہو جاتی تھی مگر یہ صحت یابی ایک حد پر آکر ٹھیر جاتی اور پھر رفتہ رفتہ وہ اپنی سابق حالت پر واپس آجاتا تھا۔

اسی ایک سال میں آفتاب نے نمایاں پوزیشن سے ایم کام کر لیا۔ اکبر کا اندازہ اس کے بارے میں غلط نہیں تھا۔ آفتاب کو واقعی غزالہ سے محبت تھی اور یہ محبت کالج کے زمانے سے پروان چڑھ رہی تھی۔ غزالہ کے والد شیخ ضمیر الدین شہر کے ایک بڑے اور کامیاب بزنس مین تھے اور غزالہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ شیخ صاحب، آفتاب کو ایک ہونہار طالب علم خیال کرتے تھے اور اس کے مستقبل کے بارے میں بڑے پُرامید تھے، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کبھی اس کے گھر میں آنے جانے یا غزالہ سے ملنے پر کوئی ناروا پابندی نہیں لگائی۔ انھیں آفتاب سے پہلا اختلاف اس وقت ہوا جب اس نے ان کے مشورے کے مطابق ایم بی اے کرنے کے بجائے ایم کام کرنا پسند کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، وہ یا تو ایم کام کرنے کے بعد ٹیچنگ لائن میں چلا جائے گا یا پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کرے گا گویا دونوں صورتوں میں اس کی منزل قوم کے نوجوانوں کو تعلیم دینا تھی۔

یہ بات شیخ صاحب کو پسند نہیں آئی مگر وہ خاموش رہے، ایم کام میں آفتاب کی کارکردگی دیکھنے کے لیے۔ جب اس نے ایم کام میں ٹاپ کر کے پورے صوبے میں دوسری پوزیشن حاصل کی تو شیخ صاحب نے ایک بار پھر اسے یہ مشورہ دیا کہ اگر وہ ٹیچنگ لائن ہی اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے امریکہ جانے اور کسی یونیورسٹی میں ملازمت کا انتظام کر دیں گے اور وہ چاہے تو وہیں رہ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لے۔ آفتاب نے بڑے ادب کے ساتھ اس مشورے سے بھی اختلاف کیا۔ کہ اس نے جو کسبِ علم کیا ہے تو پہلا حق اس کے ملک اور ابنائے وطن کا ہے کہ وہ انھیں فائدہ پہنچائے۔ شیخ صاحب نے تب ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ کم عقل نوجوان ان کا داماد نہیں بن سکتا۔ غزالہ جس نے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی اپنے والد کی ہم خیال تھی۔ چنانچہ جب کچھ دن کے بعد شیخ صاحب نے اس کی منگنی اپنے ایک دوست کے ڈپٹی کمشنر بیٹے سے کر دی تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور جب آفتاب نے اسے اس فیصلہ کے خلاف احتجاج پر آمادہ کرنے کے لیے ملاقات کی تو اس نے صاف کہہ دیا۔

"میں آپ کو پسند کرتی تھی، اب بھی کرتی ہوں مگر صرف محبت سے کسی کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ مجھے آرام سے زندگی گزارنے کے لیے ان تمام لوازمات کی ضرورت ہے جن کی میں عادی رہی ہوں۔ ڈیڈی نے کئی مرتبہ آپ کو ایک بہتر مستقبل کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی، اپنا تعاون بھی پیش کیا مگر آپ نے ان کے مشوروں کو مسترد کر دیا۔ بلاشبہ آپ کو حق ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو جہاں چاہیں ضائع کریں مگر میں یہ گھاٹے کا سودا کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے آپ کو نہ پانے کا افسوس ضرور ہوگا مگر زندگی بھر کے عیش و آرام کے مقابلے میں اس وقتی افسوس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔"

آفتاب نے اس سے بحث نہیں کی۔ اسے پہلی مرتبہ غزالہ کے اندازِ فکر کا اس قدر واضح ادراک ہوا تھا۔ اس نے کھلے دل سے تسلیم کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے موزوں نہیں تھے۔ اگر تقدیر انھیں یکجا کر بھی دیتی تو آگے کہیں جا کر ان کی راہیں جدا ہو سکتی تھیں۔ اس نے غزالہ کو منگنی اور پھر چند ماہ بعد شادی پر بڑی خوش دلی سے مبارکباد دی اور ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل گیا۔

کچھ ہی دن بعد آفتاب کو اس کی شاندار کامیابی کی وجہ سے یونیورسٹی میں لیکچرار کی جگہ مل گئی۔ ایک سال کی ملازمت کے بعد یونیورسٹی نے اسے اپنے خرچ پر انگلینڈ جانے اور پی ایچ ڈی کرنے کی پیش کش کی جسے آفتاب نے بلا تامل قبول کر لیا اور ضروری تیاری کے بعد لندن روانہ ہو گیا۔

وقت کا پنچھی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ اڑتا رہا۔ دو سال پلک جھپکتے بیت گئے۔ آفتاب بڑے شاندار طریقہ پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر کے انگلینڈ سے واپس آیا۔ آتے ہی اسے پروفیسر بنا دیا گیا۔ اس کے اعزاز میں دعوتیں دی گئیں۔ یہ خبریں گاؤں پہنچیں تو گاؤں والوں نے بھی اسے ایک استقبالیہ دینے کا پروگرام بنایا۔ گاؤں کی پوری تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب اس کے کسی سپوت نے علم کے میدان میں ایسا شاندار کارنامہ انجام دیا ہو۔ گاؤں والوں کے جذبات سے باخبر ہو کر چودھری صاحب نے اس استقبالیہ کا تمام خرچ اور انتظام اپنے ذمے لے لیا۔

پورے گاؤں کی صفائی کی گئی۔ اسے دلہن کی طرح سجایا گیا۔ قرب و جوار کے تمام نمایاں افراد کو دعوت دی گئی۔ ضلعی انتظامیہ کے اعلیٰ حکام اور پولیس کے افسران کو مدعو کیا گیا اور جب مقررہ تاریخ پر آفتاب نے گاؤں میں قدم رکھا تو اسے پھولوں سے لاد دیا گیا۔ اس دوران گاؤں کے پرائمری اسکول کو مڈل اسکول کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ آفتاب کے ہاتھ سے اس کا افتتاح بھی کرایا گیا۔ چودھری صاحب نے دعوت کے اہتمام میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ ایسی شاندار دعوت گاؤں میں پہلی بار منعقد ہوئی تھی۔ اس کے لیے حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک وسیع و عریض پنڈال لگایا گیا تھا۔

یہ ہنگامہ شام تک ختم ہو گیا تو چودھری صاحب نے ذاتی طور پر آفتاب کو رات کے کھانے پر حویلی میں مدعو کیا۔ تین سال کی طویل مدت کے بعد اس رات آفتاب پہلی مرتبہ حویلی میں داخل ہوا تو ذہن میں تمام سوئی ہوئی یادیں جاگ اٹھیں۔

وہ شہر ہی میں تھا جب اسے اخبارات کے ذریعہ معلوم ہوا کہ گمشدہ نجمہ کی لاش ریلوے لائن پر کٹی ہوئی پائی گئی۔ لاش ناقابلِ شناخت تھی مگر چودھری صاحب نے اس کے کپڑوں اور ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی سے پہچان لیا اور یہ کہ بعد میں اسے آبائی قبرستان میں دفن بھی کر دیا گیا۔ آفتاب کو خبر پڑھتے ہی نجمہ کی موت کا یقین آ گیا۔ بلکہ وہ تو اسے شاید پہلے سے ہی مردہ خیال کرنے لگا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اکبر کس طرح نجمہ کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ جب وہ اس کی طرف دیکھتا ہے تو اس کی نظروں میں ہوس کی۔۔۔ پرچھائیاں ناچ رہی ہوتی ہیں۔ آفتاب کو تقریباً یقین تھا کہ نجمہ کے کسی نوجوان کے ساتھ پرانی حویلی جانے کی جو داستان تراشی گئی ہے وہ بالکل جھوٹ ہے اور غالباً اس لیے گھڑی گئی ہے کہ اسے شبہے کی لپیٹ میں لایا جا سکے۔ ورنہ واقعہ صرف اتنا ہوگا کہ اس رات اکبر نے موقع پا کر نجمہ کی عزت پر حملہ کیا، نجمہ نے مزاحمت کی اور اکبر نے اسے نادانستہ طور پر ہلاک کر دیا۔ پھر بذاتِ خود یا چودھری صاحب کی ملی بھگت سے اس کی لاش ریلوے لائن پر ڈال دی گئی۔

حویلی میں قدم رکھتے ہوئے آفتاب کے ذہن میں ایک بار پھر وہ تمام شکوک و شبہات سر اٹھانے لگے۔ اس کے نزدیک تو آصف کی طویل ذہنی علالت میں بھی ان دونوں باپ بیٹے کی شرارت ہو سکتی تھی۔ اپنی ماں جیسی بہن کی گمشدگی نے بلاشبہ آصف کے ذہن کو متاثر کیا ہوگا لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کا علاج نہ کیا جا سکے۔ چودھری صاحب نے جان بوجھ کر علاج میں غفلت کی ہوگی۔ اپنے خریدے ہوئے ڈاکٹروں سے علاج کراتے رہے اور آج تک اسے اسپتال میں داخل نہیں کیا جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال اور مکمل علاج کیا جا سکتا تھا اور پھر بعد میں نجمہ کی موت اور آصف کی بیماری کو جواز بنا کر جاگیر پر قبضہ کر لیا جو اُن کی تمام سازشوں کا بنیادی مقصد تھا۔

چودھری صاحب نے آفتاب کو ہی نہیں بلکہ اپنی بہن کو بھی مدعو کیا تھا۔ سعیدہ بیگم کم و بیش تیس سال کے بعد حویلی میں داخل ہوئیں۔ مرحوم چودھری انور علی جب انھیں بڑی خوشامد اور اصرار کے بعد گاؤں واپس لائے تو ان کی تمام تر منت سماجت کے بعد بھی سعیدہ بیگم حویلی میں رہنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ تب مجبور ہو کر چودھری انور علی نے ان کے لیے حویلی کے پاس ایک مکان بنوا دیا۔ پھر وہ بارہا وقفے وقفے سے بہن سے کہتے رہے کہ وہ پرانی رنجشیں بھلا دیں اور حویلی میں آ جائیں۔ یا کم سے کم آمد و رفت تو رکھیں مگر سعیدہ بیگم

کے کانوں میں ہمیشہ اپنے سخت دل، ظالم و جابر باپ کے الفاظ گونجتے رہتے تھے۔ جب وہ آفتاب کے والد سے شادی کر کے (اور یہ شادی بھی انھوں نے بزرگوں سے چھپ کر اس لیے کی تھی کہ ان کے والد نے ان کا رشتہ بھاری دولت کے عوض ایک ایسے زمیندار کے ساتھ طے کر دیا تھا جو نہ صرف عمر میں ان سے بیس سال بڑا تھا بلکہ تین بیویوں کو قبرستان پہنچا چکا تھا) حویلی واپس آئیں تو ان کے والد نے تمام حالات سے واقف ہو کر پہلے تو انھیں گولی مار کر ہلاک کرنا چاہا پھر بھائی انور علی کی مداخلت پر جب وہ ایسا نہ کر سکے تو دھکے دے کر بیٹی کو حویلی سے نکال دیا اور چیخ کر بولے کہ آج سے تو ہمارے لیے اور ہم سب تیرے لیے مر چکے ہیں۔ اگر تیرے خون میں شرافت کا ایک قطرہ بھی شامل ہے تو آئندہ کبھی حویلی میں قدم مت رکھنا۔

اب چھوٹے بھائی نے قدموں پر سر رکھ دیا تو سعیدہ بیگم ضبط نہ کر سکیں۔ دل کا تمام غبار آنسوؤں سے دھو کر حویلی میں داخل ہوئیں۔ بھاوج نے پھولوں کے ہار سے ان کا استقبال کیا۔ چودھری صاحب نے کھانے کی میز پر انھیں اس کرسی پر بٹھایا جس پر دستور کے مطابق جاگیر کا سربراہ بیٹھا کرتا تھا اور پچھلے تین سال سے وہ خود بیٹھتے چلے آرہے تھے۔ اکبر بھی کھانے کی میز پر موجود تھا۔ مگر اس کا طرزِ عمل اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔ دو سال قبل چودھری صاحب نے اس کی شادی کر دی تھی مگر شادی کے بعد بھی اکبر کی آوارگیوں میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس وقت باپ کے کہنے سے اس نے پھوپھی کو سلام بھی کیا، آفتاب سے گلے بھی ملا مگر چہرے پر ناگواری کا تاثر یہ بتا رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ دل سے نہیں کر رہا ہے۔ سعیدہ بیگم یا آفتاب کو اس رویّے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ انھیں جاگیر سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ کسی کی ناراضگی سے مایوس یا کسی کی رضامندی سے خوش ہوتے۔ وہ صرف پرانی کدورتوں کو بھلانے اور ٹوٹے تعلقات پھر سے استوار کرنے آئے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر چودھری صاحب، ان کی اہلیہ اور سعیدہ بیگم باہم بیٹھ کر کچھ پرانی یادیں تازہ کرنے لگے۔ آفتاب چہل قدمی کے خیال سے باہر باغ میں آگیا۔ باہر نکلا تو سوئی ہوئی یادیں جاگنے لگیں اور اس کے قدم آپ ہی آپ رات کی رانی کے اس کنج کی طرف بڑھنے لگے جہاں وہ اور نجمہ عموماً بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ ابھی وہ گل داؤدی کے محرابی دروازے سے گزرا ہی تھا کہ ایک عجیب بات ہوئی۔ پہلے تو ہوا کا ایک جھونکا گلاب کی خوشبو مہکاتا چلا گیا اور

جب اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں تو رات کی رانی کے کنج میں اسے ایک سرتاپا سفید ہیولا سا نظر آیا۔ گلاب کی خوشبو نجمہ کو بہت پسند تھی۔

"وہ کون ہو تم؟" آفتاب نے متجسس نگاہوں سے اس ہیولے کو گھورا۔

کوئی جواب تو نہیں ملا مگر وہ جو کوئی بھی تھا، قدم بڑھا کر روشنی میں آگیا اور آفتاب کی آنکھیں حیرت سے پھیلی کی پھیلی رہ گئیں! اس کے سامنے نجمہ کھڑی تھی۔ سفید چادر میں ملبوس ہونے کے سبب وہ جسمانی صحت کا اندازہ تو نہیں لگا سکتا تھا مگر ستا ہوا دبلا چہرہ...... اور اڑی ہوئی زرد رنگت یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی کہ اگر وہ نجمہ ہی تھی تو پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گئی تھی۔

"میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں یا تم سچ مچ نجمہ ہو؟" آفتاب نے کہا اور آگے قدم بڑھایا۔

نجمہ بھی جلدی سے پیچھے ہٹی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"مگر تم نجمہ کیسے ہو سکتی ہو!" آفتاب نے پھر کہا۔ "تمھیں تو انتقال کیے تین سال گزر چکے ہیں، تم شاید اس کی روح ہو۔"

نجمہ پھر بھی خاموش رہی اور کوئی بات کہنے کے بجائے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ آفتاب موت کے بعد دنیا میں روحوں کے آنے کا قائل نہیں تھا۔ روح کی بات اس نے صرف اس لیے کی تھی کہ اگر اسے کوئی فریب دیا جا رہا ہے تو دشمن کو یقین ہو جائے کہ وہ اس کے دھوکے میں آگیا ہے۔ چنانچہ جب نجمہ نے اسے اپنے تعاقب میں آنے کا اشارہ کیا تو وہ بلا تامل چل پڑا۔

اس وقت زیادہ رات نہیں ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ساڑھے نو بجے ہوں گے مگر دیہات کے لوگ جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ گاؤں کی گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آفتاب نے جلد ہی اندازہ کر لیا کہ وہ سفید ہستی اسے اس مختصر راستے کی طرف لے جا رہی ہے جو پرانی حویلی کی طرف جاتا ہے۔ اب اس کی دلچسپی اور بڑھ گئی، اسے یوں لگا جیسے کسی راز سے پردہ اٹھنے والا ہو۔

وہ دونوں جلد ہی آگے پیچھے چلتے ہوئے پرانی حویلی پہنچ گئے۔ نجمہ، آفتاب کو اسی ستون کے پاس لے آئی جس پر بیٹھ کر اس نے تین سال پہلے آفتاب کا انتظار کیا تھا۔ چند لمحے وہ بالکل خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر دفعتاً نجمہ کے منہ سے ایک سسکی سی نکلی، وہ گھٹنوں کے بل زمین

پر جھک گئی۔ اس کا سیدھا ہاتھ چادر سے باہر نکلا اور ایک تیز دھار چمکتا ہوا خنجر آفتاب کے قدموں میں آگرا۔

”نہیں، میں تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔“ نجمہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی۔ ”خواہ تم نے میرے ساتھ کچھ بھی سلوک کیا ہو؟“

”مجھے یقین نہیں آرہا ہے!“ آفتاب ابھی تک حیران تھا۔ ”تم نجمہ تو نہیں ہو سکتیں مگر لگ بھی رہی ہو، آخر تم کون ہو؟“

”میں نجمہ ہی ہوں۔“

”مگر نجمہ کا تو.....“

”کاش انتقال ہو گیا ہوتا۔ میں اس طرح زندہ درگور ہونے سے تو بچ جاتی۔“

آفتاب بے اختیار آگے بڑھا اور نجمہ کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ ”تم تو سچ مچ زندہ ہو اور زندہ ہو تو یقیناً نجمہ ہو۔“ اس نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔ ”تو پھر وہ کس کی لاش تھی؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ نجمہ نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تو تین سال سے اس شیطان اکبر کی قید میں حویلی کے تہہ خانے میں بند ہوں۔ اس نے میری نگرانی مائی بیگماں کو سونپ رکھی ہے۔ تین سال کی قید نے اس ظالم عورت کے دل میں بھی رحم پیدا کر دیا۔ میں نے سنا کہ تم حویلی میں آئے ہو تو بیگماں کی بڑی خوشامد کر کے اس وعدے پر باہر نکلی ہوں کہ دو گھنٹے بعد ضرور واپس آجاؤں گی۔ مجھے تم سے انتقام لینا تھا مگر یہاں بھی میں ہار گئی۔“

”مجھ سے انتقام!“ آفتاب چونکا۔ ”تو وہ خنجر تم میرے لیے لائی تھیں؟ میں اس وقت تمھاری بات نہیں سمجھ سکا تھا لیکن مجھ سے کس بات کا انتقام لینا چاہتی ہو، میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟“

”تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا، تمھاری وجہ سے ہوا۔“ نجمہ نے تیزی سے کہا۔ ”آج تمھاری وجہ سے میں سورج کی روشنی اور تازہ ہوا سے بھی محروم ہوں۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔“ آفتاب الجھ کر بولا۔ ”میں تمھاری زندگی برباد کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پھر تم نے ابھی بتایا کہ تمھیں اکبر نے قید کر رکھا ہے۔“

”ہاں۔ مگر یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا۔“

”وہ کس طرح؟“

”یہ دیکھو۔“ نجمہ نے اپنے گریبان سے ایک مڑا تڑا لفافہ نکال کر آفتاب کے سامنے ڈال دیا۔

آفتاب نے لفافے کے اندر رکھا ہوا کاغذ نکالا۔ یہ وہی خط تھا جو نجمہ کو پرانی حویلی لے گیا تھا۔

”میں یہ خط پا کر تم سے ملنے پرانی حویلی گئی اور....“

بیتی ہوئی داستان ختم کرتے ہوئے نجمہ کی آنکھیں ایک بار پھر آنسو بہانے لگیں تھیں۔

”مجھے ہوش آیا تو میں ایک بند کمرے میں تھی۔“ نجمہ نے آخر میں کہا۔ ”رات بھر وہاں کوئی نہیں آیا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ میں کہاں ہوں، وہ کس عمارت کا کمرہ ہے۔ صبح کو مائی بیگماں میرے لیے ناشتا لے کر آئی۔ اسی سے پتا چلا کہ اکبر مجھے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر لایا تھا اور وہ کمرہ جس میں مجھے قید کیا گیا، حویلی کے تہہ خانے کا ایک حصہ ہے۔ مجھے اس تہہ خانے کی موجودگی کا کوئی علم نہیں تھا نہ کبھی ابا جان نے کسی تہہ خانے کی موجودگی کا ذکر کیا تھا۔ اس دن سے آج رات تک میں اسی کمرے میں اپنی زندگی کے دن اس انتظار میں کاٹتی رہی کہ کسی دن تو تمھارا گریبان پکڑ کر پوچھوں گی کہ تم نے میرے ساتھ یہ فریب کیوں کیا جس نے بالآخر مجھے تباہ کر دیا۔“

”یہ خط میں نے نہیں لکھا تھا نجمہ!“ آفتاب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں قسم کھا سکتا ہوں اور تم بھی ذرا توجہ سے کام لیتیں تو خط کی عبارت اور اندازِ تخاطب سے سمجھ جاتیں کہ میں ایسی تحریر لکھ ہی نہیں سکتا۔ ذرا سوچو، مجھے تمھیں پرانی حویلی بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا میں گھر میں تم سے بات نہیں کر سکتا تھا؟ میں خط لکھ کر ملاقاتیں کرنے کا قائل نہیں ہوں اور پھر ڈیئر نجمہ! یہ عامیانہ انداز میں اختیار کر سکتا تھا؟“

”تب یہ خط کس نے لکھا تھا؟“

”کیا تم اب بھی نہیں سمجھیں، یہ ساری سازش اکبر کی تھی۔ اس نے تمھیں میرے نام سے پرانی حویلی بلایا، تمھیں برباد کیا اور پھر تہہ خانے میں قید کر دیا تاکہ تم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکو۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ نجمہ کا لب و لہجہ ایکدم بدل گیا۔ ”میں خود اپنی حماقت سے برباد ہوئی ہوں۔“ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

”غم نہ کرو۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔“ آفتاب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ”تم نے بہت دکھ سہے ہیں، شاید خدا کی مرضی یونہی تھی لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اکبر سے نہ صرف اس ظلم کا انتقام لوں گا بلکہ تمھاری زندگی کو خوشیوں سے بھر دوں گا۔ اگرچہ عید کی رات میں تم سے جو بات کرنا چاہتا تھا وہ یہ نہیں تھی۔ مگر اس کے بعد بہت جلد

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ غزالہ جیسی لڑکیاں جذبات کے خلوص کو بھی اسٹیٹس کے ترازو میں تولتی ہیں' یہ بات مجھے بہت دیر سے معلوم ہوئی۔ تم ابھی میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چل کر اپنا بیان تحریر کراؤ۔ پھر میں اکبر اور چودھری اصغر علی سے سمجھ لوں گا۔"

"نہیں' اس میں چچا جان کا کوئی ہاتھ نہیں۔" نجمہ جلدی سے بولی۔ "یہ سب کچھ اکبر کا کیا دھرا ہے اور میں ابھی آپ کے ساتھ پولیس اسٹیشن بھی نہیں چل سکتی۔ ورنہ اکبر' مائی بیگاں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یوں بھی یہ ہمارے خاندان کا اندرونی معاملہ ہے اسے پولیس یا عدالت تک لے جانے میں اپنی ہی رسوائی ہو گی۔ ابھی مجھے واپس جانے دیں اور پھر کل چچا جان سے مل کر انھیں میرے تہ خانے میں قید ہونے کے بارے میں بتائیں۔ وہ اکبر کے باپ ضرور ہیں مگر اس ظلم و زیادتی میں اس کا ساتھ نہیں دیں گے۔"

"ان تین برسوں میں کیا اکبر تمھارے پاس آتا رہا ہے؟" آفتاب نے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر اسے پھر کوئی غلط حرکت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔" نجمہ نے جواب دیا۔ "مجھے بیگاں سے یہ خنجر مل گیا تھا اور میں نے اکبر پر واضح کر دیا تھا کہ اگر اس نے میرے کمرے میں قدم بھی رکھا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ وہ آتا ہے' کمرے سے باہر کھڑے رہ کر مجھے اپنے ساتھ شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور میرا سخت جواب سن کر واپس چلا جاتا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" آفتاب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "جیسا تم کہتی ہو ویسا ہی کروں گا۔ دیکھنا ہے' ماموں جان کس کا ساتھ دیتے ہیں۔" اس نے خط دوبارہ لفافے میں ڈال کر لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ "آؤ چلو' میں تمھیں حویلی تک چھوڑ دوں۔" اس نے نجمہ سے کہا۔

"نہیں' آپ پہلے جائیں۔ میں خود ہی واپس پہنچ جاؤں گی۔" نجمہ نے جواب دیا۔

آفتاب' حویلی پہنچا تو اسے غیر حاضر ہوئے ایسا زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر وہ حویلی کے عقبی دروازے سے جو ملازموں کی آمدورفت کے لیے رات کے گیارہ بجے تک کھلا رہتا تھا' اندر داخل ہوا۔ کھانے کی میز پر گفتگو کے دوران جب سعیدہ بیگم نے آصف کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تھا تو چودھری صاحب نے بتایا تھا کہ اسے حویلی کے پچھلے حصے کے ایک کمرے میں رکھا گیا ہے۔ غالباً آفتاب کے ذہن میں اسی بات نے آصف کا کمرہ دیکھنے کا تجسس پیدا کیا تھا اور شاید اسی خیال سے وہ عقبی دروازے سے آیا تھا۔

راہداری میں وہ تھوڑی دور ہی آگے بڑھا تھا کہ اس نے ایک کمرے میں روشنی ہوتے دیکھی' کھلی ہوئی کھڑکی سے جھانکا تو اندر اکبر ایک نرس کے ساتھ کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا۔

"آج رات کی خوراک کو ایک گھنٹے کی دیر ہو گئی ہے۔" نرس کہہ رہی تھی۔

"مجبوری تھی' پھوپھی جان کمرے میں موجود تھیں' ان کے سامنے تو روز کی خوراک نہیں دی جا سکتی تھی۔" اکبر نے جواب دیا اور اپنے پیچھے کی الماری کی طرف گھوما۔

اس نے الماری کھول کر ایک چھوٹی سی شیشی نکالی' نرس ہاتھ میں ایک گلاس لیے کھڑی تھی جس میں کوئی دوا نظر آ رہی تھی۔ اکبر نے شیشی کھول کر دو تین قطرے دوا میں ٹپکائے اور شیشی واپس الماری میں رکھ دی۔ آصف کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا مگر سامنے ہی ایک دروازہ کھلا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ آصف کا پلنگ ملحقہ کمرے میں موجود ہے۔ نرس دوا لے کر اس دروازے کی طرف بڑھی تو اکبر کمرے سے نکل کر راہداری میں آ گیا۔ آفتاب نے چھپنے کی کوشش کی مگر اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اکبر کسی بھی طرف دیکھے بغیر سامنے لپکتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی آفتاب تیزی سے کمرے میں گھسا' وہی الماری کھولی' مطلوبہ شیشی سامنے ہی رکھی تھی' اس پر لگا ہوا پوائزن کا لیبل' جو وہ پہلے نہیں دیکھ سکا تھا' اب واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ آفتاب اسے اٹھانے ہی والا تھا کہ کسی خیال سے رک گیا۔ جیب سے رومال نکالا اور شیشی پر ڈال کر اسے اٹھا لیا۔ پھر اسے لپیٹ کر جیب میں رکھتے ہوئے دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گیا۔

سعیدہ بیگم اور چودھری صاحب بدستور باتیں کر رہے تھے۔ آفتاب کمرے میں داخل ہوا تو چودھری صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "ارے میاں کہاں غائب ہو گئے تھے؟ یہ تمھاری ماں پریشان ہو رہی تھیں۔"

"میں باہر باغ میں کچھ غائب ہونے والوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" آفتاب نے جواب دیا۔

"غائب ہونے والے!" چودھری صاحب چونکے۔ "تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"مثال کے طور پر مائی بیگماں۔" آفتاب نے کہا۔ "وہ حویلی کی پرانی ملازمہ تھی مگر اب کہیں نظر نہیں آتی۔"

"اوہ! بیگماں، وہ تو تین سال پہلے ملازمت چھوڑ کر جا چکی ہے۔"

"گویا تقریباً ان ہی دنوں میں جب نجمہ غائب ہوئی تھی؟"

"مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ مگر بیگماں، نجمہ کی موت کے بعد گئی تھی۔"

"موت نہ کہیے، گمشدگی کہیے۔ اس لیے کہ جس لاش کو دفنایا گیا ہے مجھے یقین نہیں کہ وہ نجمہ کی لاش تھی۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو! میں نے خود لاش شناخت کی تھی۔"

"صرف لباس اور انگوٹھی سے، ورنہ لاش ناقابلِ شناخت تھی۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اب چودھری صاحب کے لہجے میں تیزی آگئی۔

سعیدہ بیگم بھی حیرت سے اپنے بیٹے کی صورت دیکھ رہی تھیں "میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں ماموں جان کہ آپ کے بدکردار بیٹے نے نجمہ کو اپنی سازش کا شکار بنایا، اسے بہانے سے پرانی حویلی میں بلایا، وہاں اس کی عزت پر حملہ کیا اور پھر قانون کے خوف سے اسے حویلی کے تہہ خانے میں قید کر دیا۔ وہ تین سال سے وہیں زندہ درگور ہے اور مائی بیگماں اس کی نگرانی پر مامور کی گئی ہے۔"

"تمھارے پاس اس تمام بکواس کا کیا ثبوت ہے؟" چودھری صاحب غصے میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میرے پاس جو ثبوت ہے وہ میں عدالت میں پیش کروں گا۔" آفتاب نے جواب دیا۔ "لیکن اگر یہ سب آپ کی لاعلمی میں ہوا ہے تو اس کے درست و غلط ہونے کا فیصلہ ابھی کیا جا سکتا ہے۔ آپ ہمیں حویلی کے تہہ خانے میں لے چلیں۔"

"یا تو تمھیں کسی نے بہکایا ہے یا پھر تم باغ میں جا کر سو گئے تھے اور تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

"بھائی جان! یہ بڑا سنگین الزام ہے جو آفتاب نے لگایا ہے۔" سعیدہ بیگم بھی کھڑی ہوگئیں۔ "میں اپنے بیٹے کو جانتی ہوں، وہ بغیر کسی ٹھوس وجہ کے ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ حویلی میں تہہ خانہ موجود ہے۔ آپ اسے دیکھ کیوں نہیں لیتے۔ اکبر کی آوارگی کی داستانوں سے آپ ناواقف تو نہیں ہیں۔"

"ہر مہینے تہہ خانے کی صفائی ہوتی ہے۔" چودھری صاحب بولے۔ "میں اور اکبر خود صفائی کرتے ہیں۔ اگر وہاں کسی کو قید کیا گیا ہوتا تو کیا مجھ سے یہ بات چھپی رہ سکتی تھی۔"

"صفائی کے دن قیدی کو کہیں اور منتقل کیا جا سکتا ہے۔" آفتاب نے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے۔" چودھری صاحب نے غصے پر قابو پاتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ "اگر تمھارا اطمینان اسی طرح ہو سکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آؤ۔ چلو۔"

تہہ خانے کا دروازہ مرحوم چودھری انور علی کے کمرے میں واقع تھا۔ یہ کمرہ اب چودھری صاحب کے زیرِ استعمال تھا۔ سعیدہ بیگم بھی اس سے واقف تھیں۔ چودھری صاحب نے فرش میں لگا ہوا تختہ اٹھا کر نیچے جانے والے زینے کا دروازہ کھولا۔ پہلے خود اترے، بجلی کا بٹن دبا کر روشنی کی۔ ان کے پیچھے سعیدہ بیگم اور آفتاب تہہ خانے میں پہنچے جو چار کمروں، ایک کوٹھری، ایک غسل خانے اور ایک بیت الخلا پر مشتمل تھا۔ ایک ایک کر کے ہر کمرہ اور کوٹھری دیکھ لیے گئے مگر وہاں کوئی متنفس تو کجا، کسی کے رہنے کے آثار بھی نظر نہیں آئے۔

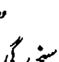
"کیوں برخوردار! اب کیا کہتے ہو؟" چودھری صاحب نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"صرف یہ...!" آفتاب نے بلا تامّل جواب دیا۔ "کہ اکبر میری توقع سے زیادہ چھپر چھپلا نکلا۔ اس نے نجمہ کو اتنی ہی مختصر مدت میں یہاں سے ہٹا دیا جتنی دیر میں آپ ہمیں یہاں آنے سے روکتے رہے۔"

"گویا تمھارا یہ خیال بدستور قائم ہے کہ نجمہ یہاں قیدی کی حیثیت سے موجود تھی؟"

"یقیناً۔" آفتاب نے کہا۔ "یہ دوسری بات ہے کہ سرِدست میں اسے یہاں سے برآمد کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"تم جو چاہو خیال کرو۔" چودھری صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "لیکن میں صرف اتنا کہوں گا کہ اگر اکبر نے کوئی ایسی حرکت کی ہوتی تو میں اسے اپنے ہاتھ سے گولی مار دیتا۔"



سعیدہ بیگم اور آفتاب تہہ خانے سے باہر آنے کے بعد مزید نہیں ٹھہرے، اپنے گھر چلے آئے تھے۔

Farrukh Malik

"تمھیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے بیٹے۔" سعیدہ بیگم نے کہا۔ "اکبر لاکھ آوارہ اور بد چلن سہی مگر ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"غلط فہمی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے امی۔" آفتاب نے جواب دیا۔ "میں نے وہاں یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں آج خود نجمہ سے ملا ہوں اور یہ بات مجھے اسی نے بتائی تھی کہ تین سال سے وہ حویلی کے تہہ خانے میں قید ہے اور مائی بیگماں اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔" یہ کہہ کر آفتاب نے نجمہ سے ملنے کی تمام روداد اپنی ماں کو سنا دی۔

"تمھیں یقین ہے، وہ لڑکی نجمہ ہی تھی؟" سعیدہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا بات کر رہی ہیں امی! اب کیا میں نجمہ کو بھی نہیں پہچان سکتا۔" آفتاب نے جواب دیا۔

"اگر وہ نجمہ تھی تو پھر کہاں غائب ہو گئی؟"

"دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو وہ اس وقت تک پرانی حویلی سے واپس نہیں پہنچی تھی یا پھر اکبر نے جو شاید کہیں چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا، اسے کہیں چھپا دیا۔ مگر میں سوچ رہا ہوں کہ وہ اسے کس جگہ چھپا سکتا ہے۔"

"ایک ایسی انتہائی محفوظ جگہ ہو تو سکتی ہے۔" سعیدہ بیگم نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کون سی جگہ؟" آفتاب نے جلدی سے پوچھا۔

"پرانی حویلی کا تہہ خانہ۔" سعیدہ بیگم نے جواب دیا۔

"کیا وہاں بھی کوئی تہہ خانہ تھا؟"

"کسی جاگیردار کی حویلی تہہ خانے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس تہہ خانے کا راز پوشیدہ رکھا جاتا ہے اور اس کا علم جاگیردار یا اس کے قریبی عزیزوں کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتا۔"

"آپ کا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے۔ میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں مگر میں تہہ خانے کو تلاش کیسے کروں گا؟"

"پرانی حویلی کا تہہ خانہ بھی اس کے عقبی حصے کے بڑے کمرے میں واقع ہے۔" سعیدہ بیگم نے جواب دیا۔ "لیکن تمھارا اس وقت وہاں اکیلے جانا مناسب نہیں، صبح پولیس کو ساتھ لے کر جانا۔"

"صبح تک بہت دیر ہو جائے گی امی۔ اگر اکبر کو مہلت مل گئی تو وہ نجمہ کو کہیں غائب بھی کر سکتا ہے اور جان سے بھی مار سکتا ہے، مجھے اسی وقت جانا چاہیے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سعیدہ بیگم نے جواب دیا۔ "خدا کرے تم نجمہ کو بچا سکو اور مجھے حشر کے دن انور بھائی جان کے سامنے سرخروئی حاصل ہو۔ جاؤ، خدا تمھارا حامی و ناصر ہو۔"

آفتاب جب پرانی حویلی پہنچا تو اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ شکستہ حویلی کی پوری عمارت زمین بوس نہیں ہوئی تھی۔ کئی کمروں کی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک دو کمروں کی چھت بھی باقی تھی مگر ملبے کے ڈھیر، جھاڑ جھنکاڑ، خودرو پودوں اور گھاس نے ہر کمرے کے فرش کو ڈھک رکھا تھا۔ آفتاب نے ایک ایک کمرے۔۔۔ خاص طور سے عقبی کمروں کا جائزہ لیا۔ ایک کمرے میں اسے تھوڑا سا فرش قدرے صاف نظر آیا۔ اگرچہ اس پر ایک ٹوٹا ہوا ستون پڑا تھا۔ آفتاب نے ستون کو اٹھایا۔ وہ کچھ زیادہ بھاری نہ تھا، آسانی سے اٹھ گیا۔ اس کے ہٹتے ہی اسے فرش میں ایک کنڈا لگا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے اسے پکڑ کر زور لگایا تو لکڑی کا تختہ اوپر اٹھتا چلا گیا۔ پھیکی چاندنی میں نیچے زینے کی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ آفتاب نے جیب سے سگریٹ لائٹر نکال کر جلایا اور اس کی روشنی میں سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچا۔

ابھی اس نے ایک دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ اسے اپنے سر پر ایک پہاڑ سا ٹوٹتا محسوس ہوا۔ ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا اور اس کا وجود۔۔۔ گہرے اندھیرے میں ڈوب گیا۔

ہوش آیا تو کوئی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ آفتاب نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ سر اٹھانے کی کوشش کی تو درد کی ایک تیز لہر نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔ نیم تاریک کمرے کے ایک کونے میں جلتی ہوئی مشعل کی روشنی میں اس نے مائی بیگماں کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" بوڑھی بیگماں نے محبت سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" آفتاب نے جواب دیا اور ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

درد کی لہر اس مرتبہ بھی ناقابلِ برداشت تھی مگر وہ ہمت کر کے اٹھ ہی گیا۔ "میں کہاں ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"تم پرانی حویلی کے تہہ خانے میں ہو۔" بیگماں بولی۔

"اور نجمہ؟"

"وہ برابر کے کمرے میں بند ہے۔" بیگماں نے جواب دیا۔ "اکبر نے تمھیں اندر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔"

"اب اکبر کہاں ہے؟"

"وہ حویلی واپس چلا گیا ہے۔" بوڑھی ملازمہ نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "میں نے مرحوم چودھری صاحب کا نمک کھایا ہے۔ اکبر کی دھمکیوں اور لالچ نے میری زبان بند کر رکھی تھی۔ مگر اب میں نجمہ بیٹی پر اس کے مزید ظلم و ستم برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ تین سال سے قید ہے۔ کچھ دن اور یہ صورت رہی تو ضرور مر جائے گی۔ صبح ہونے میں ابھی چار گھنٹے باقی ہیں۔ گاؤں کی پولیس چوکی کا داروغہ اکبر کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر تم نجمہ کی، اپنی اور میری جان بچانا چاہتے ہو تو قصبے کے تھانے تک جانا ہوگا۔ اگر صبح ہونے سے پہلے پولیس ہمیں یہاں سے آزاد نہیں کرا سکی تو ہماری موت یقینی ہے۔ اکبر نے تمھیں غائب پایا تو ساری بات سمجھ جائے گا اور یقیناً ہم دونوں کو قتل کر دے گا۔"

"خدا تمھیں اس وفاداری کا اجر دے گا مائی بیگماں۔" آفتاب نے کہا۔ "تم مجھے آزاد کر دو، میں اپنی جان پر کھیل کر بھی صبح سے پہلے انسپکٹر بھٹی کو یہاں لانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

بیگماں نے آفتاب کو گرم دودھ پینے کے لیے دیا اور بتایا کہ پرانی حویلی کا تہہ خانہ اکبر اپنی عیاشی کے لیے استعمال کرتا رہا ہے اس لیے یہاں بھی ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ گاؤں والوں میں پرانی حویلی کے بارے میں مختلف باتیں راتوں کو اکبر کی پُراسرار آمدورفت دیکھ کر ہی پھیلی ہیں۔ دودھ پی کر آفتاب کو اپنے جسم میں کچھ توانائی محسوس ہوئی۔ اس نے نجمہ سے مل کر اسے بھی تسلی دی۔

"قدرت نے تین سال کے بعد ہمیں یونہی نہیں ملایا ہے" اس نے کہا۔ "یہ تمام حالات بلاوجہ پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ ظالم کی رسّی جتنی دراز کی جا سکتی تھی، وہ کی جا چکی، اب سزا کا وقت آگیا ہے۔ یقین رکھو کہ خدا تمھیں اس مصیبت سے ضرور آزاد کرائے گا۔ بس اسی سے دعا کرتی رہنا۔"

قصبے کے تھانے کا فاصلہ پرانی حویلی سے دس گیارہ میل تھا اور یہ دس گیارہ میل آفتاب کو پیدل طے کرنا تھے۔ سر کی چوٹ کافی تکلیف دہ تھی، زخم آگیا تھا۔ جس سے خاصا خون بھی بہا تھا۔ کپڑوں پہ خون کے داغ اس کا ثبوت تھے۔ پھر چوٹ کھا کر گرنے سے بھی جسم پر کئی خراشیں آگئی تھیں مگر یہ زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ آفتاب نے کمرِ ہمت باندھی اور قصبے کا رخ کر کے بھاگنے لگا۔

وہ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں صرف ایک اچھا طالب علم ہی تھا، کوئی ایتھلیٹ نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ بیڈمنٹن یا ٹینس کھیل لیا کرتا تھا۔ پھر بھی اس نے ذہانت سے کام لیا، اپنی رفتار یکساں رکھی۔ بہت تیز، نہ بہت ہلکی۔ گاؤں کی پگڈنڈیاں ناہموار اور سڑکیں کچی نہ ہوتیں تو وہ زیادہ آسانی سے دوڑ سکتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی سانس کو پھولنے سے ممکن حد تک بچاتے ہوئے دوڑتا رہا۔ اندھیرے میں ٹھوکریں کھا کر دو بار گرا بھی.... آخر وہ ان ہی کچی سڑکوں پر کھیل کود کر جوان ہوا تھا۔ فاصلہ طے ہوتا گیا۔ مگر دس گیارہ میل کم نہیں ہوتے۔ یکساں رفتار سے دوڑنے اور سانس کو ہموار رکھنے کی...... حکمتِ عملی آخر دو میل سے پہلے ہی جواب دے گئی۔ وہ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا تو یوں لگتا تھا جیسے اب دوبارہ نہیں اٹھ سکے گا۔ وہ کچھ دیر تک یونہی بے دم سا پڑا رہا۔ اچانک اس نے کچھ فاصلے پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتے دیکھیں۔ اس نے ہمت کی اور گھسٹتے ہوئے بیچ سڑک پہ آگیا اور سر اٹھا کر قریب آنے والی روشنی کو دیکھنے لگا۔

یہ ایک حسنِ اتفاق تھا کہ اس رات انسپکٹر بھٹی خود گشت پہ نکلا ہوا تھا۔ آنے والی روشنی اسی کی جیپ کی تھی۔ اس نے دور ہی سے سڑک پر ایک آدمی کو گرے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ قریب آکر اس نے جیپ روک دی، کود کر نیچے اترا۔ اس کے ساتھ دو کانسٹیبل بھی تھے، وہ بھی نیچے آگئے۔ آفتاب سر اٹھائے انھیں دیکھ رہا تھا۔

"ارے آفتاب صاحب آپ!" انسپکٹر بھٹی نے حیرت سے کہا اور سہارا دے کر اسے کھڑا ہونے میں مدد دی۔

"خدا کا شکر ہے۔" بے اختیار آفتاب کی زبان سے نکلا۔ "آپ خود ہی مل گئے۔ میں اس وقت آپ کی تلاش میں پولیس اسٹیشن ہی جا رہا تھا۔"

انسپکٹر بھٹی نے ایک مرتبہ پھر الجھے الجھے غیر یقینی انداز میں آفتاب کی طرف دیکھا۔

"پروفیسر صاحب! آپ کو احساس ہے کہ آپ کتنی انوکھی اور ناقابلِ یقین داستان بیان کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔

"میں جانتا ہوں۔" آفتاب نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کی جگہ میں ہوتا تو شاید میرا ردِعمل بھی یہی ہوتا لیکن میں سرِدست آپ سے اکبر کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی درخواست نہیں کر رہا ہوں۔ آپ میرے

Farrukh Malik

ساتھ پرانی حویلی تو چل سکتے ہیں۔ خدا کے لیے زیادہ سوچ بچار میں وقت ضائع نہ کریں۔ صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ اکبر بھی اپنے بستر پر چین کی نیند نہیں سو رہا ہوگا۔ اگر وہ صبح ہونے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تو میں اپنی سچائی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" انسپکٹر بھٹی نے سر ہلایا۔ "میں آپ کے ساتھ پرانی حویلی چلنے کو تیار ہوں۔"

اس نے آفتاب کو جیپ میں بٹھایا اور جیپ وہیں سے گاؤں کی طرف موڑ دی۔ پھر جو فاصلہ آفتاب نے کم و بیش دو گھنٹے میں طے کیا تھا، وہ دس منٹ میں ختم ہوگیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جیپ پرانی حویلی کے کھنڈرات کے سامنے کھڑی تھی اور انسپکٹر بھٹی ایک ہاتھ میں ٹارچ دوسرے میں ریوالور لیے تہ خانے کے زینے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس کے پیچھے آفتاب اور دونوں کانسٹیبل بھی محتاط قدموں سے آرہے تھے۔

☆

ابھی صبح کے سات بھی نہیں بجے تھے کہ انسپکٹر بھٹی قصبے میں موجود پولیس کی نفری کی تین چوتھائی تعداد لے کر نئی حویلی کے پھاٹک پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ رکھ کر باقی تمام جوانوں کو حویلی کا محاصرہ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ آفتاب بھی اس کے ساتھ تھا، وہ اگرچہ مضروب اور رات بھر کی جدوجہد سے تھکا ہوا تھا مگر پھر بھی اس کے چہرے پر ایک چمک اور دبا ہوا اندرونی جوش نمایاں تھا۔

دستک کے جواب میں خود چودھری اصغر علی نے دروازہ کھولا جو صبح کی نماز کے لیے بہت پہلے اٹھ جاتے تھے۔ انسپکٹر بھٹی کو دیکھ کر انھوں نے حیرت ظاہر کی مگر جب آفتاب پر نظر پڑی تو ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے "مجھے یہ تو یقین تھا صاحبزادے کہ تم خاموش نہیں بیٹھو گے۔" انھوں نے آفتاب سے کہا اور پھر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ "مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ جیسا ذمے دار آفیسر ایک ایسی لغو اور بے بنیاد کہانی پر اعتبار کرسکتا ہے۔"

"اس پر ہم ابھی بات کریں گے چودھری صاحب!" انسپکٹر بھٹی نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے پہلے یہ بتائیے کہ کیا اکبر حویلی میں موجود ہے؟"

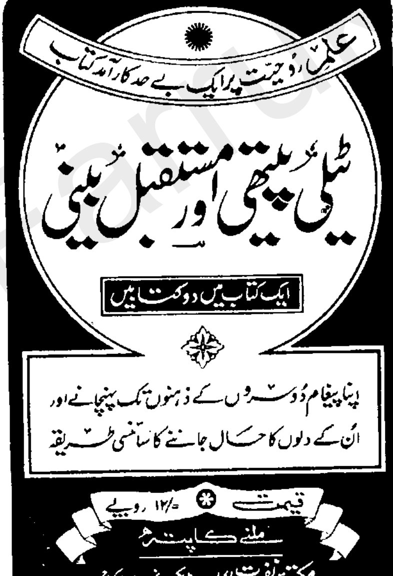
"جی ہاں، اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔"

"مجھے اندر آنے کی اجازت دیجیے۔ میرے پاس اکبر کی گرفتاری کا وارنٹ بھی ہے اور تمام حویلی کی خانہ تلاشی کا اجازت نامہ بھی — مجھے امید ہے کہ آپ قانون سے تعاون کریں گے۔"

"تو بات اتنی دور تک پہنچ گئی۔" چودھری صاحب چونکے۔ پھر آفتاب کی طرف دیکھا۔ "ماننا پڑتا ہے برخوردار کہ تم نے بڑی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ آجائیے انسپکٹر صاحب، میں آپ کی کسی قانونی کارروائی میں حارج نہیں ہوں گا۔"

انسپکٹر بھٹی نے کمرۂ نشست میں بیٹھنے کے بجائے اس راہداری میں کھڑے رہنے کو ترجیح دی جس میں اکبر کا کمرہ واقع تھا۔ چودھری صاحب نے متواتر دستک دے کر اکبر کو اٹھایا، اسے انسپکٹر بھٹی کی آمد کے بارے میں بتایا اور باہر آنے کے لیے تیاری کو پانچ منٹ دیے۔

اکبر سلیپنگ سوٹ میں کمرے سے باہر نکلا، اس کا چہرہ زرد تھا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ آفتاب پر پڑی، وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے وہ پلٹ کر بھاگنا یا کمرے میں گھس جانا چاہتا ہو مگر پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ انسپکٹر بھٹی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔



"چودھری اکبر! میں تمہیں، نجمہ بیگم کو مسلسل تین سال تک حویلی کے تہہ خانے میں قید رکھنے اور ان پر مسلسل ظلم و زیادتی کرنے کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔"

"انسپکٹر صاحب!" چودھری صاحب قدم بڑھا کر بولے۔ "اگر آپ کے پاس اکبر کا وارنٹ ہے تو میں آپ کو اس کی گرفتاری سے نہیں روکوں گا لیکن کم سے کم میں اتنا پوچھنے کا حق تو رکھتا ہوں کہ آفتاب کی بے سروپا داستان کا کوئی ثبوت بھی آپ کو ملا ہے یا آپ محض اس کے بیان پر یہ کارروائی کر رہے ہیں؟"

"چودھری صاحب! آپ مجھے برسوں سے جانتے ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔" انسپکٹر بھٹی نے جواب دیا۔ "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم نے پرانی حویلی کے تہہ خانے سے آپ کی سابقہ ملازمہ مائی بیگماں اور نجمہ بیگم کو رہا کرا لیا ہے۔ نجمہ پہلے اسی حویلی کے تہہ خانے میں قید تھیں مگر آپ کی اور آفتاب صاحب کی گفتگو سن کر اکبر نے بڑی پھرتی کے ساتھ آپ دونوں کے تہہ خانے میں پہنچنے سے قبل انھیں وہاں سے نکال کر پرانی حویلی کے تہہ خانے میں پہنچا دیا۔"

چودھری صاحب کا چہرہ ایک لمحے کے لیے سفید پڑ گیا مگر دوسرے لمحے وہ ایک دم غصے سے بپھر کر آگے بڑھے اور اپنے بیٹے کے منہ پر ایک زبردست تھپڑ رسید کیا۔

"ناخلف، یہ تو نے کیا کیا!" وہ گرجے۔ "تیرے پہلے ہی کرتوت کچھ کم نہ تھے لیکن آج تو نے میری سفید داڑھی میں سارے زمانے کی کالک مل دی۔ اسے میرے سامنے سے لے جاؤ انسپکٹر ورنہ شاید میں اسے گولی مار دوں گا۔"

اکبر سر جھکائے کھڑا تھا۔ انسپکٹر بھٹی نے ایک نظر اسے دیکھا پھر بولا۔ "اس قدر جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے چودھری صاحب! ابھی اس حویلی میں ہمارا کام ختم نہیں ہوا۔ میں اس نرس سے ملنا چاہتا ہوں جو آپ کے بھتیجے آصف کی دیکھ بھال کرتی ہے۔"

"وہ کس لیے؟" چودھری صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ میں بعد میں عرض کروں گا ـــــ پہلے مجھے اس نرس کا کمرہ بتا دیجیے۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اسے میرا کانسٹیبل لے آئے گا۔"

چودھری صاحب نے اسی راہداری کے آخری کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ کانسٹیبل آگے بڑھا، دروازے پر دستک دی اور پانچ منٹ کے بعد نرس بھی انسپکٹر بھٹی کے سامنے کھڑی حیرت و خوف کے عالم میں کبھی اکبر کو اور کبھی چودھری صاحب کو دیکھ رہی تھی۔

انسپکٹر بھٹی نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ آفتاب بول اٹھا "ایک منٹ انسپکٹر صاحب!" اس نے کہا۔ "پہلے مجھے اس سے دو باتیں کرنے کا موقع دیں۔" اور پھر انسپکٹر بھٹی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ نرس کی طرف گھوما۔ "دیکھو نرس تم ایک مقدس پیشے سے وابستہ ہو۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "اگر کسی بھی وجہ سے تم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو یہ اس کی تلافی کا پہلا اور آخری موقع ہے۔ آصف کی بیماری کی پوری کہانی ہمیں معلوم ہو چکی ہے۔ ہم نے زہر کی وہ شیشی بھی قبضے میں لے لی ہے جس کے دو تین قطرے ہر رات آصف کو اس لیے دیے جاتے تھے کہ وہ اپنی ذہنی بیماری سے صحت یاب نہ ہو۔ تم اس کارروائی میں شامل تھیں لیکن اس وقت قانون کی مدد کر کے تم نہ صرف اپنے جرم کی سنگینی کم کر سکتی ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ عدالت اسے پہلی غلطی قرار دیتے ہوئے تمھیں تمھارے تعاون کے پیش نظر معاف کر دے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔ اب پوری سچائی سے مجھے بتاؤ کہ یہ کام اکبر کب سے کر رہا تھا؟"

"اوہ نو، انسپکٹر" نرس بھٹی کی طرف پلٹی۔ "اکبر ایک احمق نوجوان ہے۔ اس کے پاس اتنی عقل نہیں۔ دواؤں اور زہروں کا اتنا علم بھی نہیں۔ یہ ساری پلاننگ تو جاگیردار صاحب کی ہے۔ یہ میں بھی نہیں جانتی کہ وہ کونسا زہر ہے" جاگیردار صاحب ہی کہیں سے لائے تھے۔ اکبر تو بس اسے ہر رات اپنے ہاتھ سے دینے کا قصوروار ہے۔"

راہداری میں موجود ہر فرد کی نظر بیک وقت چودھری اصغر علی کی جانب اٹھی۔ جو بڑی بے پروائی کے انداز میں سینہ تانے کھڑے تھے۔

"میں نے ایک آخری بازی کھیلی تھی انسپکٹر بھٹی!" چودھری صاحب کے لہجے میں کوئی کمزوری نہیں تھی۔ "مگر ہار گیا، محض اپنے اس بیوقوف بیٹے کی وجہ سے جس کے لیے میں نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے، دانا دشمن سے نادان دوست زیادہ خطرناک ہوتا ہے مگر میں بہت دور اندیش آدمی ہوں انسپکٹر! میں نے بُرے وقت کے لیے بھی ایک چال رکھ چھوڑی تھی۔ جب تک میں زندہ ہوں، تم میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہیں ڈال سکتے۔"

اور اس سے پہلے کہ کوئی چودھری صاحب کا مقصد سمجھ سکتا، انھوں نے اپنی بند مٹھی اپنے منہ میں کھول دی۔ معلوم نہیں اس دوران کس وقت انھوں نے ایک سریع الاثر زہر کا کیپسول اپنی مٹھی میں چھپا لیا تھا۔ جب تک انسپکٹر بھٹی اور آفتاب کوئی قدم اٹھاتے، چودھری صاحب لڑکھڑا کر زمین پر گرے اور ساکت ہوگئے۔ یقیناً وہ کیپسول سائنائڈ کا تھا۔ راہداری میں ایک کڑوی بو نے اس کی تصدیق کر دی۔

تمام واقعات نجمہ، بیگاں اور نرس کے بیانات کی روشنی میں پہلے ہی واضح ہو چکے تھے۔ چودھری صاحب کی موت نے اکبر کی قوتِ مزاحمت بھی ختم کر دی۔ اس نے اپنے اعترافِ جرم میں تمام الزامات کی ذمہ داری قبول کر لی، صرف اتنے اضافے کے ساتھ کہ شروع میں چودھری صاحب نے اسے بھی اپنے منصوبے سے بے خبر رکھا تھا۔ اس کی زبان سے نجمہ کا واقعہ سنتے ہی انھوں نے اپنے خاص آدمیوں کو پرانی حویلی بھیج کر اپنے اور اکبر کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بے ہوش نجمہ کو اٹھوا کر نئی حویلی کے تہہ خانے میں بند کرا دیا تھا۔ یہ بات انھوں نے دوسرے دن اکبر کو بتائی اور تب سے صرف اکبر ہی کو آگے رکھا تاکہ محبوس نجمہ اور مائی بیگاں، دونوں اسے ہی تمام واقعات کا ذمے دار خیال کرتی رہیں۔ اس میں ان کی مصلحت یہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ جب نجمہ کی مزاحمت کمزور پڑ جائے گی تو وہ اس کے ہمدرد بن کر، یوں جیسے انھیں اچانک تمام باتوں کا علم ہوا ہو، تہہ خانے سے آزاد کر دیں گے اور پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد اسے سمجھا بجھا کر اکبر سے شادی پر آمادہ کر لیں گے۔ یہ بہر حال ان کا ایک خیال تھا کہ شاید نجمہ ان کی بات مان لے۔ آصف کو بڑی بہن کی گمشدگی اور پھر موت سے واقعی گہرا جذباتی صدمہ پہنچا تھا مگر وہ ٹھیک ہو جاتا یہ صرف چودھری صاحب کی سازش تھی کہ وہ مسلسل بیمار چلا آ رہا تھا اور اس سے ان کا مقصد پوری جاگیر پر قبضہ کرنا تھا۔ نرس بھی اکبر کا شکار بن چکی تھی اور اکبر نے اسے شادی کا لالچ دے کر ساتھ دینے پر آمادہ کیا تھا۔ اعترافِ جرم کے بعد اکبر کا مقدمہ عدالت میں پیش کر دیا گیا جہاں سے بالآخر اسے عمر قید کی سزا ہوگئی۔

آصف چند ہفتوں کے علاج کے بعد بالکل صحت یاب ہوگیا۔ وہ سب ایک بار پھر نئی حویلی میں خوشگوار زندگی بسر کرنے لگے اور اس مرتبہ وہ تنہا بھی نہیں تھے بلکہ سعیدہ بیگم اور آفتاب بھی ان کے ساتھ تھے۔ جس مکان میں سعیدہ بیگم نے اپنی آزمائش کے دن گزارے تھے وہ مکان اکبر کی بیوی اور دو بچوں کو دے دیا گیا۔ جہاں نجمہ اور آفتاب ہر طرح ان کا خیال رکھتے اور خبر گیری کرتے تھے۔

ان واقعات کے تقریباً تین ماہ بعد جب سب کچھ معمول پر آگیا تھا، ایک رات نجمہ اور آفتاب کھانا کھا کر باغ میں چہل قدمی کرنے نکلے۔

"میرا خیال ہے،" آفتاب نے رات کی رانی کے کُنج کی طرف بڑھتے ہوئے کہا، "کہ مجھے اب وہ بات کہہ ہی دینا چاہیے جس کا وعدہ میں نے اس عید سے ایک دن قبل کیا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، یہ جاننا چاہوں گا کہ تم مجھ سے کونسی بات کہنا چاہتی تھیں۔"

"میں کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔" نجمہ بولی۔ "مگر اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ میرے سوال کا جواب غزالہ پہلے ہی دے چکی ہے۔"

"پہلے میں کچھ بتانا چاہتا تھا مگر آج کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔" نجمہ مسکرائی۔ "ممتحن کی غفلت سے پرچا پہلے ہی آؤٹ ہو چکا ہے۔"

"پھر طالب علم کو پاس کیا جائے گا یا دوبارہ امتحان لینے کا خیال ہے؟"

"سنا ہے طالب علم جب پروفیسر بن جائے تو اس کا امتحان صرف ایک ہی ہستی لے سکتی ہے.... اس کی بیوی۔"

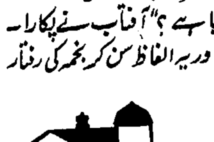
"تو پھر....!!"

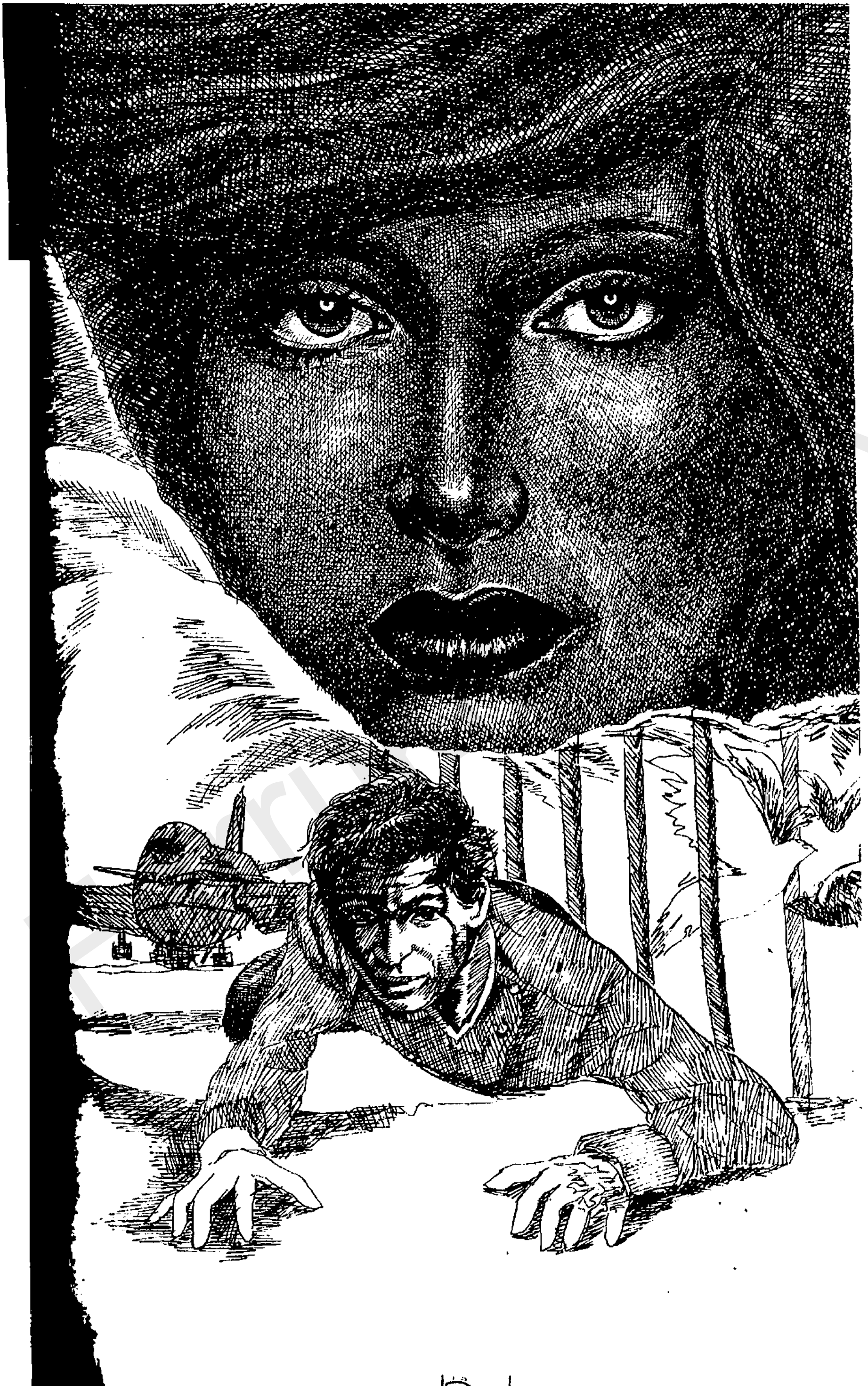
"اونہہ....!" وہ جلدی سے بات کاٹ کر بولی۔ "یہ مسئلہ ہمارے طے کرنے کا نہیں۔"

"اوہ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" آفتاب نے سر کھجایا۔ "چلو پھر ابھی امی کے سامنے پیش کیے دیتے ہیں۔"

اب تک یہ باتیں بڑی سنجیدگی و آزادی سے ہو رہی تھیں مگر آفتاب کی بات سنتے ہی نجمہ کو کچھ ایسی حیا دامنگیر ہوئی کہ وہ گھوم کر حویلی کی طرف بھاگ نکلی۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" آفتاب نے پکارا۔ "مجھے بھی تو آنے دو۔" اور یہ الفاظ سن کر نجمہ کی رفتار کچھ اور تیز ہوگئی۔





منزلِ مراد

صبا احمد

کبھی کبھی انسان کو ناکردہ گناہوں کی سزا بھی کاٹنی پڑ جاتی ہے۔ وہ ایک معزز، شریف اور پابندِ قانون شہری تھا اور پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا کہ اچانک ہی الجھے ہوئے واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا اور اس کی ذات گویا ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا خزاں رسیدہ پتا بن گئی۔ اس ماہ کے سرورق کی تیسری کہانی

دوپہر کا سورج ڈھلنے لگا تھا۔ بیگار سے درماندہ قیدی، پیٹ کے تنور میں دو بدنما، آدھی کچی آدھی پکی روٹیاں ڈالنے کے بعد پھر زنجیر و سلاسل کے ساتھ مشقت کے لیے ہانکے جا رہے تھے۔ کنکروں والی، پانی کی طرح پتلی بے مزہ دال اور یہی دو روٹیاں ان کا لنچ تھیں جسے کتے کے راتب کی طرح انھیں مقررہ وقت پر ڈال دیا جاتا تھا۔ اتنی ہی تحقیر اور ذلت آمیز رویے کے ساتھ۔ کھانا گھروں میں بھی پک رہا تھا یا دسترخوان پر لگایا جا رہا تھا اور کھانے کی میز پر سجایا جا رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں بھی محنت کش لوگ کھانے میں مصروف تھے اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ریستوراں میں بزنس لنچ بھی سرو کیے جا رہے تھے۔ اشتہا انگیز خوشبو والے مرغن اور پُرلطف کھانے جو لذتِ کام و دہن سے طمانیت اور مسرت کا احساس عطا کرتے ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ بیش قیمت اور انمول وہ احساس ہے جس کا کسی کو احساس نہیں ہوتا۔ یہ آزادی کا احساس ہے اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا احساس۔ آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کا، کہیں بھی آنے جانے کا، کسی سے بھی ملنے کا یا نہ ملنے کا۔ ہنسنے بولنے، سونے اور تفریح کرنے کی آزادی کا احساس۔

وہ جو دیوارِ زنداں کے ناقابلِ شکست حصار میں مقید تھے، ان سب آزادیوں سے محروم تھے اور یہی احساس ان کی سزا تھا۔ ان کی قید و بند کی معیاد جدا جدا تھی۔ ایک ماہ سے ایک عمر تک کی قید کاٹنے والے سب بے بس اور مجبور انسانوں کا ایک گروہ تھے جو اپنے اپنے جرم کی پاداش میں دنیا کے نظامِ انصاف سے سزا پا کے ایک ہی جگہ پہنچے تھے۔ بندہ و صاحب و محتاج و غنی۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے لیکن یہ بات دنیا کی حد تک ایک بے بنیاد فلسفہ تھی۔ وہ جس کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا، نہ عزیز، دوست اور نہ مال و زر۔ وہ بے گناہ اسیر تھے۔ ان کے مقدمات عدالتوں تک پہنچے ہی نہ تھے اور سوائے خدا کے انھیں کسی سے امید نہ تھی کہ قیدِ حیات پوری ہونے سے پہلے انھیں قیدِ زنداں سے رہائی دلائے۔ وہ جن کے پاس مال و زر تھا، قیدِ بامشقت بھی یوں کاٹتے تھے جیسے غمِ جہاں سے نجات پانے کے لیے اور غمِ روزگار کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس دنیا میں آ گئے ہیں جہاں باہر کی دنیا کے تفکرات کا گزر نہیں لیکن باہر کی دنیا کی ہر آسائش ان کی قوتِ خرید اور ان کی دسترس میں ہے۔ وہ فراغت اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے لیے گھروں سے پُرتکلف کھانے آتے تھے۔ سگریٹ سے لے کر اخبار، رسائل، ریڈیو اور ٹی وی تک سب کچھ ان کو حسبِ ضرورت مل جاتا تھا۔ ان سے ملاقات کے لیے آنے والوں کے لیے جیل مینوئل کا کوئی ضابطہ نہ تھا اور خود ان کے ساتھ جیل کے ماتحت عملے کا رویہ ایسا ہوتا تھا جیسے وہ قیدی نہیں مہمان ہیں۔ یہ سب آسائش اور عزت وہ اپنے پیسے سے خریدتے تھے اور قواعد و ضوابط کے مطابق اپنی سزا میں تخفیف کرانے کے بعد آدھی سزا کی معیاد پوری کر کے چلے جاتے تھے۔

Farrukh Malik

میں یہ سب پہلے بھی جانتا تھا اور اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نہ کسی اخبار کا رپورٹر تھا جو بچشم خود جیل کے اندر کے حالات کا مشاہدہ کرنے پہنچا ہو اور نہ کسی تنظیم کا رکن جس کا مقصد جیل کے حالات کو درست کرنا ہو۔ میں تو مجرم تک نہ تھا لیکن عدالت نے شہادتوں اور گواہوں کے بیانات کو سچ تسلیم کرتے ہوئے مجھے قتل کا مجرم گردانا تھا اور سات سال تک جیل کی سی کلاس میں قیدِ بامشقت کاٹنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ قاتل کا خطاب پانے سے پہلے میں ایک انجینئر تھا۔ میرا ایک گھر تھا، میرے پاس ایک گاڑی تھی اور میرا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ مجھے بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ثروت نے بہترین وکیل کیے تھے اور ان کو فیس ادا کرنے کے لیے میرا سارا بینک بیلنس قربان کر دیا تھا۔ میری گاڑی اور اپنے زیورات بیچ دیے تھے۔ اس سے پہلے کہ میرا گھر بھی فروخت ہوتا، میری آخری اپیل نامنظور ہو گئی اور مجھے زنجیر بدست، جیب کتروں، چوروں، قاتلوں اور ڈاکوؤں کے ریوڑ میں شامل کر دیا گیا۔ یہ احساس مجھے مارے ڈالتا تھا کہ اب میرے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا کوئی دنیاوی وسیلہ باقی نہیں رہا اور مجھے سات سال تک ایک ناکردہ گناہ کی سزا کاٹنی ہے۔

سات سال میں دنیا کتنی بدل جائے گی، اس کا تصور بھی محال تھا۔ یہ سات سال مجھے اتنا بوڑھا کر دیں گے جتنا باہر کی دنیا میں چودہ سال بھی نہیں کر سکتے تھے اور جب سزا یافتہ قاتل کا لیبل لگا کے میں پھر دنیا میں قدم رکھوں گا تو دنیا کا رویہ میرے ساتھ کیا ہوگا؟ میری اپنی دنیا میں میرے لیے جگہ ہوگی یا نہیں اور زندگی سے سات سال منفی کرنے کے بعد پھر مستقبل کے لیے باعزت زندگی کی بنیاد رکھنا ممکن ہوگا یا نہیں؟ یہ بہت دور کی بات تھی۔ میں تو طے کر چکا تھا کہ سات سال تک یہ عذاب جھیلنے پر میں موت کو ترجیح دوں گا۔ میں فرار کی کوشش کروں گا اور فرار ہوتے ہوئے مارا گیا، تب بھی مجھے افسوس نہیں ہوگا لیکن میں نے خاموشی سے سات سال کی جیل کاٹی تو میرے ضمیر پر ایک بوجھ ہوگا کہ میں نے اس ظلم کے خلاف احتجاج تک نہیں کیا۔ احتجاج کی عملی صورت یہی تھی کہ میں اندھے قانون کی ساری دیواریں گرا کے اور زنجیر و سلاسل توڑ کے اپنا حق حاصل کر لوں۔ آزادی اگر دنیا کے سارے بے گناہ انسانوں کا حق تھی تو یہ حق مجھے بھی حاصل ہونا چاہیے۔

جیل کے اندر پہنچنے سے پہلے میں نے یہی عزم کیا تھا مگر اندر دُہری دیواروں، مقفل کوٹھریوں اور مسلح سنتریوں کے حفاظتی نظام نے میرے عزم کو خاک میں ملا دیا۔

ایک بید پڑتے ہی میری کمر پر آگ کی لکیر دہکنے لگی۔

”خواب دیکھ رہے ہو انجینئر صاحب۔“ ایک بیلدار نے طنز سے کہا۔ ”نئے پنچھی ہو، اُڑنے کی سوچ رہے ہو؟“

”اُڑنا تو اپنے اختیار کی بات نہیں۔“ میں نے ایک ہاتھ سے کمر کو ملتے ہوئے کراہ کر کہا۔ ”لیکن کیا اُڑنے کے خواب دیکھنا بھی جیل مینویل کی خلاف ورزی ہے؟“

اس نے میرے ہاتھ پر بید سے وار کیا۔ ”پڑھے لکھے ہو نا۔ باتیں بہت کرتے ہو۔ چند دن میں سب بھول جاؤ گے بیٹا؟“

اسے جواب دینے کے بجائے میں نے سر جھکا کے بیگار میں مصروف ہو جانا بہتر سمجھا۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ مجھے پڑھا لکھا سمجھ کے گندی گالیاں نہیں دیتے تھے اور میری پٹائی ایسے نہیں کرتے تھے جیسے قلاش چوروں اور جیب کتروں کی کرتے تھے۔ ڈاکو اور منشیات فروش یا اسمگلر معزز لوگ تھے، نگراں عملہ ان سے انعام تو پاتا ہی تھا، ان سے ڈرتا بھی تھا کیونکہ جیل سے باہر ان کے ساتھی کسی طرح بھی کم خطرناک نہ تھے اور ان کے ساتھ زیادتی کی جاتی تو جیل خانے کے نچلے درجے کے عملے کا گھر بار اور بیوی بچے عتاب کا نشانہ بنتے۔

”گھر کا آرام بہت یاد آتا ہے؟“ وہ کچھ دیر خاموشی سے میری عرق ریزی کا تماشا دیکھنے کے بعد بولا۔

”آرام ملے نہ ملے، گھر تو گھر ہی ہوتا ہے۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ ”اس لیے کہ وہاں گھر والی ہوتی ہے۔ بہت خوبصورت ہے تیری بیوی؟ تیرا انتظار کرے گی وہ؟“

میں نے اس مشتعل کرنے والی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور زمین کھودتا رہا۔

”انجینئر صاحب! عورت کی ذات میں وفا نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”اچھا کھانے کو دیتے رہو، پہننے کو دیتے رہو، عیش آرام ملے تو پھرتی رہے گی پیچھے پیچھے۔ بڑے نخرے دکھاتی ہے، بڑا پیار جتاتی ہے۔ یہ سب نہ ہو تو ہر مرد اسے بے پروا سنگدل اور ظالم نظر آنے لگتا ہے۔“

”اپنے اپنے تجربے کی بات ہے۔ میرا خیال ہے عورت کی ذات میں وفا ہے، پیار ہے اور ممتا ہے۔“ میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے سر اٹھا کے کہا۔ وہ ایک دم مجھ پر بپھر پڑا۔ اس نے بے دردی سے میرے جسم پر بید برسائے۔

”بھونکتا ہے تو کتے۔ تیری وہ بیوی بھی ایسی ہی ایک عورت ہے۔ وہ سات سال تک تیرا انتظار نہیں کرے گی۔“ وہ چلانے لگا۔

Farrukh Malik

میں نے کدال اٹھا کر اس کا سر پھاڑنے کی سوچا اور رک گیا۔ ”وہ تمھاری بیوی ہوگی جس نے ایسا کیا ہوگا اور اسی لیے تم سب عورتوں کو گالی دیتے ہو لیکن تم دیکھ لینا، میں سات سال یہاں نہیں رہوں گا اور جب میں یہاں سے نکلوں گا تو وہ میری منتظر ہوگی۔ ہم دونوں بھاگ جائیں گے۔“

”بھاگ جائیں گے۔“ اس نے پھر مجھ پر حملہ کیا۔ ”اس جیل خانے سے آج تک کوئی زندہ فرار نہیں ہوا انجینئر صاحب! تیری لاش جاسکتی ہے یہاں سے، تیری روح نکل سکتی ہے، سات سال پورے ہونے سے پہلے۔“

”بیلدار! کچھ تو خیال کرو۔“ ایک مانوس آواز نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ”مارنا ہے تو مجھے مار لو۔“

”یہ سور کا بچہ کہتا ہے میں بھاگ جاؤں گا۔“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھا لوں گا اسے۔“ کرم داد نے کہا۔ ”نیا نیا آیا ہے۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ جیل سے کوئی نہیں نکل سکتا۔ اس پاگل کا کیا ہے، یہ عدالت میں بھی اسی طرح چلا رہا تھا۔“

”تو بڑا حمایتی بنتا ہے اس کا کرم داد۔“ بیلدار نے کہا۔ ”اس کو سمجھا دے کہ گڑبڑ کرے گا تو سزا بڑھتی جائے گی۔ پھر پاگل وارڈ میں بھجوا دوں گا۔ پاگل ہو کے مرے گا۔“

میں کدال رکھ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ جیل کے سات دنوں میں میری قوتِ مزاحمت بہت کم ہوگئی تھی لیکن ابھی بھی مجھے اپنے جذبات پر قابو نہ تھا۔ میں وہ کہہ جاتا تھا جو سچ ہوتا تھا اور جو میرا جرم بن جاتا تھا۔

”کتنی بار سمجھایا ہے تجھے یار کہ زبان کاٹ دے اپنی۔“ کرم داد نے میرے پاس بیٹھ کے مجھے ایک گھٹیا سگریٹ پیش کی۔ ”پی لے۔ نشہ نہیں ہے اس میں۔ وہ دوسری ڈبی ہے۔“

میں نے اپنے درد کرتے جسم کو پیڑ کے تنے سے لگا کے ایک گہری سانس لی اور سگریٹ جلالی۔ ”مجھے تو لگتا ہے کئی سال گزر گئے ہیں کرم داد۔“ میں نے کہا۔ ”حالانکہ ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا ہے۔“

”شروع میں سب کو ایسا ہی لگتا ہے۔“ کرم داد نے کہا۔ ”ارے بابا! جیل ایسی ہی جگہ ہے۔ اپنے لیے مصیبت کیوں پیدا کرتا ہے۔ جتنا بولے گا اتنا ہی مشکل میں پڑے گا۔ یہ تجھے خطرناک مجرم قرار دے کر..... بیڑیاں پہنا دیں گے۔ تیرے گلے میں طوق ڈال دیں گے۔ چوبیس گھنٹے پنجرے میں بند رکھیں گے تجھے۔ رپورٹ کردیں گے کہ تو دوسروں کو فساد پر اکساتا ہے۔ نشے والی سگریٹیں بیچتا ہے۔ تیری کوئی نہیں سنے گا۔ یہ لوگ تجھے زہر دے کر مار ڈالیں گے اور کہہ دیں گے، قیدی نے خودکشی کرلی ہے۔ تجھے پاگل کردیں گے انجکشن لگا کے۔“

خوف و دہشت سے میرا وجود سن ہونے لگا۔ ”یہ خدا نے مجھے کس گناہ کی سزا دی ہے کرم داد؟“

”خدا کو بیچ میں مت لا۔“ کرم داد نے برہمی سے کہا۔ ”تو سچا ہے تو ثابت کر ورنہ چپ بیٹھ۔ جتنے دن یہاں کاٹنے ہیں، سکھ سے کاٹنے ہیں تو میری مان۔ اگر پیسہ نہیں ہے خرچ کرنے کو تو ان کتوں کی سیوا کر، ان کی خوشامد کر، غلامی کر ان کی۔ ان کو اپنا باپ سمجھ۔“

”لیکن کرم داد، میں سات سال ایسے نہیں گزار سکتا۔ میرے لیے ناممکن ہے۔“ میں نے کہا۔

”سب ممکن ہو جائے گا بیٹا۔ جب سات سال پورے ہوں گے تو تجھے پتا چلے گا کہ سات سال واقعی گزار لیے ہیں تو نے۔“ کرم داد بولا۔ ”لیکن تو فکر مت کر۔ موقعے کا انتظار کر۔ صبر سے کام لے، دماغ ٹھنڈا رکھ۔ میں بھی جانتا ہوں تیرے ساتھ ظلم ہوا ہے اور تو کیا چاہتا ہے؟ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا لیکن ابھی کوئی وعدہ نہیں کرسکتا کہ اس میں کتنے دن لگیں گے۔ ایک خبر ملی ہے مجھے۔ کل تک معلوم کرکے بتاؤں گا۔“

کرم داد پر اپنے باپ کے کاروباری حریف کو قتل کرنے کا الزام تھا جس نے مشترکہ کاروبار کے حساب میں سے پیسہ خرد برد کیا، پھر اسی سے اپنا کاروبار الگ کیا اور ہر قسم کے غیر اخلاقی اور غیر قانونی حربے اختیار کرتے ہوئے اپنے سابقہ پارٹنر اور پرانے دوست کو معاشی طور پر تباہ کردیا۔ خود اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہوسکا تھا۔ چوری کے بعد وہ سینہ زوری میں اس حد تک آگے بڑھ گیا تھا کہ اس نے الٹا کرم داد کے باپ پر ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر کردیا تھا اور کرم داد کا باپ جو صدمے برداشت کرنے کی محدود انسانی قوت رکھتا تھا، ایک دن مشتعل ہو کے اسے قتل کر بیٹھا تھا۔ کرم داد ایک غیر ذمے دار اور نافرمان سمجھا جانے والا لڑکا تھا جس نے کبھی نہ کاروبار میں دلچسپی لی تھی اور نہ کسی طرح باپ کے واحد جانشین کی حیثیت سے یہ فرض سمجھا تھا کہ اسے باپ کی مدد کرنی چاہیے لیکن وقت آیا تو اس نے قتل کا الزام اپنے سر لے لیا۔ اس کی سزائے موت اعلیٰ عدالت کے حکم پر عمر قید میں بدل گئی تھی اور وہ جیل میں اپنی نصف سزا کاٹ چکا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ بعد میں اس کے باپ کا کاروبار چمک اٹھا تھا کیونکہ وہ شخص جو دسیوں آزار تھا، مالی طور پر زیادہ مستحکم حریف تھا اور کاروباری جوڑ توڑ کرنے کی بہتر صلاحیت کا مالک تھا، باقی نہ رہا تھا۔ اس نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی بھی بڑی دھوم دھام سے کردی تھی اور اب دوسری شادی کرچکا تھا۔ اس دوسری شادی سے اس کو دوسرا وارث مل گیا تھا۔ کرم داد

نے سب کچھ اپنی ماں کو بیوہ ہونے سے بچانے کے لیے کیا تھا اور اس لیے کیا تھا کہ بہنوں کے سر پر باپ کا سایہ قائم رہے۔ وکیلِ صفائی کے علاوہ اسے دنیا نے سمجھایا تھا کہ وہ اعترافِ جرم نہ کرے تو اس کے مقدمے کو سپریم کورٹ تک لے جانا ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ شہادتوں کو کمزور اور گواہوں کو ناقابلِ اعتبار ثابت کر دیا جائے مگر کرم داد نے ہمیشہ ہنس کر یہی کہا تھا کہ یار بہت دیکھ لی دنیا اور بہت عیش کر لیا۔ اب اپنی بخشش کے لیے ایک نیکی تو کرنے دو۔ شاید بہنوں اور ماں کے لیے یہ قربانی دے کر اور باپ کو اس کی زندگی سونپ کر وہ خدا کے حضور محض نامۂ اعمال کی سیاہی کے بارِ ندامت کے ساتھ پیش نہ ہو۔ اسے سزا ہو گئی اور ان سب نے جو حقیقتِ حال سے واقف تھے اس کی طرف سے اپیل بھی داخل کر دی حالانکہ وہ خود اس کے لیے تیار نہ تھا مگر سب کے سامنے وہ مجبور ہو گیا۔ عدالتِ عالیہ نے اس کی سزا میں تخفیف کیوں کی تھی؟ یہ خود کرم داد کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کیونکہ اس پر ہر طرح سے قتلِ عمد ثابت تھا۔

سزا ہو جانے کے بعد اس کے دوست احباب، والدین اور اس کی بہنیں سب اس سے باقاعدگی کے ساتھ ملنے آتے رہے لیکن صرف چھ ماہ میں دوست ملنے والوں کی فہرست سے خارج ہو گئے۔ جب اس کی بہنوں کی شادی ہوئی تو ان کا آنا بھی بند ہو گیا کیونکہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ رخصت ہو کے دوسرے شہر چلی گئی تھیں اور ان کے شوہروں کو یہ پسند بھی نہ تھا کہ ایک سزا یافتہ قاتل سے تعلق کسی طرح بھی ان کی نیک نامی پر اثر انداز ہو۔ رشتہ تو انھوں نے اس لیے کر لیا تھا کہ وہ "شریف" لوگ تھے اور کہتے یہی تھے کہ بیٹے کے جرم کی سزا سارے خاندان کو نہیں ملنی چاہیے لیکن اصل بات یہ تھی کہ انھیں بھاری جہیز ملا تھا۔ ان کی بیویاں انتہائی خوبصورت، تعلیم یافتہ اور سلیقہ شعار تھیں اور جب شادی ہوئی تھی تو کرم داد کو سیشن کورٹ سے سزائے موت ہو چکی تھی۔ عام لوگوں کی طرح ان کو بھی یقین تھا کہ اعلیٰ عدالت میں اپیل مسترد ہو جائے گی اور کرم داد نہ رہا تو ان کے سسر کا تمام کاروبار دونوں بہنوں کا حق ہو گا۔ وہ کلرکی چھوڑ کے بزنس کریں گے اور سال دو سال بعد مال دار کہلائیں گے۔ عدالتی فیصلہ بدل جانے سے اُن کا رویّہ بدل گیا۔ اب وہ "شریف" لوگ ایک قاتل کی بہن کا شوہر کہلانے کے روادار بھی نہ تھے اور انھوں نے اپنی بیویوں کو سمجھا دیا تھا کہ ملنے کی خواہش کا اظہار تو دور کی بات ہے انھوں نے سزا یافتہ بھائی کا نام بھی لیا تو خود ان کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔

ماں باپ اس کے بعد بھی پہلے ہفتے میں ایک بار اور پھر ہر ماہ ملنے کے لیے آتے رہے اور کرم داد کو جیل میں ہر طرح کی سہولت فراہم کرنے کے لیے بھی کوشاں رہے۔ پھر باپ کا آنا کم ہو گیا اور ماں زیادہ دُکھی نظر آنے لگی۔ بالآخر ایک دن اس نے بیٹے کو بتا دیا کہ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی ہے اور اس کی نئی جوان بیوی پوری طرح اس پر حاوی ہے۔ کرم داد نے پیغام بھیج کے باپ کو بلوایا اور اس آخری ملاقات میں اس پر واضح کر دیا کہ وہ خود کو محفوظ نہ سمجھے۔ جیل میں قیام کے دوران میں اس کے تعلقات بہت وسیع ہو گئے ہیں اور وہ ایسے لوگوں کو جانتا ہے جو خود تو جیل کے اندر ہیں لیکن باہر ان کے ساتھی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اغوا اور آتش زنی سے قتل تک۔ اور اگر وہ لوگ نہ کر سکے تو کرم داد باہر نکلتے ہی پہلا کام یہ کرے گا کہ اسے ٹھکانے لگا دے گا۔ اگر وہ باپ کے کاروباری حریف کو ختم کرنے کا اہل تھا تو رہائی پانے کے بعد ماں کی سوکن کے ٹکڑے بھی کر سکتا ہے۔ خیریت مطلوب ہے تو اس کی ماں کے ساتھ بہتر سلوک میں فرق نہیں پڑنا چاہیے، اس کی عزت اور حیثیت میں کمی نہیں آنی چاہیے اور اسے کسی قسم کی ذہنی یا جسمانی اذیت نہیں پہنچنی چاہیے۔ دوسری بات کرم داد نے یہ کہی کہ آئندہ وہ باپ سے ملنا نہیں چاہتا مگر باپ کو مالی اعانت کا وہ سلسلہ برقرار رکھنا ہو گا جس کے باعث کرم داد کو جیل میں متعدد عایات حاصل تھیں۔ باپ ڈر گیا۔ وہ لوٹ کر تو نہیں آیا مگر کرم داد کو حسبِ ضرورت ہزار دو ہزار روپیہ ماہانہ بھیجتا رہا جو وعدہ کرم داد نے اپنی ماں کے متعلق لیا تھا وہ پورا ہونے کے باوجود پورا نہ ہو سکا۔ عورت کا سکھ چین اس کا سہاگ ہوتا ہے یا اس کی اولاد ہوتی ہے اور تقدیر نے یہ دونوں سہارے اس سے چھین لیے تھے تو صرف دنیاوی زندگی کی آسائش کے لیے جی کر وہ کیا کرتی۔ ایک سال کے اندر اندر وہ بھی گھُل گھُل کے ختم ہو گئی۔ جب کرم دار کا باپ اسے یہ اطلاع دینے آیا تھا تو کرم داد نے اس کی صورت بھی دیکھنے سے انکار کر دیا تھا اور جواب میں یہ کہلا دیا تھا کہ اب ان کے درمیان کسی قسم کا تعلق نہیں۔ وہ اپنے وارثوں کی فہرست میں سے کرم داد کا نام خارج کر دے لیکن بیٹیوں کو ان کا حق دینا نہ بھولے ورنہ اسی انجام کے لیے تیار رہے جس کے بارے میں کرم داد بہت پہلے خبردار کر چکا تھا۔ اب اس سے ملاقات کے لیے آنے والا کوئی نہیں تھا۔ سوائے کسی اجنبی نامہ بر کے جو ماہ بہ ماہ دو تین ہزار روپے دے کر خاموشی سے لوٹ جاتا تھا۔ کرم داد اسے اپنے باپ کی لائف انشورنس کا پریمیم کہتا تھا۔

جیل خانے میں وہ میرا پہلا دوست اور ہمدرد تھا۔ اس نے مجھے اپنی نئی دنیا میں جینے کے ادب آداب ہی نہیں سکھائے

میری بات بھی سُنی اور اس پر یقین بھی کیا۔ دوسرے مجرم ایک منفی اور انتقامی ردِ عمل رکھتے تھے اور مجھ پر ہنستے تھے۔ میری تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور جیل کے عملے کے مظالم کا بدلہ مجھ سے لینے کی کوشش کرتے تھے۔ کرم داد سے میرا تعلق بھی ایک ناخوشگوار حادثے کا نتیجہ تھا۔ ایک بار میرے حصے کا کھانا ایک ایسے شخص نے چھین کر کھالیا جو بدمعاشوں کی دنیا کا بدمعاش تھا اور اس کا یہی دستور تھا کہ جس پر بس چلتا تھا اس سے حلق کا نوالہ تک چھین لیتا تھا۔ "یہ ہمارا دستور ہے۔ ہم باری باری سب سے ایک وقت کی روٹی لیتے ہیں کیونکہ جتنا راشن ملتا ہے اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔" اس نے کھانے کے بعد ڈکار لے کر کہا تھا اور میں دم نہ مار سکا تھا کیونکہ وہ اکیلا نہیں تھا اور میں اس وقت تک بالکل اکیلا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے نوٹ کیا کہ وہ بدمعاش اُس کی روٹی چھین کر کھاتا ہے جس کا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہو۔ پرانے قیدیوں نے اپنے اپنے گروہ بنا رکھے تھے یا دوستی کے حلقے قائم کرلیے تھے۔ وہ اس کی ستم ظریفی سے محفوظ تھے۔ دوسری بار اس نے میرے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے وارڈن سے شکایت کرنے کی دھمکی دی۔ وہ بہت ہنسا۔ اس کے ساتھیوں نے میری گوشمالی کی اور وہ میرے حصے کا کھانا کھاتا رہا۔ اگلے دن مجھے دنگا فساد کرنے کے جرم میں ایک ہفتے کے لیے قیدِ تنہائی میں بند کردیا گیا۔

بند قید سے میں کھلی قید میں پہنچا تو مجھے کرم داد کے ساتھ لگادیا گیا۔ اسے تمام واقعے کی خبر مل چکی تھی۔ "تُو نے زرگل کو دھمکی دی تھی کہ وارڈن سے شکایت کردے گا؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ وہ ایک ہفتے پہلے میرا کھانا دوسری بار چھین کر کھاگیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور میں کیا کرتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آئندہ بھی تو یہی کرے گا؟" کرم داد نے تحقیر آمیز طنز سے کہا۔

"اور میں کیا کرسکتا ہوں؟" میں نے خفت سے کہا۔

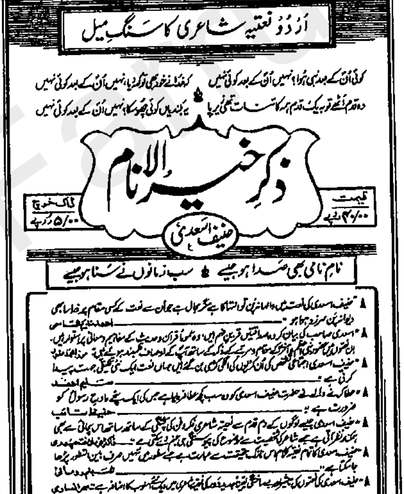
"کیوں؟ تو اس کتے کے بچے کے دانت نہیں توڑ سکتا؟" وہ بولا۔ "جوان آدمی ہے ہاتھ پاؤں مضبوط ہیں تیرے شکایت کرے گا تو پھر پنجرے میں بند ہوجائے گا۔ ایسے بند ہی ہونا ہے تو مار سالے کو۔"

"وہ۔ اس کے ساتھ دوسرے بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہاں کوئی کسی کے ساتھ نہیں۔ سب طاقتور کے ساتھ ہیں۔" کرم داد نے کہا۔ "ایک مرتبہ خود کو طاقتور ثابت کردے۔ ہڈیاں تیری بھی ٹوٹیں گی مگر اس کو بھی اٹھنے کے قابل مت چھوڑ۔ پھر دیکھ کیا ہوتا ہے۔"

"آج پھر تیری باری ہے۔" اگلی مرتبہ زرگل نے مجھ سے کہا۔ "آج تو روٹی دے گا مجھے۔" تو میں نے اس کے ایک جھانپڑ دیا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری۔ "ایسی کی تیسی باری کی۔" میں نے کہا۔ "آج تیری مار کھانے کی باری ہے۔"

"اس کے بعد ایک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مار مجھے ہی زیادہ پڑی لیکن زرگل بھی اٹھنے کے قابل نہ رہا۔ لڑائی شروع ہونے کے بعد میں نے نوٹ کرلیا تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ وہ سب جو مجھ پر ہنس رہے تھے اور زرگل کو اُکسا رہے تھے کہ مار مار کے میرا حلیہ بگاڑ دے، اب خاموش ہیں۔ کچھ دیر بعد پہلا شخص میری حمایت میں لڑنے کے لیے میدانِ کارزار میں اترا، یہ کرم داد تھا۔ اس کی شمولیت نے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ کرم داد کے دو ساتھی بھی میری طرف سے مقابلے پر آگئے۔ غیر جانبدار رہنے والے چھٹ گئے اور زرگل کے آٹھ ساتھیوں کے مقابلے میں ہم چار ایسی بے جگری سے لڑے کہ بالآخر دشمن بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ مقدمہ ایک بار پھر جیلر کے سامنے پیش ہوا لیکن اس مرتبہ کرم داد کا اثر رسوخ کام آیا اور ہمارے ساتھ ہمارے حریف بھی قیدِ تنہائی کاٹنے کے لیے بند ہوئے اور ایک مہینہ طوق و سلاسل کے ساتھ گزار کے رہا ہوئے تو میں اور کرم داد دوست بن چکے تھے اور ہمارا گروپ بھی ایک طاقتور اتحاد بن کے سامنے آچکا



تھا۔ زرگل نے پھر کبھی مجھ سے میزبانی کی درخواست نہیں کی۔ اس نے نئے اور کمزور قیدیوں کا انتخاب کر لیا۔ میں نے زرگل کے طرزِ عمل کے خلاف محاذ آرائی کی بات کی تو کرم داد نے مجھے ٹوک دیا۔

"تو یہاں جیل کے حالات کی اصلاح کرنے نہیں آیا اُلو کے پٹھے!" کرم داد نے کہا۔ "اپنا وقت گزار اور جا۔ زرگل یہاں پہلے بھی تھے اور آئندہ بھی ہوں گے۔ ہر شخص کے معاملات کا ذمے دار نہیں ہے تو۔ سا اپنے کتابی سبق بھول جا ورنہ تمام عمر ان دیواروں سے باہر نہ نکل پائے گا۔"

یہ جیل کے اندر زندگی گزارنے کا پہلا سبق تھا۔ بعد میں مجھے کرم داد کے حالات معلوم ہوئے تو میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس نے انٹر تک کالج میں بھی پڑھا ہے۔ پھر میں نے اسے اپنی بات سنائی اور اس نے یہ نہیں کہا کہ یہاں تو سب ہی خود کو بے گناہ کہتے ہیں۔ اس نے مجھے ایک اور گالی دے کر کہا کہ اپنی یہ بات کسی اور سے کہہ کے تماشا نہ بنوں۔ "جو کچھ کرنا ہے خاموشی سے کر۔ ڈھنڈورا پیٹ کے پہلے سے سب کو خبردار مت کر ورنہ ہمیشہ کے لیے تیرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جائیں گی۔"

"لیکن میں نے قسم کھائی تھی کہ سال پورا ہونے سے..." میں نے کہا۔

"ابھی نو مہینے ہوئے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ اپنی قسم پوری نہ کر۔" وہ برہمی سے بولا۔ "لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تو سب کو اطلاعِ عام دیتا پھرے۔ موقع ملے تو چپ چاپ نکل جا۔ موقع اتنی آسانی سے نہیں ملتا مگر ناممکن کوئی بات نہیں ہوتی۔ لوگ پہلے بھی فرار ہوئے ہیں۔" وہ ذرا سی دیر کے لیے رکا۔ "یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے بیشتر سال دو سال کے اندر ہی پھر پکڑے گئے۔"

"میں نہیں پکڑا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تم میری مدد کرو گے؟"

"کوئی کسی کی مدد سے فرار نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ خود کرنا پڑتا ہے اُلو کے پٹھے!" کرم داد نے کہا۔ اس کی تلخ مگر حقیقت پر مبنی باتوں نے مجھے جذباتی سے عملی انسان بنانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا اور اس رات میں سوتے جاگتے جیل سے فرار کے خواب دیکھتا رہا۔ یہ سب پرانی دیکھی ہوئی فلموں کے مناظر تھے جو خواب بن کر ہر روز نظر آتے تھے۔ اگلے دن کرم داد نے "لنچ" کے وقفے میں موقع پا کر مجھ سے بات کی اور اپنی ذاتی کوشش سے کھانے کے وقفے میں آدھے گھنٹے کی رعایت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

"احمد علی کو جانتا ہے تو؟ علی بھائی کہتے ہیں سب اسے؟" وہ بولا۔

"صرف دو مہینے میں سب کو کیسے جان سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال تھا تو نے اسے دیکھا ضرور ہو گا۔" کرم داد نے کہا۔

"صرف دیکھنے سے مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ علی بھائی کون ہے اور ولی بھائی کون؟" میں نے کہا۔

"وہ دوسرے وارڈ میں ہے۔" کرم داد بولا۔ "اگلے مہینے اس کی چھٹی ہونے والی ہے۔"

"پھر مجھے کیا؟" میں نے کہا۔ "میرے لیے اس کو جاننا کیوں ضروری ہے؟"

"اس لیے کہ وہ جیل سے جانا نہیں چاہتا۔" کرم داد نے ہنس کے کہا۔ "وہ یہیں مرنا چاہتا ہے اور تو یہاں سے نکلنا چاہتا ہے۔ اب اگر تقدیر ساتھ دے..."

"یار کرم داد! اس میں تقدیر کہاں سے آ گئی؟" میں نے کہا۔ "چھٹی تو قیدیوں کی ہوتی ہی رہتی ہے مگر ایک قیدی کی جگہ کسی دوسرے قیدی کو چھوڑنے کی قانون میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خواہ کوئی یہاں سے نہ جانا چاہے۔ جیل والے تو اسے لات مار کے باہر کر دیں گے۔ میری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ جیل سے کون جانا نہیں چاہتا؟"

"ایسے تو بہت ہیں۔" کرم داد بولا۔ "جن کے پاس جانے کی کوئی جگہ نہ ہو۔ باہر رہنے کا ٹھکانا اور دو وقت کی روٹی کا آسرا نہ ہو اور جو دنیا میں اکیلے ہوں وہ اس دنیا سے نہیں نکلتے۔ جب ان کی چھٹی کا وقت آتا ہے وہ کوئی نیا جرم کر کے سزا کی میعاد بڑھوا لیتے ہیں۔ ایک نے جیلر کی ٹھکائی کی تھی، دوسرے نے جیلر کی بیوی پر دست درازی کا ارادہ کیا تھا۔ ایک اور ہے جس نے جیلر کے کمرے کو دو بار آگ لگانے کی کوشش کی۔ ان کو جیل میں بیس بیس سال ہو گئے ہیں اور اب جیل ہی ان کا گھر ہے۔ ان کے دوست رشتے دار سب وہی ہیں جو اندر ہیں۔"

"تو کیا علی بھائی بھی ایسا ہی کوئی کام کرے گا؟" میں...

"ہاں۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔" کرم داد نے کہا۔ "باہر نکلنے میں تیری مدد کرے گا اور پھر اس جرم کی سزا کا..."

"وہ کیسے مدد کرے گا؟" میں نے ہوشیار ہو کے کہا۔ "... خاص طریقہ اختیار کرے گا؟"

"نہیں، طریقہ تو بہت آسان ہے۔" کرم داد نے کہا۔ "چھٹی سے ایک دن پہلے تم دونوں کپڑے بدل لو گے اور... بدل لو گے۔ شام کی حاضری کے بعد تو اس کے وارڈ کے... کے ساتھ چلے جانا۔ وہ تیری جگہ اس وارڈ میں آ جائے گا...

"جب تک کسی کو معلوم نہیں ہوتا وہ تیری جگہ رہے گا۔"

مجھے یوں لگا جیسے کرم داد کا دماغ چل گیا ہو۔ "معلوم نہ ہونے کا کیا سوال! یہ تو اسی وقت معلوم ہو جائے گا جب ہم کپڑے بدل کے اِدھر اُدھر ہوں گے۔"

"اگر کسی نے بہت زیادہ غور نہ کیا یا آواز کے فرق کو محسوس نہ کیا تو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔" کرم داد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ علی بھائی کی شکل میں اور تیری شکل میں کوئی فرق نہیں۔ پہلے تھا مگر دو مہینے میں تیری داڑھی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ایک نظر میں پتا نہیں چلتا۔ ایک جیسے کپڑے پہننے سے فرق صرف نمبر کا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ علی بھائی بھی پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس نے بھی قتل کیا تھا لیکن اسے صرف ایک سال کی سزا ہوئی تھی۔ اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ وہ جیل سے جانا نہیں چاہتا اور اگر میں اس سے بات نہ کرتا تو ممکن ہے وہ چلا جاتا۔ اب وہ تیری مدد کرنا چاہتا ہے۔ کوئی یہ شک کیسے کر سکتا ہے کہ جسے چھٹی دی جا رہی ہے وہ علی بھائی نہیں ہے اور جس نے عمر قید قبول کر لی ہے وہ سول انجینئر ارشد محمود نہیں ہے۔"

"وہ میری جگہ عمر قید کاٹے گا؟" میں نے بے یقینی، خوف اور صدمے کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ "آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ عمر قید کا مطلب تیرے لیے کچھ اور ہے۔" کرم داد بولا۔ "علی بھائی کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک سال۔ اس سے زیادہ کوئی اسے قید میں رکھ ہی نہیں سکتا۔"

"وہ کیسے؟ کیا اس کی سزا معاف ہو جائے گی؟" میں نے کہا۔ "یا وہ بھی فرار ہو جائے گا؟"

"وہ سال پورا ہونے سے پہلے مر جائے گا۔" کرم داد نے کہا۔ "اسے کینسر ہے اور ڈاکٹر یہ بات بہت پہلے بتا چکے ہیں۔"

میں ساکت و صامت اور پتھر کے بت کی طرح منجمد بیٹھا رہا۔ پھر ایک بید میری پیٹھ پر پڑی۔ "انجینئر کی اولاد! باقی کام تیرا باپ کرے گا، حرام خور۔" اور چوٹ کے احساس سے بے نیاز اور گالیوں کی بوچھار سے بے پروا رہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے تعجب ہوا کہ کرم داد کب اٹھ کر گیا تھا۔ اس نے جاتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ اب چل ورنہ شامت آجائے گی اور میں نے جواب میں سر بھی ہلایا تھا لیکن اس کے باوجود میں وہیں بیٹھا سوچتا رہا تھا کہ تقدیر اور تدبیر کی معرکہ آرائی میں جیت کس کی ہے اور ہار کس کی!

رازداری کے پورے اہتمام کے ساتھ جیل کے ایک محفوظ گوشے میں میری ملاقات اس شخص سے ہوئی جو اپنی زندگی مجھے قرض دے کر دنیا سے رخصت چاہتا تھا۔ یہ سب تقدیر کے کھیل تھے۔۔۔ بہت پہلے جب میں اور وہ الگ الگ وقت پر الگ الگ مقام پر پیدا ہوئے تھے تو تب تقدیر نے پہلے سے طے کر دیا تھا کہ ہم یوں ملیں گے۔ وہ بلاشبہ میرا نقشِ ثانی تھا۔ بے شک اس کی ناک کچھ ستواں تھی اور ماتھا مجھ سے فراخ تھا لیکن قد کاٹھ اور صورت کے نقوش میں ہم دونوں کی یکسانیت بہت نمایاں تھی۔ میں جیل میں نووارد تھا اور ہمارے وارڈ الگ تھے ورنہ یہ بات کسی سے چھپی نہ رہتی۔ دو مہینے میں کسی نے ہمیں ایک ساتھ نہیں دیکھا تھا یا دیکھا تھا تو غور نہیں کیا تھا۔ جیل کے اندر ایک جیسے کپڑوں میں ہر قیدی صرف ایک نمبر ہوتا ہے۔ جیل کے اندر قدم رکھتے ہی وہ آدمی کی جگہ ایک عدد بن جاتا ہے۔ بے نام اور بے معنی ہو جاتا ہے۔

"مجھے کرم داد نے بتایا تھا۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے آہستہ سے کہا۔ پھر الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔

"کرم داد نے مجھے بتایا تھا کہ تم بھی اس کی طرح ناکردہ جرم کی سزا کاٹ رہے ہو۔" وہ اُداسی سے مسکرایا۔

"اس کی اور میری سزا میں بہت فرق ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے ...... اپنی زندگی کی قربانی دی تھی۔ اپنی ماں کے لیے اور اپنی دو بہنوں کے لیے۔ میں نے کسی کے لیے قربانی نہیں دی تھی۔ اس نے سزا کو اپنی خوشی سے قبول کیا تھا۔ میں نے اب تک قبول نہیں کیا۔"

"کرم داد بہت اچھا آدمی ہے۔" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔ "اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ تم بھی بہت اچھے آدمی ہو۔"

"میں، میں اچھا آدمی ہوں؟ نہیں۔ علی بھائی، اچھے آدمی تم ہو۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"میں نے تو ایک قتل کیا تھا۔ میں اچھا آدمی کیسے ہو گیا؟" وہ بولا۔ "اور اب جو کچھ میں کر رہا ہوں اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے کر رہا ہوں، تم پر احسان نہیں کر رہا ہوں۔ میں اپنے لیے دوسرے جہاں میں بخشش کا سامان کر رہا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے ابھی اتنا ہی اور جینا ہے جتنا تمہیں، تو شاید میں یہ سودا نہ کرتا۔ میں اچھا آدمی کیسے ہو گیا! میں تو ایک خود غرض انسان ہوں۔"

"ایسا مت کہو علی بھائی۔" میں نے بڑے دکھ سے کہا۔ "صبح میں اسی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں گا جس نے حالات و واقعات کی شہادت میں اُلجھا کے مجھے قاتل بنا دیا تھا اور تم ....."

"میں یہاں رہوں یا باہر، مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ بولا۔ "فرق تمہیں پڑتا ہے۔ اگر تم بے گناہ ہو تو تمہیں زندہ رہنے کا حق

Farukh Malik

ملنا چاہیے۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور اس لیے نہیں ملتی کہ ناانصافی کی نذر کر کے جیل میں مشقت کرتے ضائع کر دی جائے زندگی تو مسرتوں کے حصول کی جدوجہد کے لیے ملتی ہے اور یہ جدوجہد تم کر سکتے ہو۔ میں نہیں کر سکتا۔ جدوجہد کیلیے صبر اور استقامت کی ضرورت بھی پڑتی ہے اور اب میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ میں خوشی کی آرزو بھی کر سکوں۔"

"تم نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تین سال کی سزا مجھے صرف اس لیے ملی کہ میں نے وہ قتل اشتعال کی کیفیت میں کیا تھا۔" علی بھائی نے کہا۔ "کیا تمھیں اپنی بیوی سے محبت ہے؟"

"ہاں۔ صرف اپنی ذات کے لیے جینے کی تمنا کون کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے ثروت کو بتا دیا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہیں کر سکتی۔ اسے سمجھا دیا تھا کہ ہمارے بیچ میں جیل کی دیوار تو کیا ہمالیہ کی فصیل اور بحرالکاہل کی وسعت بھی حائل نہیں ہو سکتی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ سال بھر کے اندر اندر میں نکل آؤں گا خواہ اس کوشش میں میری جان چلی جائے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کام مشکل ہے، ناممکن نہیں اور ثروت نے کہا تھا کہ وہ انتظار کرے گی۔ ہر رات دروازہ کھلا رکھ کے سوئے گی اور جس دن اخبار کے ذریعے یا جیل کے حکام کی معرفت اسے معلوم ہوا کہ سول انجینئر ارشد محمود جیل سے فرار ہونے کی کوشش میں ہلاک ہو گئے اسی دن ریوالور کی ایک گولی میرے انتظار کا عذاب ختم کر دے گی۔ ابھی ہمارے بچے نہیں ہیں۔"

"مجھے بھی اپنی بیوی سے اتنی ہی محبت تھی۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "محبت نہ ہوتی تو اسے قتل کیوں کرتا۔ تم اس معاملے میں مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہو کہ تمھاری بیوی بھی تمھیں اتنا ہی چاہتی ہے جتنا تم اسے چاہتے ہو۔ کینسر سے مرنے کا مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا اگر موت مجھے اس گھر میں آتی جہاں میں نے اس کے ساتھ عہدِ رفاقت نبھانے کی قسم کھائی تھی۔ مستقبل کے خواب دیکھے تھے جو تم نے بھی دیکھے ہوں گے۔ جب ایک مرد اور ایک عورت شادی کے مقدس رشتے میں بندھ جاتے ہیں تو سب ایک ہی خواب دیکھتے ہیں۔ ایک شاد و آباد گھر کے۔ بچوں کے۔ بچوں کی خوشی کے اور ان کی کامیابی کے مگر سب خوابوں کو تعبیر کہاں ملتی ہے۔ تمھارے خواب سچ کیوں نہ ہوئے؟ کسے الزام دو گے تم؟ اور میں نے فرشتۂ اجل سے جیل خانے میں ملنے کا فیصلہ کیا ہے تو کیا یہ میرا فیصلہ ہے؟ نہیں۔ میں اور تم دونوں یہی کہہ سکتے ہیں کہ نوشتۂ تقدیر یہی تھا۔ اس میں ردوبدل کسی فانی انسان کے اختیار کی بات نہیں تھی۔"

"اگر آدمی کسی سے محبت کرتا ہے اور پھر اسے قتل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو اس کا ایک ہی سبب ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "رشک، حسد اور رقابت کا جذبہ۔ کیا تمھاری بیوی کسی اور کو چاہنے لگی تھی؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ "اس کا جواب اقرار میں دیا جا سکتا ہے نہ انکار میں۔ اس کے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک گروہ کی آلۂ کار تھی۔ گروہ کا سرغنہ اس کا اپنا بھائی تھا۔ کیا تم نے کبھی ایسے بےغیرت بھائی دیکھے ہیں جو اپنی ہی بہن کی آبرو کے عوض ہاتھ کا میل سمیٹتے ہوں؟" وہ طنز سے ہنسا۔ "یہ دنیا پیسے کو ہاتھ کا میل کہتی ہے۔ اس سے بڑا جھوٹ شاید کوئی نہیں۔ جب فرخندہ مجھ سے ملی تھی تو میں ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ کراچی میں ہی جوبلی سینما کے قریب میری ریر پارٹس کی دکان تھی۔ گاڑیوں کے ریر پارٹس کی۔ اور اس سے مجھے بہت معقول آمدنی ہو رہی تھی۔ میں بہت ٹھاٹھ سے رہتا تھا کیونکہ دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔ یہ دکان پہلے میرے والد کی تھی اور ان کا واحد پارٹنر چھوٹا بھائی یعنی میرا چچا تھا۔ میرے والدین کا انتقال بس کے ایک حادثے میں ہوا۔ وہ کراچی سے حیدرآباد جا رہے تھے کہ ایک بس کو اوورٹیک کرتے ہوئے... ان کی کار سامنے سے آنے والی دوسری بس سے ٹکرا گئی۔ میرے بچ جانے کو لوگوں نے ایک معجزہ قرار دیا۔ سوائے میرے چچا کے جسے بھائی کی موت کے علاوہ کوئی صدمہ تھا تو یہ کہ قانونی وارث کی حیثیت سے میں کیوں زندہ رہا۔ اگر میں بھی مر جاتا تو وہ بلاشرکت پورے کاروبار کا مالک بن جاتا۔ میری عمر اس وقت گیارہ سال تھی اور میں چھٹی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ چچا نے میری پرورش کا بار تو اٹھایا لیکن اس نے کوشش کی کہ میں جاہل رہ جاؤں۔ میرے ساتھ گھر میں ایسا ذلت آمیز سلوک ہوتا تھا جو نوکروں کے ساتھ بھی روا نہیں رکھا جاتا مقصد صرف یہ تھا کہ میں گھر چھوڑ کے بھاگ جاؤں لیکن میرے والد کے ایک پرانے دوست وکیل تھے۔ ایک بار وہ مجھے ملنے آئے تو انھوں نے میری خیریت دریافت کی اور میری حالت دیکھ کر بھانپ لیا کہ میری زندگی اچھی نہیں گزر رہی دوسری بار وہ غیر متوقع طور پر دوپہر کے وقت میرے چچا کی موجودگی میں اس وقت آ گئے جب میں باورچی خانے کے فرش پر برتن دھو رہا تھا۔ انھوں نے مجھے ساتھ لے جا کر تمام حالات کی تفصیل معلوم کی اور پھر میرے چچا سے بات کی۔ انھوں نے کو سمجھا دیا کہ قانونی طور پر میرے سرپرست وہی ہیں لیکن ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے اس کے پیشِ نظر وہ عدالت میں شپ کی درخواست دے سکتے ہیں۔ انھوں نے چچا پر یہ واضح کر دیا کہ میرے سنِ بلوغت کو پہنچنے تک وہ کاروبار سے

ضرور ہیں لیکن کلی طور پر مالک نہیں ہیں۔ بالآخر ان کو نصف کاروبار میرے سپرد کرنا ہے اور اس وقت تک موجودہ آمدنی کا نصف میرے حساب میں الگ جمع ہونا چاہیے۔ میرے اخراجات کے لیے وہ گارجین جج کی کورٹ سے رجوع کر سکتے ہیں۔ میرا چچا پھنس گیا۔ اس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ مجبوراً اس نے مجھے پھر اسکول میں داخل کروایا۔ ماہانہ منافع میں سے آدھا میرے اکاؤنٹ میں جمع کرانے لگا۔ میرے باپ کا وکیل دوست باقاعدگی سے حسابات دیکھتا تھا کہ کہیں مجھے اصلی منافع سے کم تو نہیں مل رہا ہے اور جو رقم میرے حساب میں جمع ہو رہی ہے، وہ محفوظ ہے۔ میرے چچا نے عدالت سے میرے اخراجات کے لیے ایک ہزار روپیہ ماہانہ منظور کرائے تھے جو میری اصل ضروریات سے بہت زیادہ تھے اور اسے تمام خرچ کا حساب بھی رکھنا پڑتا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔"

"ایسی کیا مجبوری تھی کہ اس نے تمھیں اپنے ساتھ رکھا۔" میں نے کہا۔ "وہ وکیل تمھیں اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟"

"میں نے بتایا نا کہ قانونی طور پر میری پرورش کا پہلا حق چچا کو ہی حاصل تھا۔" علی بھائی نے کہا۔ "مجبوری اس کی بیٹی تھی جو نہایت بدشکل اور اتنی کند ذہن تھی کہ چھٹی جماعت سے آگے نہ پڑھ سکی تھی۔ وہ بدمزاج اور بدخو ہی نہیں، بدسلیقہ بھی تھی۔ گھر کا سارا کام نوکر کرتے تھے اور اس کا صرف یہی کام تھا کہ بات بے بات پر نوکروں کو گالیاں دے اور اپنے پھوہڑپن سے ہونے والے نقصانات کو نوکروں کے سر تھوپ دے۔ تمیز تہذیب سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور والدین کا بے جا لاڈ پیار اسے مزید بگاڑ رہا تھا۔ میرے چچا کو امید تھی کہ اس نے میری پرورش کی تو اسے دُہرا فائدہ حاصل ہوگا۔ اس کا احسان مند رہتے ہوئے میں اس کی بیہودہ لڑکی کو قبول کرلوں گا جسے کوئی اور شریف آدمی قبول کرتا تو اس کے ساتھ چند ماہ بھی نہ نباہ پاتا۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ اس طرح سارا کاروبار اسی کا رہے گا لیکن بی اے کرنے کے بعد میں نے عَلمِ بغاوت بلند کردیا۔ میرے باپ کا وکیل دوست میرا معاون تھا۔ میں نے کاروبار میں سے اپنا حصہ الگ کیا اور قریب ہی دوسری دکان لے لی۔ میں نے چچا کی لڑکی پر لعنت ہی نہیں بھیجی، وہ گھر بھی چھوڑ دیا اور ایک فلیٹ خرید کر اکیلا رہنے لگا۔ یہ میری محنت کا ثمر تھا یا خدا نے برکت دی تھی کہ دو سال میں میرا کاروبار تیزی سے پھیلا۔ میرے چچا کا نصف سرمایہ اتنی ہی تیزی سے گھٹا۔ اب ہم کاروباری حریف تھے اور چچا میری جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ میں نے ذاتی ضرورت کے لیے ایک کار خرید لی تھی اور دکان بند کرنے کے بعد میرا تمام وقت سیروتفریح کی نذر ہوتا تھا۔ میرے پیسے نے غلط قسم کے افراد کو متوجہ کیا اور میں ان کی ترغیب سے غلط راستوں پر چل نکلا۔ میرے ہمدرد اور محسن وکیل نے مجھے سمجھانے کی بے سود کوشش کی۔ میرے سر پر جوانی کا بھوت سوار تھا۔ میں ضرورت سے زیادہ خوداعتمادی کا شکار تھا اور پیسے کو اپنا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا سہارا سمجھتا تھا۔ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کرسمس نائٹ ڈنر میں فرخندہ نے مجھے اپنے عشوہ و غمزہ و ادا کا نشانہ بنایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بے حد حسین لڑکی تھی اور اس کو اپنے حسن و شباب کی ساحری سے میرے جیسے آدمی کو اُلو بنانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اسے میرے پیچھے لگانے والے دوسرے لوگ تھے۔ فرخندہ محض ایک کٹھ پتلی تھی جس کی ڈوریاں ہلانے والے بہت پہلے مجھے تاڑ چکے تھے۔ فرخندہ کی باتوں نے، اس کی اداؤں نے اور اس کے اندازِ محبوبی نے مجھے دیوانہ کردیا۔ وہ بہت چالاک اور تجربہ کار عورت تھی۔ وہ مجھے ڈھیل دیتی تھی اور جب میں آگے بڑھتا تھا تو خود کھنچ جاتی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اس کی فرمائش پر میں نے تحائف کے ڈھیر لگا دیے اور ہر وقت اس کے خیالوں میں گم رہنے لگا۔ اس کا اثر کاروبار پر بھی پڑا۔ بالآخر میں نے فرخندہ سے شادی کی درخواست کی اور فرخندہ نے ہامی بھرنے سے پہلے سوچنے میں تین مہینے گزار دیے۔ ان تین مہینوں میں اس نے مجھے اپنے 'گھر والوں' سے ملوایا جو سب کے سب ایک ہی گروہ کے رکن تھے۔ ان میں ایک مکار بڑھیا تھی جس نے فرخندہ کو اپنی بیٹی کہا۔ دوسرا ایک خبیث بوڑھا تھا جو اس کا باپ بنا رہا لیکن سب کچھ کرنے والا وہ شخص تھا جو خود کو فرخندہ کا بڑا بھائی کہتا تھا۔ انھوں نے حیلے حوالوں سے کام لے کر مجھے ٹالا اور میری آتشِ شوق کو ہوا دینے کے لیے فرخندہ کو ہدایات دیتے رہے۔ تین ماہ بعد جب ہماری شادی ہوئی تو میں نے ہر شرط قبول کرلی تھی۔ بے شک کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ عام حالات میں معمولی عقل رکھنے والا بھی ایسی نادانی نہ کرتا۔ اگر میرے باپ کے وکیل دوست کو معلوم ہو جاتا کہ فرخندہ سے شادی کے لیے میں نے کس قسم کی شرائط کو تسلیم کرلیا ہے تو وہ ضرور مداخلت کرتا اور مجھے بچانے کی پوری کوشش کرتا لیکن میں نے تو اسے اپنے معاملات کی ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔ فرخندہ صرف میری بیوی ہی نہیں تھی، کاروبار میں میری شریک بھی تھی۔ ہمارا بینک اکاؤنٹ مشترکہ تھا یعنی رقم نکلوانے کے لیے کسی ایک کے دستخط کافی تھے۔ لڑکی کو تحفظ فراہم کرنے کی خاطر فرخندہ کی 'ماں' نے فلیٹ بھی فرخندہ کے نام کرادیا تھا اور اس کا حقِ مہر ایک لاکھ رکھا تھا۔ شادی کے بعد تین مہینے کا ہنی مون ختم ہوا تو مجھے ہوش آیا اور میں نے دوبارہ کاروبار کی طرف توجہ دی جس میں اب گھاٹا ہی گھاٹا تھا۔ حتیٰ ممکن تھا کہ میں

پھر محنت کرتا تو کاروبار کو پھر اسی مقام پر لے آتا جہاں وہ فرخندہ کے ملنے سے قبل تھا لیکن انھی دنوں میں کینسر کی پہلی علامات نمودار ہوئیں۔ میں نے بیماری کو معمولی سمجھتے ہوئے نظر انداز کیا اور جب دورے شدید تر ہونے لگے تو ڈاکٹروں کے پاس گیا۔ انھوں نے مختلف ٹیسٹ لیے اور پھر اپنے حتمی فیصلے کا اعلان کر دیا۔ مجھ پر بجلی سی گری۔ میری بے حد خوبصورت، محبت بھری پُرآسائش اور جوان زندگی کے زیادہ سے زیادہ دو سال رہ گئے تھے۔ میں نے انتہائی بوجھل دل کے ساتھ یہ بات فرخندہ کو بتائی۔ جتنی محبت اور لگاوٹ کا اظہار وہ اپنی باتوں سے اور اپنے ناز و انداز سے کرتی تھی، اس کے مقابلے میں میری موت کی خبر کے صدمے کا ردِ عمل اتنا خفیف تھا کہ میں حیران ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ روتے روتے بے ہوش ہو جائے گی اور جدائی کا خیال اسے پاگل کر دے گا مگر اس نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ میری بات سنی اور کہا کہ خدا کی یہی مرضی ہے تو انسان کیا کر سکتا ہے۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے کہا، کیا تمھیں دکھ نہیں ہوا یہ جان کر کہ دو سال میں، میں مر جاؤں گا؟ اس نے کہا، دکھ تو ہوا ہے لیکن تم کیا چاہتے ہو، میں دہاڑیں مار مار کے رونے لگوں۔ پیٹ سے گر کر بے ہوش ہو جاؤں یا حرکتِ قلب بند ہونے سے مر جاؤں؟ میں اس کی باتوں پر کھول کر رہ گیا اور میں نے اشتعال میں اس کے ایک چھانپڑ رسید کیا۔ اسی دن وہ اپنے دلّال بھائی کے پاس جا پہنچی۔ وہ اپنے ساتھ دو بدمعاشوں کو لے کر آیا اور انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے فرخندہ پر تشدد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے اور فرخندہ کو شکایت ہے تو وہ خود آ کے مجھ سے بات کرے، میں اس سے معافی مانگ لوں گا لیکن انھوں نے مجھے مارا اور اٹھا کے فلیٹ سے باہر پھینک دیا کہ آئندہ اندر قدم مت رکھنا۔ فلیٹ فرخندہ کی ملکیت تھا لیکن اس نے بھی مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ میں اپنے پرانے محسن وکیل کے پاس پہنچا اور اسے ساری بات بتائی۔ اسے بہت رنج ہوا کہ میں نے اسے پہلے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے یہ تو نہیں کہا کہ اب مدد کا وقت ہی کہاں ہے۔ اگر میں نے مقدمے بازی شروع کی تو فیصلے سے قبل ہی میرا آخری وقت آ جائے گا۔ اس نے مجھے صبر اور حوصلے سے کام لینے کی تلقین کی۔ یہ کہا کہ کینسر کی ہزار ہا اقسام ہیں اور بیشتر قابلِ علاج ہیں بشرطیکہ تشخیص وقت پر ہو جائے اور چونکہ مرض کا پتا بہت جلد چل گیا تھا، اس لیے علاج بھی ہو جائے گا۔ اس نے مجھے فرخندہ کو بھول کر اپنا کاروبار سنبھالنے کا مشورہ دیا لیکن فرخندہ کو بھولنا میرے اختیار کی بات نہ تھی۔ میں نے اسے منانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کے در سے ذلیل ہو کے لوٹتا رہا۔ تین مہینے تک نہ میں نے دکان کھولی اور نہ رات کو چین سے سویا۔ ایک خوف وقت کا تھا جو میری گرفت سے نکل رہا تھا۔ دوسرا صدمہ فرخندہ سے دوری کا تھا۔ اس سے جدائی کا تصور ہی مجھے پاگل کیے دیتا تھا۔ تین مہینے بعد ایک دن میں اس کے فلیٹ پر پہنچا تو میرا استقبال ایک بوڑھے مین نے کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ فلیٹ خرید چکا ہے اور اس کی سابق مالکہ مس فرخندہ کے بارے میں وہ کچھ نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں ہیں۔ میں نے اس کے جعلی والدین اور بھائی کے ٹھکانے کا رخ کیا۔ وہ رختِ سفر باندھ رہے تھے کہ میں نے انھیں جا لیا۔ میں اپنے ہوش میں کہاں تھا۔ میں نے کہا کہ تم سب جہنّم میں جا سکتے ہو لیکن میری بیوی فرخندہ کو لے کر نہیں جا سکتے۔ اس کے بھائی نے مجھ پر حملہ کیا اور ہم نے ایک دوسرے کو لہولہان کر دیا۔ عین اس وقت جب میں اس شیطان پر غالب آنے لگا تھا، فرخندہ نے چھری لے کر مجھ پر وار کیا۔ اس نے چلّا کے کہا کہ وہ میری بیوی نہیں ہے اور اس کی بات نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ میں نے اس کے بھائی کو چھوڑ کر فرخندہ کو پکڑ لیا۔ پلک جھپکتے میں اس کے لمبے سیاہ بال پکڑ کے کھینچا اور فرش پر گرا کے اس کا گلا کاٹ دیا۔ پھر میں خود بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں فرخندہ کی لاش کے پاس پڑا تھا اور باقی سب لوگ فرار ہو چکے تھے۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ فرخندہ نے صرف فلیٹ بیچ کر ہی رقم ان کے حوالے نہیں کی تھی بلکہ میرے بینک بیلنس کو بھی صفر کر دیا تھا۔ وہی وکیل میرے کام آیا جو میرے باپ کا دوست تھا۔ اس نے عدالت کو تمام حالات سے آگاہ کیا جو قتل کے محرک بنے اور مجھے صرف ایک سال کی قید ہوئی۔ اگر میں اپیل کرتا تو یہ سزا بھی معاف ہو جاتی لیکن میں نے وکیل کو روک دیا۔ قدرت مجھے پہلے ہی سزائے موت دے چکی تھی ورنہ میں خودکشی کر لیتا جو حرام موت کہلاتی۔ اب یہ بے مصرف زندگی جو میرے کام کی نہیں... تمھارے کام آ جائے تو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے گھر میں پڑا ہوا فضول سامان جسے کباڑی بھی نہ لیتا ہو کسی ضرورت مند کو دے دیا جائے اور کچھ نہیں تو اس سے گھر صاف ہو جاتا ہے۔“

خاموشی کا ایک طویل سوگوار اور بوجھل وقفہ آیا۔

بعد ہم اپنے اپنے بلاک کی طرف چلے گئے کیونکہ شام کی حاضری کا وقت ہونے والا تھا۔ صبح مجھے جیلر نے طلب کیا۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم سول انجینئر تھے۔“ اس نے فائل کو دیکھتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”اب تو میں صرف قتل کے جرم میں سزا پانے والا ہوں۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”نمبر نو سو گیارہ۔“

”مجھے معلوم ہے تم نے وہ قتل کن حالات میں کیا تھا۔“

Farrukh Malik

سرد لہجے میں بولا۔ "تمہارے بارے میں یہ شکایت مجھے پہلے بھی ملی ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ بولتے ہو۔ تمہاری فطرت میں سرکشی ہے اور تم جیل کے عملے سے تعاون نہیں کرتے۔"

"مجھ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں ہے سر کہ آپ غلط کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جیل کے اندر تمہاری سزا میں تخفیف کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔" وہ فائل بند کر کے بولا۔ "میری سفارش پر انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات اور ہوم سیکرٹری سزا کو کم کر سکتے ہیں۔ جیل میں نماز اور قرآن پڑھنے، ان پڑھ قیدیوں کو پڑھانے اور ہر قومی تہوار پر ملنے والی خصوصی رعایت سے فائدہ اٹھا کے تم بہت کم وقت میں باہر نکل سکتے ہو۔ جیل کے اندر شرافت سے رہ کے تم کو ہر رعایت مل سکتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کو حالات نے یہاں پہنچا دیا لیکن حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ دوسری بات یہ کہ حالات سے مفاہمت نہ کرنے والوں کے لیے زندہ رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ باہر تم کیا تھے اور کیا نہیں تھے، یہاں صرف قیدی نمبر نو سو گیارہ ہو۔ رائٹ؟"

"ویری رائٹ سر۔" میں نے کرم داد کے ہونہار شاگرد کی طرح انکساری سے کہا۔

"تو نمبر نو سو گیارہ۔" جیلر نے کہا۔ "جیل میں قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے اور بی کیٹیگری کو بھی سی میں ڈالنا پڑتا ہے اور سی کلاس کی عمارت تقسیم سے پہلے بنی تھی۔ لوگ کہتے ہیں اس وقت اتنے جرائم نہیں ہوتے تھے لیکن میں نہیں مانتا۔ یہ آبادی کے تناسب کے علاوہ دوسرے معاشرتی عوامل کی بات ہے مگر جس بات کے لیے میں نے تمہیں طلب کیا ہے، وہ کچھ اور ہے۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہو گا، جیل میں ایک بلاک کے اضافے کا کام جاری ہے۔ اس کام کی نگرانی پہلے پی ڈبلیو ڈی کا ایک اوورسیئر کر رہا تھا لیکن کل اس کی چھٹی ہو گئی۔ میں یہ کام تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ راج، مزدور سب قیدی ہیں اور تم کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ کام نقشے کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں اور اس کی تعمیر میں کوئی فنی نقص تو نہیں ہے۔ تمہیں سب کا تعاون حاصل ہو گا۔ کوئی تمہارا حکم نہ مانے یا تم سے بدتمیزی کرے تو تم میرے پاس آ سکتے ہو۔ یہ کام تمہارے لیے زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔"

"میں کوشش کروں گا کہ آپ کو مطمئن کر سکوں سر۔" میں نے شرافت سے کہا۔

"ویری گڈ۔ میں نے تمہارے لیے تھوڑی سی سہولت فراہم کر دی ہے۔ ایٹ مائی رسک۔" وہ بولا۔ "تم کو بی کلاس میں شفٹ کر دیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤ گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

ناجائز فائدہ اٹھانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ جیل خانے کی فصیل کم سے کم دس گز اونچی تھی اور اس پر ایک ایک فٹ کے فاصلے سے خاردار تاروں کی پانچ متوازی قطاریں چلتی تھیں، ہر پچاس گز کے فاصلے پر ایک کیبن تھا جس میں مسلح محافظ مشین گن لیے بیٹھے رہتے تھے اور دوربین سے گرد و نواح پر پوری نظر رکھتے تھے۔ ہر کیبن پر دو سرچ لائٹیں تھیں۔ ایک اندر کے علاقے کو روشن رکھتی تھی اور دوسری فصیل سے باہر کے علاقے کو۔ فصیل میں دُہرے دروازے تھے۔ اندر سے باہر آنے والا پہلے ایک دروازے سے گزرتا تھا۔ دوسرا دروازہ بیس فٹ دور تھا اور درمیانی جگہ میں تلاشی لینے والے مسلح محافظ ہر وقت مستعد کھڑے رہتے تھے جو پوری طرح مطمئن ہو جانے کے بعد ہی دوسرے دروازے کا قفل کھولتے تھے۔ پھر ایک وسیع میدان سا تھا جس میں بائیں جانب عملے کے کوارٹر تھے اور جیلر کا بنگلا تھا۔ دائیں طرف جیل کے فارم اور ورکشاپ تھے۔ اس احاطے کے آخری دروازے تک ہر قیدی دو محافظوں کے ساتھ پہنچتا تھا اور آزاد انسانوں کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے اس کو آخری بار چیک کیا جاتا تھا۔

قید خانے کی عمارت بالکل وسط میں تھی اور اوپر سے دیکھا جاتا تو بالکل انگریزی حرف 'ٹی' کی طرح دکھائی دیتی۔ اندر داخل ہونے کے بعد دونوں جانب آہنی سلاخوں والی کوٹھریاں تھیں۔

پُراسرار علوم پر معلوماتی کتابیں

چہرہ شناسی	۲۰/-	حسین اور پرکشش بنیے	۱۵/۰۰
قیافہ شناسی	۲۰/۰۰	خود اعتمادی بڑھائیے	۸/۰۰
جادو کے اعداد	۱۲/۰۰	آسان یوگا	۱۲/۰۰
۹ خوفناک اعداد	۱۲/=	ذاتی ترغیب کے کرشمے	۹/=
پُراسرار اعداد	۹/=		
ٹیلی پیتھی	۱۰/۰۰	قد بڑھانے کے طریقے	۱۰/۰۰
شمع بینی	۱۰/۰۰	اپنا علاج خود کیجیے	۹/=
آئینہ بینی اور عمل حاضرات	۱۰/۰۰	تحریر شناسی سے حیران کن باتوں کا انتخاب	۱۲/۰۰
جنس اور یوگا	۲۰/۰۰	پیالی میں قسمت	۹/=
قسمت کے پتے	۸/۰۰	اپنے جگر کی حفاظت کیجیے	۶/۰۰
ہپناٹزم کی پہلی کتاب	۲۰/۰۰	یادداشت بڑھانے کے عملی طریقے	۱۰/۰۰
ہپناٹزم کی آخری کتاب	۱۵/۰۰	شعبدہ بازی	/۰۰

کہکشاں بک سیلرز
پوسٹ بکس نمبر ۲۲۵۶
ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

اس قطار میں دونوں جانب سو سو کوٹھریاں تھیں اور جہاں یہ کاریڈور جیسا راستہ ختم ہوتا تھا، وہاں سامنے دیوار آجاتی تھی اور راستہ دائیں بائیں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ طوالت میں عمارت کے تینوں بازو برابر تھے اور ان کی چھ سو کوٹھریوں میں بارہ سو خطرناک مجرم بھی تھے۔ اخلاقی مجرم بھی اور سیاسی مجرم بھی۔ جیلر کا نقطۂ نظر کچھ بھی ہو، اصل بات یہ تھی کہ دنیا میں جرائم زیادہ ہونے لگے تھے اور مجرم بھی پہلے سے زیادہ خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔ خنجر، پستول سے واردات کرنے والے اب اسٹین گن استعمال کرتے تھے اور گھروں کے بجائے بینکوں کو لوٹتے تھے۔ کاریں چراتے تھے اور ہائی جیکنگ کرتے تھے چنانچہ عمارت میں چوتھے بلاک کا اضافہ کیا جا رہا تھا اور مزید چار سو قیدیوں کے لیے گنجائش پیدا کی جا رہی تھی۔ چوتھے بلاک کی تکمیل کے بعد عمارت کی شکل انگریزی حرف 'ٹی' کے بجائے ریڈ کراس کے نشان جیسی ہونے والی تھی۔ ہر بلاک کے آخر میں ایک دروازہ تھا چنانچہ موجودہ تینوں بلاک ایک دوسرے سے ملے ہونے کے باوجود الگ تھے اور جب ان کے درمیان کی گرل کھینچ کر لاک کر دی جاتی تھی تو درمیان میں ایک کمرہ سا بن جاتا تھا جس میں مشین گن لے کر بیٹھنے والا محافظ ہر بلاک کو آخر تک دیکھ سکتا تھا۔ بفرضِ محال کوئی اپنی کوٹھری سے نکل کر باہر آجاتا تو محافظ کی نظر سے نہیں بچ سکتا تھا اور پورے کاریڈور کو طے کرنے کے بعد مضبوط لوہے کی گرل کو توڑ کے یا کاٹ کے نکلنا ناممکن تھا اور اگر کوئی یہ کارنامہ بھی سرانجام دے لیتا تو رات کے وقت بھی دن کی طرح روشن رہنے والے صحن کو کیسے عبور کرتا اور دہرے قفل دار دروازوں سے کیسے گزرتا؟ فصیل کو کیسے عبور کرتا؟ اندر آنے سے پہلے میں نے ان سب امکانات پر غور نہیں کیا تھا اور ناممکنات کو یکسر نظرانداز کر دیا تھا۔ میں نے جذباتی دیوانگی میں چلا چلا کے اعلان کیا تھا کہ میں جیل سے فرار ہو جاؤں گا اور مجھے نہ زنجیروں سے باندھ کے رکھا جا سکتا ہے اور نہ فصیلوں میں بند کر کے۔ لوگ اس وقت میری ذہنی کیفیت پر روتے بھی تھے اور میرے دعووں پر ہنستے بھی تھے۔ اندر پہنچنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہنسنے والے بے سبب نہیں ہنستے تھے۔ اگر مجھے کرم داد کی معرفت علی بھائی نہ ملتا تو میں فرار کی بابت سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن اب تائیدِ ایزدی سے حالات کی موافقت نے امید کی ایک کرن روشن کی تھی تو میں اس کے اجالے سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جیلر نے میری پہلی درخواست یہ قبول کی کہ کرم داد کو اور مجھے ایک ہی کوٹھری میں کر دیا۔

معماروں نے زمین میں بانس گاڑ رکھے تھے اور ان بانسوں کے ساتھ تختے باندھ کر پلیٹ فارم بنا لیے تھے۔ چنائی سے دیوار بلند ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ تختوں کی بلندی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ چنائی کرنے والے سارا دن تختوں پر بیٹھ کے سیمنٹ پھیلاتے جاتے تھے اور اینٹ پر اینٹ رکھتے جاتے تھے۔ دس دن میں دیوار کا ایک حصہ بارہ فٹ بلند ہو گیا تھا اور اب اس کے آخری حصے میں محافظوں کی چوکی تعمیر کرنے کے لیے عقبی دیوار اٹھائی جا رہی تھی۔ میں کام کرنے والوں کے ساتھ ایک تختے پر زمین سے اٹھارہ بیس فٹ اوپر کھڑا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ کام کرنے والے قیدی اتر جائیں تو میں بھی اتروں لیکن قطار بہت لمبی تھی چنانچہ میں نے انتظار بے سود سمجھا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور اپنے کمرے میں پہنچ کے جلد از جلد غسل سے فارغ ہو کر اپنے کپڑے پہننا چاہتا تھا۔ جیلر نے میرے کام سے اور میری فرض شناسی کے علاوہ میری فرمانبرداری سے خوش ہو کر مجھے ہر ممکن سہولت فراہم کر دی تھی۔ میرے سونے کے لیے ایک چارپائی تھی جس پر بستر بھی تھا۔ میرے نہانے دھونے کے لیے ایک قیدی ہر روز دو بالٹی پانی رکھ جاتا تھا۔ مجھے پورا کھانا ملتا تھا جو کوئی قیدی میرے کمرے میں پہنچا دیتا تھا۔ مجھ سے کوئی مشقت نہیں لی جاتی تھی۔ میں محافظوں کی مار پیٹ اور گالی گلوچ سے محفوظ تھا اور رات کو اطمینان سے سوتا تھا۔ بے اطمینانی کا سبب بالکل نیا تھا جس کی وجہ سے گزشتہ رات میرے خیالات کے انتشار نے مجھے بیمار رکھا تھا اور دن میں بھی تشویش کے باعث میں پوری طرح کام کی نگرانی میں دلچسپی نہیں لے سکا تھا۔ گزشتہ روز ثروت مجھ سے ملاقات کے لیے نہیں آئی تھی۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا تھا اور بے چینی سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ کہیں وہ باہر میرا انتظار تو نہیں کر رہی ہے لیکن موجودہ حالت میں یہ مشکل تھا کہ ثروت آئے اور کوئی اسے مجھ سے نہ ملنے دے۔ شام کے بعد رات آگئی تو میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ آخر وہ کیوں نہیں آئی کیا وہ بیمار ہے؟ اگر وہ بیمار ہوتی تب بھی کسی کے ہاتھ پیغام تو بھیج کسی کے ہاتھ میرے لیے کپڑے اور سگریٹ اور کافی تو ارسال کرتی۔ اخبارات مجھے جیل کے اندر ہی مل جاتے تھے اور کتابیں پڑھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ بعض اوقات تو میں اخبار بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ صبح ہوتے ہی کام شروع ہو جاتا تھا اور شام کو تھکن سے میرا اتنا برا حال ہوتا تھا کہ میں کھانا کھاتے ہی بستر پر پڑ جاتا تھا۔ جیل کے اندر کی سختی بہت کم ہو گئی تھی اور قیدِ بامشقت اب زیادہ سے زیادہ قیدِ تنہائی تھی یا نظربندی تھی۔ اس کے علاوہ علی بھائی کے ایثار اور تعاون کی امید نے میرے لیے انتظار کو آسان بنا دیا تھا۔ اب صرف پندرہ دن کی بات تھی اگر

کے بعد میں ثروت کے پاس پہنچ جاؤں گا اور ہم ... اس کے بعد ہم کیا کریں گے؟ کہاں جائیں گے؟ کب تک چھپ کر رہیں گے اور زندگی کے باقی دن کیسے گزاریں گے؟ ان سب سوالات کا میرے ذہن میں کوئی واضح جواب نہ تھا چنانچہ میں نے ان مسائل کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ پہلا مرحلہ باہر نکلنے کا تھا۔ اگر وہ طے ہو گیا تو یہ بھی طے کر لیں گے کہ خدا کی بنائی ہوئی اتنی بڑی دنیا کے کس گوشۂ عافیت میں پناہ لی جائے۔

میں نے بالکل بے خیالی میں ایک قدم آگے بڑھایا اور قیدیوں کی قطار میں شامل ہو کے لکڑی کی سیڑھی کی جانب چلنے لگا۔ میں بالکل کنارے کے قریب تھا جب کسی نے مجھے دھکا دیا۔ میرا توازن ایک دم بگڑ گیا لیکن میرے پیچھے کھڑے ہوئے کرم داد نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ میری ایک آستین اس کی گرفت میں آ گئی اور میں دہشت سے نیم جاں خلا میں لٹکتا رہ گیا۔ پھر دوسرے قیدیوں نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ نیچے پہنچنے کے بعد کرم داد نے مجھے دلاسہ دیا اور خدا کا شکر ادا کرنے کو کہا کہ میں ایک حادثے میں جاں بحق ہونے سے بچ گیا۔ اگر میں اٹھارہ فٹ کی بلندی سے سر کے بل نیچے آتا تو زیرِ دیوار رکھے ہوئے بلڈنگ میٹریل سے ٹکرا کے میرا سر یقیناً پھٹ جاتا۔

"میرا خیال ہے یہ حادثہ نہیں تھا کرم داد۔" میں نے لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ پاؤں ابھی تک کانپ رہے تھے "کسی نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"کس نے؟" کرم داد نے بے یقینی کے لہجے میں کہا۔ "اور آخر کیوں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "میں نے جب سے کام کی نگرانی شروع کی ہے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ کسی کو بے عزت نہیں کیا اور کسی پر تشدد نہیں ہونے دیا۔ کسی کو مجھ سے دشمنی کیسے ہو سکتی ہے جبکہ میں نے کسی کو شکایت کا موقع بھی نہیں دیا۔"

"یہ تو اپنی ہی بات کی نفی کر رہا ہے اُلّو کے پٹھے۔" کرم داد نے حسبِ عادت مجھے گالی دے کر کہا۔ اس کی یہ گالی بھی خلوص اور اپنائیت کے اظہار کا ایک ذریعہ تھا۔

"لیکن میں نے کسی کے ہاتھوں کا دباؤ اپنی کمر پر محسوس کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کسی نے دونوں ہاتھوں سے مجھے دھکیلا تھا۔"

"تیرے بالکل پیچھے تو میں تھا۔" کرم داد نے میری سنجیدگی پر سنجیدہ ہو کے کہا۔ "لیکن دائیں اور بائیں طرف سے بھی لوگ آگے بڑھ کر قطار میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ تو نے کسی کو دیکھا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اسے اپنا وہم قرار نہیں دے سکتا کرم داد، لیکن کسی نے کچھ دیکھا ہی نہیں تو اس بات پر دماغ خراب کرنے سے کیا حاصل؟ میرا دماغ تو کل سے ویسے ہی خراب ہو رہا ہے۔ ثروت کیوں نہیں آئی آخر؟ کوئی بھی مجھے معلوم کر کے نہیں بتاتا۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دی جائے۔ میں اپنے ایک دوست کے گھر فون کرتا۔ وہ میرے گھر جا کر دیکھتا اور مجھے یہاں پیغام پہنچا دیتا۔ کل سے میرے دل میں عجیب سے وحشت ناک خیالات آ رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ثروت کے نہ آنے کا سبب بیماری ہو سکتی ہے۔"

"تیرا خیال ہے اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو گا؟" کرم داد نے کہا۔ "فون کیوں نہیں کیا تھا؟ جیلر نے اجازت نہیں دی تھی کیا؟"

"نہیں، ٹیلی فون خراب تھا۔" میں نے کہا۔ "کل پھر کوشش کروں گا۔"

لیکن اگلے دن ٹیلی فون کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ دوپہر سے پہلے مجھے جیلر کا پیغام ملا۔ مجھے فوراً اس کے آفس میں طلب کیا گیا تھا۔ میں قیدیوں کے کپڑوں میں گرد اور پسینے کے ساتھ خستہ حال اس کے آفس میں پہنچا تو وہاں ایک وکیل بیٹھا ہوا تھا۔ کسی نامعلوم خوف سے میرا دل بیٹھنے لگا۔

"مسٹر ارشد محمود۔" وکیل نے مجھ سے بداخلاقی کے ساتھ مصافحہ کیا اور تحقیر آمیز لہجے میں بات کی۔ "میں آپ کو یہ نوٹس ریسیو کرانے آیا ہوں۔" اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا اور فائل میں لگا ہوا دوسرا ویسا ہی کاغذ میرے سامنے کر دیا۔ "اس پر اپنے دستخط کر دیں۔"

"میں نوٹس کو پڑھے بغیر کسی جگہ دستخط کرنے کا پابند نہیں مسٹر ایڈووکیٹ!" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ اس کا تحکمانہ انداز مجھے سخت گراں گزرا تھا۔ "کس نے بھیجا ہے تمہیں؟"

"تمہاری بیوی نے۔" وہ غرا کے بولا۔ "اور یہ طلاق کا نوٹس ہے۔"

اس کے الفاظ کا مجھ پر وہی اثر ہوا جو گزشتہ شام کسی کے دھکے سے نیچے گرتے وقت ہوا تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کچھ دیر کے لیے مفلوج ہو گئی اور میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ اس وقت تو کرم داد نے مجھے تھام لیا تھا لیکن اس وقت میں جس اندھے، بے رحم اور بھیانک خلا میں گر رہا تھا وہ لامحدود تھا اور مجھے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ میری خاموشی میری فغاں بن گئی تھی جو سوال کرتی تھی کہ کیا یہ جھوٹ نہیں ہے؟ کیا

واقعی ثروت کے ملاقات کے لیے نہ آنے کا یہ سبب تھا؟ کیا زفاقتوں کے سب عہد جو میرے ماضی کا حصّہ تھے نقشِ برآب تھے؟ اس کی محبت کاغذ کی ناؤ تھی جس کو حالات کے ایک ہی تھپیڑے نے ڈبو دیا؟ اس کے وعدے اور وہ سب خواب جو اس نے میرے ساتھ دیکھے تھے فریبِ آرزو تھے؟

"اگر تم اس پر دستخط نہیں کرو گے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" وکیل نے کہا۔ "جیلر صاحب کے سامنے میں نے نوٹس تمہیں تھما دیا ہے اور زبانی بھی بتا دیا ہے کہ اس وقت میرے آنے کا مقصد کیا ہے۔ ثروت کو عدالت سے طلاق مل جائے گی۔ تم کو ہر بار ہتھکڑی کے ساتھ حوالاتیوں کی گاڑی میں پیش کیا جائے گا اور تمہاری اس رسوائی کا تماشا وہ سب دیکھیں گے جو پہلے تمہارے دوست تھے۔"

"میں تمہارے قانون کی کسی عدالت سے اپنے دل کی... عدالت کو بڑا سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو میں اسے زبردستی کیسے رکھ سکتا ہوں۔ میں اسے طلاق دے دوں گا لیکن ایک شرط پر۔"

"شرط؟ آل رائٹ، کیا شرط ہوگی وہ؟" وکیل بولا۔ "وہ حق مہر پر اصرار نہیں کر رہی ہے۔"

"میری شرط صرف یہ ہے کہ وہ طلاق سے پہلے ایک بار مجھ سے مل لے۔" میں نے کہا۔

"سوری، میں اپنی مؤکلہ کی طرف سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔" وکیل نے کہا۔ "صرف یہ پیغام پہنچا سکتا ہوں۔"

جب وکیل چلا گیا تو میں نے نوٹس کو پھر پڑھا۔ اس میں مجھ پر جتنے الزامات لگائے گئے تھے بے بنیاد تھے۔ ان کا مقصد محض طلاق کے لیے جواز پیدا کرنا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ میں ایک بدکردار اور بدچلن آدمی ہوں۔ بیوی کے ساتھ انتہائی غیر مہذب اور ناروا سلوک کرتا ہوں۔ نشے میں اس پر جسمانی تشدد کرتا ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وفادار نہیں۔ میرے تعلقات آبرو باختہ عورتوں سے تھے اور بالآخر میں انھی میں سے ایک کے قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ ان حالات میں کوئی بھی شریف عورت میرے ساتھ گزارا نہیں کر سکتی۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ میں ہار گیا ہوں، میرے عزائم کو شکست ہو گئی ہے اور اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا ہوں۔ میری ساری متاعِ عزم یہ اعتماد تھا کہ میں بے گناہ ہوں اور دنیا کچھ بھی سمجھے ثروت میرے ساتھ ہے تو میں اپنی دنیا کہیں بھی آباد کر سکتا ہوں۔ اعتماد کا یہ آئینہ چکنا چور ہو گیا تھا

اور اب میں تھا اور ماتم یک شہرِ آرزو۔ توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا۔ رات کو میں نے وحشت اور جنون کی کیفیت میں دیوار سے سر پھوڑ کر مرنے کی ناکام اور احمقانہ کوشش کی۔ میری خودکشی سے ثروت کی بے وفا سرشت نہیں بدل سکتی تھی۔ جیلر جو سخت گیر مگر دل کا اچھا آدمی تھا اور سارے حالات کو سمجھتا تھا اسپتال میں مجھ سے ملنے آیا۔

"ایک عورت کی خاطر مرنا چاہتے ہو؟ اور ایسی عورت کی خاطر جو تمہیں چند مہینے بھی یاد نہ رکھ سکی؟ وفا پرست ہوتی تو تمام عمر تمہارا انتظار کرتی۔" جیلر نے کہا۔ "فارگیٹ اباؤٹ ہر۔ تم ذہین، پڑھے لکھے اور محنتی آدمی ہو۔ باہر نکلو گے تو کوئی دوسری عورت مل جائے گی جو وفادار ہو گی۔ میرا خیال ہے یہ اچھا ہوا کہ تم کو ایک غلط قسم کی عورت کے ساتھ پوری زندگی نہیں گزارنی پڑی۔ خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔"

"میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟" میں نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا کیونکہ میں سکون آور دواؤں کے زیرِ اثر تھا۔

"کیا کرتا! میں اس کو تین بار طلاق دے کر بہت سکون محسوس کرتا۔" وہ بولا۔

اگلے دن میں نے یہی کیا۔ جب وکیل نے میرے سامنے طلاق نامہ رکھا تو میں نے کوئی سوال کیے بغیر اس پر دستخط کر دیے، دنیا کے ساتھ مجھے ثروت سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔

"میں نے تمہاری شرط کا ذکر اپنی مؤکلہ سے کیا تھا۔" وکیل نے مسکرا کے کہا۔ "وہ تم سے اس شرط پر ملے گی کہ پہلے تم اس کو طلاق دے دو۔"

"اس... سے جا کر کہہ دینا کہ میں اس کی شکل دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا۔" میں نے اشتعال میں ثروت کو ایک فحش گالی دے کر کہا۔ "اس سے کہنا میرے گھر سے ہی نہیں اس شہر سے بھی دور چلی جائے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ کسی دن وہ میرے سامنے آ جائے تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں۔"

"چونکہ تمہیں ایک ذہنی صدمے نے سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا ہے اس لیے میں تمہاری دھمکی کو نظرانداز کرتا ہوں۔" وکیل نے کہا۔ "وہ تمہارے گھر سے جا چکی ہے۔ کہاں؟ یہ میں نہیں بتاؤں گا کیونکہ میری مؤکلہ خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے، وہ تمہاری کوئی چیز لے کر نہیں گئی ہے اور چابیاں تمہارے بھائی کے حوالے کر گئی ہے۔ تم نے طلاق نامے پر دستخط کر کے خود کو اور میری مؤکلہ کو..."

"گیٹ آؤٹ۔ میری مؤکلہ کے بچّے۔" میں نے چیخ کر وکیل کو ایک گالی دی اور باہر نکل گیا۔ دوسرے دن میں نے اس عورت کے نام کو لوحِ دل سے کھرچ کے مٹا دیا جس نے حالات کی گواہی پر اعتبار کیا تھا اور مجھے نہیں پہچان سکی تھی جو خلوت و

Farrukh Malik

جلوت میں اس کا ہمراز، اس کا مجازی خدا رہا تھا۔ اس کی آنکھ کے لیے حقیقت وہی تھی جو ظاہر تھی۔ اس نے میرے باطن کو نہیں سمجھا تھا۔ ایسی عورت زندگی کے طویل سفر میں رفاقت کا حق کیسے ادا کر سکتی تھی۔ میں نے کرم داد سے اس موضوع پر بات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

"آج علی بھائی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، اسے اسپتال لے گئے ہیں۔" کرم داد بولا۔ "اچھا ہوا کہ تم اسپتال سے اٹھ کر آ گئے ورنہ ایک ہی وارڈ میں یا ساتھ ساتھ کے بیڈ پر دونوں ہوتے تو صورتوں کی یکسانیت کا معاملہ سامنے آ جاتا۔"

"مجھے تعجب ہے کہ ابھی تک کسی نے بھی یہ نوٹ نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ ہم دونوں واچ ٹاور کی زیرِ تعمیر دیوار کے نیچے کھڑے تھے اور قیدیوں کو مشقّت کرتے دیکھ رہے تھے۔" وہ مجھے پھر نظر بھی نہیں آیا۔"

"علی بھائی سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔" کرم داد نے کہا۔ "سب ہی جانتے ہیں کہ اس کی زندگی کے دن بہت کم ہیں چنانچہ کوئی اس کے ساتھ زیادتی کر کے گناہ گار نہیں بننا چاہتا۔ وہ اپنی کوٹھری میں پڑا رہتا ہے یا اپنی ہی بیرک میں بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی دو چار دن کے لیے جیل کے اسپتال بھی چلا جاتا ہے لیکن ان کے پاس کینسر کا علاج نہیں ہے۔ وہ عارضی افاقے کی دوا دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔"

"کرم داد، کہیں خدانخواستہ...!" میں نے کہا۔ پھر اپنی کمینگی پہ مجھے اتنی شرم آئی کہ میں آگے کچھ نہ کہہ سکا۔"

"نہیں، وہ تیری رہائی سے پہلے نہیں مرے گا اُلو کے پٹھے۔" کرم داد نے کہا۔ پھر وہ اچانک چلّایا اور اس نے مجھے یوں دھکّا دیا کہ تو دبھی میرے ساتھ دور جا پڑا۔ میرے کانوں میں ایک دھماکے کی آواز آئی اور چند سیکنڈ کے لیے سارا منظر گرد و غبار میں چھپ گیا۔ پھر میں آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھارہ فٹ سے زائد کی بلندی پر بیٹھے ہوئے راج بھی نیچے دیکھ رہے تھے اور ان کے ساتھ کھڑا ہوا ایک شخص بھی بت بنا ہوا تھا۔ وہ اینٹوں کو نیچے سے اوپر کھینچنے پر مامور تھا۔ نیچے کام کرنے والے قیدی نائلون کی ڈوری کے مضبوط جال میں ایک ساتھ پچیس اینٹوں کو لپیٹ کر رسّی کے ساتھ باندھ دیتے تھے اور اوپر تختے پر کھڑا ہوا شخص اس بوجھ کو کھینچ لیتا تھا۔ رسّی ایک چرخی نما بیلن پر سے گزرتی تھی چنانچہ اسے زیادہ طاقت نہیں صرف کرنی پڑتی تھی۔ پچیس اینٹوں کا بوجھ اسی کے ہاتھوں سے رسّی نکل جانے کے باعث نیچے گرا تھا۔

پہاڑ سے ٹوٹ کر گرنے والی چٹان کی طرح اینٹوں کا یہ ڈھیر مجھے کچل سکتا تھا لیکن سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے فرق سے قدرت نے مجھے ایک اور زندگی بخش دی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ ایک بار پھر کرم داد کی نظر نے ہی موت کے قاتل ہاتھ کو میری طرف لپکتے دیکھا اور بروقت حرکت میں آ کے مجھے بچا لیا۔ میں ہاتھوں اور پیروں کی لرزش پر قابو پا کے آہستہ آہستہ اوپر چڑھا، ایک ایک تختے پر قدم جماتا اور ہر تختے کی مضبوطی کا اندازہ کرتا۔ رسّی چھوڑ دینے والا سخت خوف زدہ اور شرمسار کھڑا تھا۔

"رسّی... وہ... میرے ہاتھوں پر پسینہ تھا۔" وہ ہکلایا۔ "رسّی پھسل گئی۔"

یکلخت میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ اگرچہ گزشتہ بار مجھے اوپر سے موت کے منہ میں دھکیلنے والے کا چہرہ میری نظر نہ دیکھ سکی تھی لیکن میں نے ایک آواز سنی تھی۔ اپنے یقین کے باعث مجھے دھکا دینے والے نے ایک گالی دی تھی جو ایک غیر ارادی فعل تھا۔ یہ وہی آواز تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی صورت پر لکھی ہوئی جرم کی تحریر دیکھ کر مجھے یقین آنے لگا کہ یہی وہ قاتل چہرہ تھا جو میں نے قطار میں دیکھا بھی تھا لیکن کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لاشعور کے ڈارک روم سے پرنٹ ہو کے نکلنے والا نیگیٹو اب ایک صورت کو واضح طور پر پیش کر رہا تھا۔ میں نے اپنے دشمن کو پہچان لیا تھا۔

"تمہیں محتاط ہو کے کام کرنا چاہیے۔" میں نے زبردستی مسکرا کے کہا اور اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "خدا کو ابھی زندہ رکھنا منظور تھا ورنہ میں تیرِ قضا کے نشانے پر ہی کھڑا تھا۔"

"مجھے معاف کر دیں جی۔" اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا اور میں فقط سر ہلا کے نیچے اتر آیا۔ یوں جیسے میں نے قتل کی اس کوشش کو حادثہ سمجھ کے قبول کر لیا ہے مگر کرم داد سے میری صورت کے تاثرات چھپے نہ رہ سکے۔

"اس سوّر کے بچّے نے جان بوجھ کے رسّی چھوڑی تھی۔" کرم داد نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ اور یہی وہ شخص ہے کرم داد جس نے مجھے اوپر سے دھکیل کر ہلاک کرنا چاہا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی جیلر صاحب سے مل کر آتا ہوں۔ تم کسی سے کچھ مت کہنا۔"

جیلر نے میری بات دھیان سے سنی اور شاید یہ میرے لہجے کا یقین تھا جس نے اسے قائل کر لیا۔ "تم پر دو بار قاتلانہ حملے کی واردات کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟" وہ بولا۔

"یہی تو مجھے معلوم کرنا ہے سر۔" میں نے کہا۔

"کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟" جیلر نے کہا۔ "پہلے کبھی ملے ہو اس سے؟"

"نہیں سر! میری یادداشت میں چہرے ہی نہیں، نام، پتے اور ٹیلیفون نمبر تک محفوظ رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

FarrukhMalik

"آل رائٹ۔ مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟" جیلر بولا۔ "میں انکوائری کردوں؟"

"نہیں سر۔ میں اس خبر کو پھیلانا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "خود اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ کس نے اسے میرے قتل پر مامور کیا ہے؟ آپ یقین کریں یا نہ کریں سر، پہلے مجھے ایک سازش کے تحت تختۂ دار تک لے جانے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ مجھے جیل کے اندر ختم کرانے کی سازش ہے۔"

"خیال رکھنا کہ وہ مرنے نہ پائے۔" جیلر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔ یہ صرف اجازت ہی نہیں تھی اس بات کا اشارا بھی تھا کہ اقبالِ جرم کرانے کے لیے میں تشدد کے حربے بھی محدود پیمانے پر آزما سکتا ہوں۔

ایک گھنٹے بعد قیدیوں کو دوپہر کا کھانا دیا گیا تو کرم داد اس شخص کو میرے پاس لے آیا کہ وہ مجھ سے پھر معافی مانگ لے تاکہ میں جیلر سے شکایت نہ کروں۔ وارچ ٹاور کے نیچے چھت کی شٹرنگ لگی ہوئی تھی اور ویلڈنگ کا وہ سامان پڑا ہوا تھا جو لوہے کے سریوں کو جوڑنے کے لیے لایا گیا تھا۔ آخری گوشے میں سریوں اور تختوں کے ڈھیر کے پیچھے تاریکی اتنی گہری تھی کہ وہ مجھے دیکھ ہی نہ سکا۔ آخری وقت میں اسے شک ہوا کہ وہ کرم داد کا اسیر ہے اور اس نے فرار ہونا چاہا مگر کرم داد نے اسے دبوچ لیا اور کونے میں گھسیٹ لایا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی تھی۔ اسے نیچے گرا کر اور گھٹنے کا زور ڈال کے میں اور کرم داد اس کو قابو کرنے اور اس کے حلق میں کپڑا ٹھونسنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ سخت دہشت کے عالم میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ کرم داد نے ویلڈنگ ٹارچ کے شعلے کو روشن کیا اور دونوں نلکیوں سے آنے والی گیس کو صحیح تناسب اور پریشر کے ساتھ ایک پھنکارتے ہوئے نیلگوں شعلے کی زبان بنا دیا۔ آہستہ آہستہ شعلے کی لَو سفید پڑ گئی۔

"اس شعلے کا درجۂ حرارت تین ہزار ڈگری سینٹی گریڈ سے زیادہ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ اس طرح نہیں سمجھے گا صاحب۔" کرم داد نے شعلے کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا کے کہا۔ "اس سے چند سیکنڈ میں لوہے کی چھ انچ موٹی چادر کٹ جاتی ہے۔" پھر اس کا ثبوت دینے کے لیے کرم داد نے ایک سریے کا ٹکڑا اٹھایا اور ویلڈنگ ٹارچ کے شعلے سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ درمیان سے جدا ہونے والے دونوں حصے انگارا بن کے فرش پر پڑے دہکتے رہے۔

"اگر میں نے یہ شعلہ تمھارے سر سے لگا دیا تو تمھاری پیشانی کے بیچ میں سوراخ ہو جائے گا۔" کرم داد نے کہا۔ "اور اندر تمھارا مغز فرائی ہو جائے گا۔ تمھاری لاش کسی کو کچھ نہیں بتا سکے گی۔"

"لیکن تم ہمیں کچھ بتانے کا وعدہ کرو تو ممکن ہے کل بھی زندہ رہو۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ جھوٹ تمھاری جان نہیں بچا سکتا۔ آگے تمھاری مرضی۔"

"تم نے حلق سے آواز بھی نکالی تو اس شعلے سے میں تمھارے سر کو درمیان سے کاٹ دوں گا۔" کرم داد بولا۔ پھر میں نے اس کے حلق سے کپڑا نکال دیا اور اسے چند سیکنڈ کی مہلت دی۔ اس کی نظر ایک لمحے کیلیے بھی ویلڈنگ ٹارچ سے نہیں ہٹی جو اس کے چہرے سے ایک فٹ کے فاصلے پر سنسنا رہی تھی۔

"تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟" میں نے کہا۔ "ایک بار نہیں دو بار۔"

"میں... میں کیوں قتل کروں گا... میری کوئی دشمنی نہیں۔" وہ ہکلاتے ہوئے بڑی مشکل سے بولا۔

کرم داد نے ویلڈنگ ٹارچ کو ایک دم آگے بڑھایا۔ "ہم سے بدمعاشی؟"

"ٹھہرو۔" وہ شخص دہشت زدہ ہو کے چلّایا۔ "مجھ سے میری بیوی نے کہا تھا... اس نے کہا تھا کہ اس کام کے پچاس ہزار مل سکتے ہیں... مگر یہ کام ایک مہینے میں ہو جائے تو بہتر ہے... ورنہ ہر ماہ دس ہزار کم ہوتے جائیں گے۔ پانچ ماہ بعد یہ کام کسی اور کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"کب کہی تھی تمھاری بیوی نے تم سے یہ بات؟" میں نے کہا۔

"پرسوں۔ جب وہ ملاقات کے لیے آئی تھی۔" وہ کانپتے ہوئے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم اس سے کس نے کہا تھا۔"

"یہ ہم اسی سے پوچھ لیں گے۔" کرم داد بولا۔ "کہاں رہتی ہے وہ؟"

"انجینئر صاحب... انجینئر صاحب!" باہر سے کسی نے مجھے پکارنا شروع کیا۔

"تو جا، دیکھ کیا بات ہے؟" کرم داد نے کہا۔ "یہ کوئی یہاں آ جائے؟"

میں زیرِ تعمیر بلاک کی دیواروں کے درمیان پڑے ہوئے ملبے اور ساز و سامان کے ڈھیر سے گزرتا ہوا باہر نکلا۔ "کیا بات ہے؟" میں نے اس قیدی سے کہا جو مجھے ہر سمت تلاش کر چکا تھا۔

"آپ کی ملاقات ہے۔ گھر والی آئی ہے۔" وہ بولا۔

Farrukh Malik

"میری گھروالی!" میں نے اسے گردن پکڑ کے دبوچ لیا۔ "تم کو کس نے بتایا؟ تم جانتے ہو اسے؟"

"میں... مجھے نہیں معلوم سر۔ جیلر صاحب کے پاس کوئی عورت بیٹھی ہے۔" وہ گھبرا کے بولا۔

جیلر کے کمرے میں بائیس چوبیس سال کی ایک عورت.. بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے عارض کی سفیدی میں بغیر کاجل کے گہری سیاہ نظر آنے والی آنکھیں بہت بڑی اور بہت نمایاں لگتی تھیں۔ اس کے اتنے ہی کالے بال رُخِ روشن کے گرد ایک سرسراتے ریشم کے سیاہ ڈھیر کی صورت میں پھیلے تھے اور اس کے سر کی ایک جنبش سے پھر سمٹ جاتے تھے۔ مجھے اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی لیکن بہت سوچنے پر بھی مجھے نام یاد نہ آیا۔

"غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں ارشد محمود صاحب۔" وہ میری متحیر صورت کو دیکھ کر بولی۔

"حالانکہ انھوں نے میرے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ صورت ہی نہیں انھیں نام پتے اور ٹیلیفون نمبر تک یاد رہتے ہیں۔" جیلر ہنسا۔

میں شرمندہ بھی ہوا اور جیلر کے خوشگوار موڈ پر حیران بھی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں لوزافشاں ہوں۔" وہ بولی۔ "ٹی وی اور اسٹیج کی آرٹسٹ۔"

"آپ تو اسم بامسمیٰ ہیں۔" میرے منہ سے نکل گیا۔ "مجھے بہت ندامت ہے کہ میرا دعویٰ اتنی جلدی غلط ثابت ہوا۔ آپ کو تو میں نے نہ جانے کتنی بار دیکھا ہوگا۔"

"بس بس... اب یہ نہ کہیے گا کہ میں آپ کے فن کا پرستار ہوں اور آپ بہت عظیم فنکارہ ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "سچ یہ ہے کہ میں نے یہ جملے اتنی بار سنے ہیں اور اپنے نام سے شائع ہونے والے انٹرویو میں اتنی بار پڑھے ہیں کہ مجھے الرجی ہو گئی ہے اپنے پرستاروں سے۔ پہچاننے والوں نے میری ذاتی حیثیت ختم کر دی ہے اور قدم قدم پر کسی فین کے ملنے کا خوف میرے اعصاب پر سوار ہونے لگا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ ان میں شامل نہیں۔"

"اس عزت افزائی کا شکریہ۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟" میں نے کہا۔

"ایک زمانے میں آپ میرے والد کے ماتحت تھے۔" وہ بولی۔ "وہ پی ڈبلیو ڈی میں سپرنٹنڈنٹ انجینئر تھے اور آپ اسسٹنٹ انجینئر بھرتی ہو کر آئے تھے۔ یہ پشاور کی بات ہے۔ آپ بارہ لائن میں رہتے تھے اور ہمیں قریب ہی این سی روڈ کے پاس کوٹھی ملی ہوئی تھی جہاں سے مال شروع ہوتی ہے۔" وہ ذرا سی دیر کے لیے رکی۔ "نجم الدین میرے والد تھے۔"

"تھے کا کیا مطلب؟" میں نے رکتے رکتے کہا۔

"جی، ان کا ابھی تین ماہ قبل انتقال ہوا ہے۔" وہ افسردہ ہو گئی۔ "ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ کنٹریکٹر بننا چاہتے تھے مگر ان کو بلڈ پریشر تو پہلے ہی تھا۔ انلارجمنٹ آف ہارٹ کے ساتھ ہی شکر کی بیماری ہو گئی۔ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے تھے، ورنہ آپ سے ملنے ضرور آتے۔ انھوں نے آپ کے کیس کی تمام تفصیلات اخبار میں دیکھی تھیں اور وہ کہتے تھے کہ ارشد کے خلاف یہ الزام غلط ہے... میں اسے جانتا ہوں۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔"

خاموشی کا ایک مختصر سا سوگوار وقفہ آیا۔ وہ تین سال میرے افسرِ اعلیٰ رہے۔ میرے اور ان کے درمیان ایک ایکس ای این تھا جو محض اس لیے میرا دشمن ہو گیا تھا کہ میں پی ڈبلیو ڈی جیسے محکمے میں ایمان داری کا ڈھول پیٹتا تھا۔ میں نے اسے کبھی حرام کھانے سے منع نہیں کیا تھا لیکن اس کے ذہن میں ایک خوف تھا کہ یہ حلال خور کہیں مجھے پھنسا ہی نہ دے۔ میں اس کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ نجم الدین مرحوم نے مجھے تحفظ فراہم نہ کیا ہوتا تو وہ مجھے کسی نہ کسی جھوٹے مقدمے میں پھنسوا کے نکلوا دیتا۔ خود نجم الدین صاحب رشوت خوروں کے درمیان رزقِ حلال پہ اکتفا کر کے کیسے بچے رہے اور کس طرح ترقی کرتے گئے، یہ صرف خدا کا فضل تھا۔

"انھوں نے مجھ سے بارہا کہا تھا کہ میں آپ سے ملوں۔" افشاں بولی۔ "اس زمانے میں آپ ضمانت پر تھے لیکن مصروفیات نے مجھے مہلت نہ دی۔ پھر وہ خود اتنے علیل ہوئے کہ آخری تین مہینے اسپتال میں رہے۔ اس زمانے میں میرے بہت سے کنٹریکٹ بھی منسوخ ہوئے اور ٹی وی پر تو ایک طرح سے مجھے بلیک لسٹ کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ میں نے ایک سیریل کی ریکارڈنگ درمیان میں چھوڑ دی تھی لیکن وہاں اچھے لوگ بھی ہیں۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو سب آئے تھے اور انھوں نے یقین دلایا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا مگر چہلم تک تو میں کہیں گئی ہی نہیں۔ اس کے بعد جانا پڑا۔ دنیا کے کاروبار کب تک بند رکھے جا سکتے ہیں۔ پرانے سیریل کی باقی چار قسطوں کو پورا کیا۔ اس کے ساتھ ہی اسٹیج والوں نے دھاوا بول دیا اور میں بہت نادم ہوں کہ اپنے والد کی وصیت پر عمل کرنے کا موقع بھی آج ملا۔ انھوں نے مرنے سے دو دن پہلے کہا تھا کہ ارشد سے ضرور ملنا۔"

"آئی ایم ویری سوری۔ میں خود اتنا احسان فراموش اور نالائق ہوں کہ پھر کبھی ان سے نہیں ملا۔" میں نے کہا۔ "میرا ٹرانسفر ہوتا رہا۔ لاہور، حیدرآباد، کراچی، پھر راولپنڈی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے دستِ شفقت سے محروم ہونے کے بعد ہر جگہ مجھے

پریشانی اٹھانی پڑی۔ میرے نام گمنام خطوط لکھے گئے، مجھ پر جھوٹے الزامات لگائے گئے اور مجھے بار بار ٹرانسفر کیا گیا۔ ذرا ذرا سی بات پر چارج شیٹ اور وارننگ دی گئی اور میری 'اے سی آر' میں میرے خلاف انتہائی بے بنیاد اور غلط باتیں لکھ کر میرا ریکارڈ خراب کیا گیا۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور میں نے خود ہی تنگ آ کے استعفا دے دیا۔ میری چھوٹی سی کنسٹرکشن کمپنی نئی تھی لیکن ترقی کرنے لگی تھی کہ تقدیر نے نیا شوشہ چھوڑ دیا... خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ آپ کا آنا ہی بہت غنیمت ہے ..... میرا پتا... "

" کل میں نے اخبار میں آپکی تصویر دیکھ لی تھی " وہ بولی۔

" میری تصویر؟" میں نے حیران ہو کے کہا " اب کیا ہوا کہ کسی نے سابق سول انجنیئر ارشد محمود کو یاد کیا؟ "

" وہ ... دراصل ... خبر یہ تھی کہ آپ کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہوگئی " وہ افسوس سے بولی۔

" اچھا، تو ثروت نے یہ اشتہار بھی دے دیا " میں نے تلخی سے کہا " تاکہ اس کا نام بھی کوئی میرے نام کے ساتھ نہ لے۔ کیا تھا اس خبر میں، آپ کو کچھ یاد ہے؟ "

" یہی کہ فلاں مقدمۂ قتل میں سات سال قیدِ بامشقت کی سزا پانے والے انجنیئر ارشد محمود کی بیوی نے طلاق حاصل کر لی ہے " نور افشاں نے نظر جھکا کے کہا " اور آپ کا خیال درست ہے۔ اس نے ایک اشتہار بھی دیا تھا۔ خبر تو اس نے کسی سے مل کر لگوائی ہوگی، اشتہار اپنے خرچ پر دیا تھا کہ آئندہ ارشد محمود سے تعلق نہ ہونے کے باعث مجھے اپنے پرانے نام ثروت سلطانہ سے پکارا جائے "

غصے کی ایک اور لہر اٹھی۔ نفرت کی جھاگ اڑاتی اور میرے خیالات کو تہہ و بالا کرتی، مگر میں نے اس کو روک لیا۔

" برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟ " وہ بولی " آخر آپ نے ثروت میں کیا دیکھا تھا کہ اس سے شادی کر لی۔ وہ ایسی عورت تو نہیں تھی جو گھر بساتی، روایتی انداز میں۔ جو کچھ مجھے والد نے بتایا تھا اس سے بھی میں نے یہی اندازہ کیا تھا کہ آپ کے اور اس کے مزاج میں تو زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ویسے بھی میں آپ کو جانتی تھی۔ جب آپ اسسٹنٹ انجنیئر تھے تو کبھی کبھی ہمارے گھر آتے تھے اور معاف کیجیے گا، میں آپ کو شرمیلا نہیں کچھ بیوقوف سمجھتی تھی۔ آپ نے کبھی مجھے نظر اٹھا کے نہیں دیکھا تھا۔ کیا میں اتنی بدصورت ہوں؟ "

" پھر تو آپ نے ٹھیک ہی سمجھا تھا " میں نے کہا " مجھے واقعی یاد نہیں کہ نجم الدین صاحب کی کوئی بیٹی بھی تھی "

" میں اسلامیہ کالج میں پڑھتی تھی " وہ بولی " انٹر کے بعد چھوڑ دیا۔ ریڈیو پاکستان پشاور میں قاضی سرور صاحب تھے۔ انھوں نے ریڈیو ڈراموں میں صداکاری کا موقع دیا اور والد سے اجازت بھی لی۔ وہیں سے یہ شوق کا سفر شروع ہوا اور صداکاری سے میں اداکاری کی منزل تک جا پہنچی۔ ثروت میری کلاس فیلو تھی اور بہت بدنام تھی "

" وہ ... نمبر ... میرا مطلب ہے ارشد " جیلر نے پہلو بدل کے کہا " کام کہاں تک پہنچا؟ " یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ باتیں بہت ہو چکیں اس سے زیادہ رعایت کی گنجائش نہیں۔ یہ رعایت بھی مجھے نور افشاں کے طفیل ملی تھی کیونکہ جیلر بھی اس کا یا اس کے فن کا پرستار تھا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ نور افشاں اسے نظر انداز کر رہی ہے۔ ایک قیدی پر ملتفت ہے اور صاف کہہ چکی ہے کہ اسے فین کے نام سے چڑ ہے۔ نور افشاں نے اس کا مطلب سمجھ لیا اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھ سے پھر ملاقات کا وعدہ کیا اور جیلر کا شکریہ ادا کر کے نکل گئی۔ اس رات میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن تاریکی میں ایک چہرہ تھا کہ بار بار روشن ہوتا تھا۔ الفاظ کی بازگشت پکارتی تھی " ویسے بھی میں آپ کو جانتی تھی، آپ شرمیلے ہی نہیں بے وقوف تھے کہ کبھی مجھے نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ کیا میں اتنی بدصورت ہوں " اور میں تصور میں نور افشاں کا متبسم چہرہ دیکھتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں مجرم اور گناہ گار ہی نہیں خطاکار بھی ہوں۔ کتنی بڑی خطا کی تھی میں نے نور افشاں کو نظر انداز کر کے۔ میں اندھا تھا کہ اس روشنی کو نہ دیکھا جو نور افشاں تھی اور اس سراب کی طرف لپکا جو ثروت سلطانہ تھی۔ کتنی صاف گوئی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ میرے اور ثروت کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس سچ کا احساس مجھے کتنی دیر سے ہوا۔ قصوروار تو تم بھی ہو افشاں! میں نے کہا۔ کیا تم مجھ سے پہلے نہیں مل سکتی تھیں؟ اور اب تک نہیں مل سکی تھیں تو اب ملنے کی کیا ضرورت تھی۔ زندگی یوں بھی گزر رہی جاتی!

علی بھائی نے میرے کپڑے پہن لیے تھے اور اب میں نو سو گیارہ سے تین سو تیرہ بن گیا تھا۔

" میں تمھارا یہ احسان زندگی کے آخری لمحے تک نہیں بھول سکتا " میں نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو روک کر کہا " یہ اتنا بڑا قرض ہے ... "

" ایسی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ارشد محمود " وہ بولا۔

" کیوں اپنے آپ کو دکھی کہتے ہو۔ تم پہلے ہی ...

نہیں ہو۔"

"تمھارا دکھ اپنی جگہ ایک کوہِ گراں تھا۔ اس پر تم نے میرے دُکھ کا بار بھی لے لیا۔"

"تم نے سُنا نہیں، درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔" وہ بولا۔ "میرے لیے اب کسی دُکھ کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں کل کے بجائے آج مرنے کو تیار ہوں۔ اگر یہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں کسی ایسے شخص کی جگہ پھانسی کے تختے تک اپنے پیروں سے چل کے جانا پسند کرتا جس کی سزائے موت معاف ہونے سے کسی ماں کو اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی واپس مل سکتی، کوئی گھر پھر آباد ہو سکتا اور کسی کو وہ سہارا پھر مل جاتا جو عزت و آبرو سے زندہ رہنے کے لیے ضمانت فراہم کرتا تھا۔"

"اگر میں پھر تم سے ملنے کے لیے بھی نہ آسکوں تو مجھے معاف کر دینا علی بھائی۔" میں نے کہا۔ "میں احسان فراموش نہیں ہوں مگر میں پھر نظر آیا تو پکڑا جاؤں گا اور مجھے باہر رہ کے بہت سے کام کرنے ہیں۔ ان کا پتا چلانا ہے جنھوں نے مجھے جیل کے اندر پہنچایا اور پھر مجھے قتل کرانا چاہا۔ یہ بتاؤ میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم میرے لیے دعائے مغفرت کرتے رہنا۔" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ یکلخت میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور میں اس کے کندھے پر سر رکھ کے بچّوں کی طرح رونے لگا۔

"یہ کیا کرتے ہو؟ جوان اور باہمت آدمی ہو۔" علی بھائی نے بڑے بھائی کی طرح میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "جاؤ، خدا تمھیں کامیاب کرے۔ زندگی کی ہر خوشی دے۔" میں ایک ناکردہ گناہ کی سزا پا کے نہیں رویا تھا۔ جیل میں بید سے مار کھا کے نہیں رویا تھا اور ثروت کی بے وفائی پر نہیں رویا تھا۔ ایک شخص کی نیکی کے زخم سے تڑپ اٹھا تھا۔ اللہ بڑا منصف اور بڑا غفور و رحیم ہے، اس نے مجھے قیدِ زنداں سے رہائی دلانے کا بندوبست کیا تھا تو علی بھائی کے لیے قیدِ حیات کو مختصر کر دیا تھا اور ہم دونوں کو علاجِ غمِ دوراں فراہم کر دیا تھا۔ گو اس کے وسائل اور اسباب جُدا تھے۔

"علی بھائی! میرے کپڑوں میں دو کیپسول ہیں۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "ان سے تم پر کم سے کم چھ گھنٹے تک نیند کی بے ہوشی طاری رہے گی۔ ہوش میں آنے کے بعد تم کہہ سکتے ہو کہ مجھے کسی نے دھوکے سے کھلا دیے تھے۔ یہ کہنا کہ ان سے درد میں فوراً کمی ہوتی ہے اور پھر کم سے کم ایک ہفتہ پُرسکون گزرتا ہے۔ وہ خود ہی سمجھ جائیں گے کہ یہ حرکت میرے سوا کسی کی نہ ہوگی۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ تم علی بھائی ہو۔ جیل کے ریکارڈ میں تمھارے فنگر پرنٹ ہیں۔ میرے جرم کی سزا تمھیں نہیں مل سکتی اور میرے فرار ہونے پر تمھاری آزادی سلب نہیں کی جا سکتی۔"

وہ مسکرایا۔ "مجھے آزادی کی ضرورت ہی نہیں تو میں یہ سب کیوں کروں؟ اچھا ہے تمھیں جتنی بھی مہلت مل جائے۔ کچھ دن بعد پتا تو چل ہی جائے گا۔ کبھی مہینے بھر بعد تو کبھی پندرہ دن بعد میری حالت بگڑ جاتی ہے تو وہ مجھے اسپتال لے جاتے ہیں اور جب نو سو گیارہ میں بھی بیماری کی وہی علامات ظاہر ہوئیں جو... تین سو تیرہ کو تھیں تو ڈاکٹر فوراً سمجھ جائیں گے کہ نمبر بدلنے سے آدمی نہیں بدلتا۔ میرا مرض جس مرحلے میں ہے وہاں تک کوئی ایک دم نہیں پہنچتا۔ جب تم آئے تھے تو بالکل ٹھیک تھے اور تین مہینے میں ایک بار ہی اسپتال گئے ہو، چند گھنٹوں کے لیے اور صرف سر کی چوٹوں کی مرہم پٹی کے لیے۔ وہ اسپتال کے حکام کو مطلع کریں گے اور وہ تفتیش کریں گے تو میں اعتراف کر لوں گا کہ میں نے ہی تمھارے فرار میں مدد کی تھی۔ میرے اعتراف نہ کرنے سے کوئی فرق بھی تو نہیں پڑتا۔ وہ پتا چلا ہی لیں گے۔ اس کے بعد جو اُن کا دل چاہے میرے ساتھ کریں۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مجھ پر تشدد کوئی نہیں کرے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ سزا کی میعاد میں اضافہ کر دیں گے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میری تو دعا ہے کہ تمھیں کم سے کم ایک مہینہ مل جائے اور اس عرصے میں مجھے اسپتال نہ جانا پڑے۔ پندرہ دن بھی نہ ملیں تو اس میں میرا قصور نہ ہوگا۔ تمھارے کام کی نگرانی کرانا آسان کام نہیں لیکن کرم داد نے کہا ہے کہ وہ مدد کرتا رہے گا۔ اصل کام تو اب ختم ہو گیا ہے۔"

ایک بار پھر اس سے گلے مل کر رخصت ہوا تو میرے دل پر پہاڑ سے بڑا بوجھ تھا جس کے نیچے میری روح تڑپ رہی تھی... سسک رہی تھی اور فریاد کر رہی تھی۔ میں اپنے ضمیر کے آئینے میں اپنی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس میں مجھے اپنا ہی چہرہ... خندہ زن نظر آتا تھا جو میرے عزائم کا مذاق اڑاتا تھا۔ میں نے جیل کو ایک چیلنج سمجھ کے قبول کیا تھا اور سب کے سامنے اعلان کیا تھا کہ کسی جرم کے بغیر مجھے پسِ دیوارِ زنداں بھیجنے والے مجھے قید نہیں رکھ سکیں گے اور میں ساری زنجیروں کو توڑ کر اور سب دیواروں کو گرا کے نکل آؤں گا۔ یہ مجذوب کی بڑ تھی یا دیوانے کی بات۔ دنیا نے تو اسے ذہنی صدمے کا اثر سمجھا تھا مگر جیل کے اندر پہنچ کے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ زبانی دعوے کرنا تو بہت آسان تھا عملاً سزا کی میعاد پوری کیے بغیر نکلنا ناممکن ہے اور اب ستم ظریفِ تقدیر نے اس کے اسباب پیدا کر دیے تھے تو وہ عزائم ہی میرے لیے احساسِ گناہ کا عذاب ثابت ہو رہے تھے۔

زنداں کی آخری رات کرم داد نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں مگر میرا ذہن بھٹکتا رہا اور میں اسے ہُوں ہاں کر کے جواب دیتا رہا۔

تین مہینے میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے جیل کے اندر اپنا پہلا دن یاد آ رہا تھا۔ کرم داد سے ملاقات اور علی بھائی کی داستان تک یادوں کا ایک سلسلہ تھا جو ایک ہی گم گشتہ ماضی سے جا ملتا تھا۔ ہم سب وقت کے منہ زور اور طوفانی دریا میں بہنے والے بے بس تنکے تھے جو ایک جگہ اٹک گئے تھے۔ سب سے پہلے ساحلِ مراد تک پہنچنے والا میں تھا مگر یہ میری نہیں علی بھائی کی آزادی تھی جو اس نے مجھے خیرات کر دی تھی۔ میرے بعد علی بھائی کو رہائی ملنی تھی مگر یوں کہ اس قید سے اسے یومِ حشر تک کے لیے زمین کی قید میں رہنا تھا۔ ایک لاوارث، بے نشان، تنہا قبر میں جو اس کی موجودہ کوٹھری کے مقابلے میں کہیں زیادہ تنگ و تاریک تھی۔ آخر میں کرم داد کو اپنی سزا کاٹ کے نکلنا تھا اور وہ سب سے زیادہ خوش قسمت تھا کہ نہ اسے اپنی قید پہ ندامت تھی اور نہ اسے رہائی کے بعد کوئی احساسِ جرم ہو گا۔

"تو میری بات نہیں سن رہا ہے الّو کے پٹھے۔" کرم داد نے اچانک کہا۔

"سن رہا ہوں یار!" میں نے چونک کر شرمندگی سے کہا۔

"بکواس کرتا ہے تو۔" کرم داد بولا۔ "میں کہہ رہا تھا کہ تجھے اس سؤر کے بچے کی بیوی کا نام بتایا ہے نا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"اس کو بتا دینا کہ جیسے باہر وہ آزاد ہے ایسے ہی جیل کے اندر میں اس کے شوہر کو قتل کرنے کے لیے آزاد ہوں۔ اگر اس نے کسی سے کچھ کہا اور تجھے نقصان ہوا تو وہ بیوہ ہو جائے گی۔" کرم داد نے کہا۔

"یار کرم داد! میں تجھ سے پھر ملنے کے لیے نہیں آ سکوں گا۔" میں نے کہا۔

"دوبارہ ادھر کا رُخ کیا تو میں تجھے کبھی معاف نہ کروں گا۔" وہ برہمی سے بولا۔ "علی بھائی کو سکون سے مرنے تو دے۔ اس کی عاقبت... خراب کرے گا تو خدا بھی تجھے معاف نہیں کرے گا۔"

"میرا دل بھی یہ سوچ کے ٹوٹتا ہے کہ میں اس شخص کے جنازے کو کاندھا تک نہیں دے سکوں گا جس نے اپنے کاندھوں پر میری زندگی کی تمام سیہ بختی کا بوجھ اٹھا لیا کسی صلے کی تمنّا کیے بغیر، کچھ مانگے بغیر۔ میں اس کا قرض کیسے ادا کروں گا کرم داد! مجھے تو معلوم تک نہ ہو گا کہ وہ کب مر گیا۔ اس کے تو وارث بھی اس کی لاش لینے نہیں آئیں گے۔" میں بولتا گیا اور آنسو میری آنکھوں سے بہتے گئے۔

"ہم سب اس کے وارث ہیں۔" کرم داد نے کہا۔

"میں کسی نہ کسی طرح تجھ سے رابطہ رکھوں گا۔" میں نے کہا۔ "رہائی کے بعد مجھ سے ملنے ضرور آنا۔"

"اور میں کہاں جاؤں گا۔" وہ زبردستی ہنسا۔ "سیدھا تم دونوں کے پاس آؤں گا۔"

"ہم دونوں کے پاس؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "تیرا مطلب ہے...."

"ہاں، تیرے اور نور افشاں کے گھر۔" وہ بولا۔ "موقع ملتے ہی اس سے شادی کر لینا۔"

"کیا یہ میرے اختیار کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، مجھے معلوم ہے تو اس کو چاہتا ہے۔" وہ بولا۔ "اور تیری باتوں سے میں نے سمجھ لیا ہے کہ وہ بھی تجھ سے کتنی محبّت کرتی ہے۔ ایک بار جب وہ تجھ سے ملنے آئی تھی تو میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ دوسری قسم کی عورت ہے۔"

"تو نے کیسے پہچانا کہ وہ دوسری قسم کی عورت ہے اور یہ دوسری قسم ہوتی کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"دوسری قسم کی عورت محبّت میں جان دینا جانتی ہے۔" وہ بولا۔ "اپنی ساری خوشیاں بانٹ دیتی ہے۔ اپنے شوہر میں، اپنے بچّوں میں اور گھر میں۔ پہلی قسم کی عورت تو نے بھی دیکھی ہے، علی بھائی نے بھی اور میں نے بھی۔ کیا نور افشاں ان سب سے الگ نہیں ہے؟ اپنے دل سے پوچھ۔ کسی سے بھی پوچھ لے۔"

وہ رات اتنی مختصر تھی کہ باتیں ختم ہونے سے پہلے ختم ہو گئی۔ اب میرے دل پر ایک پُر امید خوف غالب تھا۔ کیا میں سب کی آنکھوں میں دُھول جھونک کے نکل سکوں گا؟ کیا وہ مجھے شناخت نہیں کریں گے؟ اگر میرا راز فاش ہو گیا تو میری فردِ جرم میں ایک اور جرم لکھ دیا جائے گا۔ اب تک میں نے جو شرافت کا تاثر قائم کیا ہے وہ ختم ہو جائے گا اور علی بھائی میرا مددگار نہیں، میرا شریکِ جرم تصوّر ہو گا۔

میں اب ارشد محمود نہیں چھٹّی پانے والا اور سرطان کا مریض علی بھائی تھا۔ نمبر تین سو تیرہ۔ حاضری کے وقت مجھے سب کے ساتھ صف بستہ ضرور ہونا پڑتا لیکن اس کے بعد دوسرے مشقّتی ٹولیوں کی شکل میں یا اکیلے اکیلے روانہ ہو گئے لیکن میں واپس آ کے کوٹھری میں بیٹھ گیا۔ کچھ قیدیوں نے مجھ سے آخری ملاقات بھی کی اور... خاصے رنجیدہ نظر آئے۔ انھوں نے کہا سنا معاف کرنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ اللہ اپنا فضل کرے گا۔ ان میں سے کسی کو میں پہچانتا نہیں تھا لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ بھی اسے وارڈ کی طرح

ملنے جلنے لوگ ہوں گے۔ چور اور جیب کترے، ڈاکو اور قاتل، اخلاقی جرائم میں ملوث افراد۔ پولیس کی یا دشمنوں کی انتقامی کارروائی کا نشانہ بننے والے اور کچھ میری طرح گردشِ حالات کا شکار ہو کے وہاں پہنچنے والے۔ ایک قیدی جو اسی کام پر مامور تھا بطورِ خاص میرے لیے ناشتا لے کر آیا اور اس نے میرے ساتھ بیٹھ کے چائے پی۔ ایسی چائے قیدیوں کو کبھی نہیں ملتی تھی چنانچہ میں سمجھ گیا کہ یہ خصوصی رعایت صرف علی بھائی کو حاصل تھی۔

بالآخر جیلر نے مجھے طلب کیا۔ میں دھڑکتے دل اور کانپتے قدموں کے ساتھ اس کے آفس میں پہنچا اور سر جھکا کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے صورت سے بیمار اور شکستہ حال نظر آنے کی پوری کوشش کی۔

"نمبر تین... علی بھائی!" جیلر نے نرمی سے کہا۔ "کیا میں تم کو مبارک باد دوں؟"

"مرضی ہے آپ کی سر۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "آزادی کتنے دن کی ہے۔ ہمیں تو بس تیاری کرنی ہے۔"

"خدا پر بھروسا رکھو علی بھائی۔ اس سے شفا کی دعا مانگتے رہو۔" جیلر نے کہا۔ "وہ چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مُردے زندہ ہو جائیں اور... اور یہ تو تقدیر کا فیصلہ ہے... ڈاکٹر... کیا جانیں...؟"

وہ مجھے تسلی دینے کے لیے رسمی اخلاق سے کام لے رہا تھا اور خود بھی جانتا تھا کہ تقدیر کا فیصلہ اٹل ہے۔

"ہم نے کوشش کی تھی کہ تمہارے لیے کوئی مشکل پیدا نہ ہو۔" جیلر نے کہا۔ "جس حد تک ممکن تھا تمہیں رعایت ملی۔ لوگ تو ہمیں سنگدل، سفاک اور ظالم کہتے ہیں لیکن ہم کیا کریں۔ ہم جیل کے اندر آنے والوں کو آرام سے نہیں رکھ سکتے۔ سزا تو سزا ہی ہونی چاہیے تاکہ اس کا خوف باقی رہے۔ گھر کا سا سکون ملے تو نہ جانے کتنے بڑی خوشی سے اندر آ جائیں جن کا کوئی گھر ٹھکانا نہیں ہے، روٹی کپڑا تو مل ہی جائے گا۔ بعض اوقات بے گناہ بھی اندر آ جاتے ہیں لیکن ہمارا کام یہ دیکھنا ہے کہ کس کے ساتھ انصاف ہوا اور کس کے ساتھ نہیں ہوا۔ باہر ایک سے ایک بڑی عدالت موجود ہے۔ ہم صرف عدالت کے حکم کے مطابق سزا دیتے ہیں۔ جیل مینوئل کے مطابق۔ بے شک اس میں زیادتی بھی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ہم سزا میں کمی بھی کر دیتے ہیں اور نرمی بھی کر دیتے ہیں۔ جیسے کہ ہم نے تمہارے ساتھ کیا، کیونکہ ہم بھی انسان ہیں۔ ہمارا فرض ناخوشگوار ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ بالآخر ہمیں بھی مرنا ہے۔ ہمارے نامۂ اعمال میں بھی کوئی نیکی تو ہونی ہی چاہیے۔ ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو ہمیں معاف کر دینا۔ تم اب کہاں جاؤ گے؟"

"جس کا ٹھکانا کوئی نہ ہو وہ کہاں جاتا ہے سر؟" میں نے کہا۔ "آپ کی بہت مہربانی کہ آپ نے میرا خیال رکھا۔"

"اچھا خدا حافظ۔ اپنی چیزیں وصول کر لو۔ جو کچھ تمہارے پاس تھا اور وہ بھی جو نقد ملے گا۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"میرے لیے دعائے مغفرت کیجیے گا سر۔" میں نے مصافحہ کرنے کے بعد گلوگیر لہجے میں کہا اور اس نے فقط سر ہلایا۔ وہ بُرا آدمی نہیں تھا۔ بُرے لوگوں کے درمیان بُری جگہ پھنس گیا تھا۔

نمبر تین سو تیرہ کے بجائے علی بھائی بن کے میں نے آزاد انسانوں کی دنیا میں قدم رکھا تو مجھے دنیا بہت بدلی ہوئی لگی۔ صرف تین مہینے بعد مجھے یہ احساس ہوا تھا تو سات سال یا عمر قید کاٹ کے نکلنے والوں کو کیسا محسوس ہوتا ہوگا۔ اس کا تصور بھی میرے لیے محال تھا۔ اندر علی بھائی بیماری اور نقاہت کے باوجود میری جگہ کام کی نگرانی کر رہا ہوگا اور کرم داد اس کی مدد کے لیے ساتھ ساتھ ہوگا اور وہ دونوں دل ہی دل میں دعا مانگ رہے ہوں گے کہ میں پکڑا نہ جاؤں۔ میں نے انسانوں سے آباد سڑک پر پیدل چلنا شروع کیا۔ جیسے جیسے جیل کی فصیل دور ہوتی گئی میرا حوصلہ جوان ہونے لگا۔ میں نے اپنی قسم پوری کر دی تھی۔ خدا نے مجھے اسباب فراہم کر دیے تھے کہ اپنے وعدے کو سچ کر دکھاؤں اور اب میرے سامنے وہی دنیا تھی جس نے کسی اور کے جرم کی پاداش میں مجھ کو جیل بھجوا دیا تھا۔ پہلے میں اس کو بدقسمتی سمجھتا تھا لیکن اب ثابت ہو گیا تھا کہ وہ ایک سازش تھی۔

مجھے چھ ماہ پہلے کا وہ وقت یاد آیا جب میں ایک وقتی ناکامی سے دل گرفتہ ایک باغ میں اکیلا ٹہل رہا تھا۔ اچانک میں نے کسی کو چیخنے سنا۔ چونک کر پیچھے دیکھنے پر مجھے ایک لڑکی نظر آئی جو گرتی پڑتی میری طرف بھاگی چلی آ رہی تھی۔ "بچاؤ... خدا کے لیے بچاؤ۔" وہ ہاتھ ہلا ہلا کے چیخ رہی تھی۔ مجھے اس کے تعاقب میں تین سائے سے نظر آئے۔ رات کا اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ میں کسی کی صورت نہ دیکھ سکا۔

"کون ہے؟" میں نے زوردار آواز میں کہا اور خود بھی پلٹ کر آگے بڑھا۔ لڑکی ایک دم مجھ سے آ ٹکرائی لیکن اس کے پیچھے آنے والے تینوں افراد ٹھٹک کر رُکے اور تیزی سے واپس ہو کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ "یہ کیا چکر ہے؟ کون ہو تم؟" میں نے لڑکی کو سیدھا کھڑا کر کے کہا۔ "یہ کون لوگ تھے؟"

"میں... میں نہیں جانتی۔" وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان دہشت زدہ لہجے میں بولی۔ "بدمعاش تھے۔ مجھے اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ اگر آپ نہ ملتے..."

"اس کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اتنی رات گئے تم اکیلی یہاں کیا کر رہی تھیں؟" میں نے کہا۔

"میں ایک پارٹی سے واپس آ رہی تھی۔" وہ اپنا لباس درست کرتے ہوئے بولی جو بے حد شوخ اور فیشن ایبل تھا۔ اس کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو اب میرے وجود میں بھی بس گئی تھی۔

"پیدل؟ کوئی تمہارے ساتھ نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے ٹیکسی لادی تھی، میری سہیلی کے شوہر نے۔" وہ بولی۔ "ان کے بچے کی سالگرہ تھی لیکن ٹیکسی راستے میں خراب ہو گئی۔ میں کیا کرتی۔ سوچا تھوڑا سا فاصلہ ہے، پیدل ہی طے کر لوں گی۔"

"چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔" میں نے کہا اور مختصر سی باڑھ عبور کر کے سڑک پر آ گیا جہاں میری کار کھڑی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ آگے بیٹھ گئی۔ اس کا خوف بہت جلد ختم ہو گیا تھا اور وہ بہت پُراعتماد نظر آنے لگی تھی۔ کار کا دروازہ کھلا تو ذرا سی دیر کے لیے لائٹ جلی اور میں نے اس کا میک اپ دیکھا جو ضرورت سے زیادہ شوخ تھا لیکن وہ پارٹی سے لوٹ رہی تھی اس لیے میں نے زیادہ قابلِ غور نہیں سمجھا۔ اس کا گھر قریب ہرگز نہیں تھا جیسا کہ اس نے کہا تھا۔ وہ اس جگہ سے تقریباً دو میل دور ایک فلیٹ میں رہتی تھی۔ میں نے کار روک کے اس کے اترنے کا انتظار کیا۔

"آپ... آپ نے بڑی تکلیف کی۔" وہ بولی۔ "تھوڑی سی مدد اور کریں۔ مجھے اوپر تک چھوڑ آئیں۔ کہیں وہ بدمعاش مجھ سے پہلے نہ پہنچ چکے ہوں۔"

"مگر... تم نے تو کہا تھا کہ تم ان کو نہیں جانتی تھیں!" میں نے اتر کے کار کو لاک کرتے ہوئے کہا۔ لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے فرض کر لیا کہ محض اس کے دل میں بیٹھا ہوا خوف ہے جس کے باعث وہ دروازے تک کسی کا ساتھ چاہتی تھی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تین اجنبی بدمعاش اتنے کم وقت میں ہم سے پہلے پہنچ جائیں۔ انھیں کیا معلوم کہ لڑکی کہاں رہتی ہے؟ وہ پیدل تھے اور ہم کار میں آئے تھے اور میں نے اپنے تعاقب میں کوئی کار نہیں دیکھی تھی۔ لڑکی ٹاپ فلور کے آخری کارنر فلیٹ میں رہتی تھی۔ جب اس نے بیگ میں سے چابیاں نکالیں تو میں مزید حیران ہوا۔

"آپ اکیلی رہتی ہیں یہاں؟" میں نے کہا۔

"جی۔ اس میں کوئی معیوب بات ہے کیا؟" وہ بولی۔

"نہیں۔ مگر معیوب سمجھنے والے بہت ہیں۔ اگرچہ میں ان میں شامل نہیں۔" میں نے کہا۔ "آزادی سے شریفانہ زندگی گزارنے کا حق سب کو حاصل ہے لیکن ہمارا معاشرہ ابھی اس کا عادی نہیں ہوا کہ عورت بھی اکیلی رہ سکے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ اندر آئیے آپ ایک منٹ کے لیے۔" وہ بولی۔ "پلیز۔ ایک کپ چائے ضرور پی کر جائیں۔ میں آپ کے احسان کا بدلہ تو نہیں چکا سکتی مگر۔ آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گی۔"

اس نے اندر کی لائٹ جلائی۔ میں ہنوز تذبذب کا شکار تھا کہ اس نے ہاتھ پکڑ کے مجھے کھینچ لیا۔ میں مجبور ہو گیا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا ایک کمرے میں جا بیٹھا۔ جو مختصر سا ڈرائنگ روم بھی تھا اور بیڈ روم بھی۔ اس میں ایک ڈبل بیڈ کے علاوہ دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ بھی لگا ہوا تھا۔ فرش پر قالین بھی کمرے کے فرنیچر کی طرح قیمتی تھا۔ مجھے ثروت کا خیال تھا جس سے میری شادی کو دو ہی مہینے ہوئے تھے۔ وہ کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میں اکیلی اور جوان عورت کے ساتھ اس فلیٹ میں تنہا ہوں اور اس عورت کے نام تک سے واقف نہیں۔

"آپ کرتی کیا ہیں اور اکیلی کیوں ہیں؟" میں نے کہا اور کچن کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

"دنیا میں بہت سے لوگ اکیلے ہیں۔" وہ بولی۔ "اکیلے رہ جاتے ہیں۔ میرے والدین تو بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ رشتے داروں نے پرورش کی۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ ہر جگہ میں منحوس کہلاتی اور مصیبت سمجھی جاتی تھی۔ مجبوری کے تحت تو میں نے وقت کاٹ لیا مگر موقع ملتے ہی سب کو چھوڑ دیا۔ اب ملازمت کرتی ہوں۔ ایک فرم میں ٹائپسٹ ہوں۔ آپ جیسے نیک لوگ بھی ہیں وہاں اور بدنیت بھی کم نہیں۔ یہی حال محلّے کا ہے۔ میرا مطلب ہے آس پاس دوسرے فلیٹوں میں رہنے والوں کا۔ بہت باتیں بناتے ہیں اور میرے خلاف بے بنیاد درخواستیں دیتے رہتے ہیں۔ ابھی تک تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔ کرائے کا فلیٹ ہوتا تو نکلوا دیتے لیکن فلیٹ میرا اپنا ہے۔"

ایک اسٹینو ٹائپسٹ اتنی قلیل آمدنی میں اتنے ٹھاٹھ سے کیسے رہتی ہے اور اس نے یہ ڈیڑھ لاکھ کا فلیٹ... کیسے خرید لیا؟ یہ تفصیلات جاننے کی میں نے کوشش نہیں کی۔ مجھے اب گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟" میں نے کہا۔

"آپ نے کر لی ہے شادی؟" اس نے سوال کے جواب میں سوال کر دیا۔ اب اس کے انداز میں اعتماد ہی نہیں شوخی اور بیباکی بھی آ گئی تھی۔ اپنی پارسائی کے تمام دعووں کے

باوجود وہ مجھے پارسا نہیں لگی۔ اس کے لباس، میک اپ اور عادات و اطوار میں کوئی بات ایسی تھی جو بازاری تھی۔ اکیلی رہنے والی ملازمت پیشہ لڑکی ہے اور خود مختار ہے۔ میں نے طے کیا۔ جو چاہے کرے۔ زبانِ خلق سچ کہتی ہے یا یہ لڑکی، اس کا فیصلہ نہ میں کر سکتا ہوں نہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔

"میں نے شادی کر لی ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ نے زبردستی کی، یہ چائے کا وقت نہیں تھا۔ میری بیوی کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"آپ چل کے اندر بیٹھیں۔ میں ایک منٹ میں چائے لا رہی ہوں۔" وہ بولی۔

جب میں چائے پی رہا تھا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کا نام شیریں ہے اور مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں اسے اپنی بیوی سے ملواؤں، اسے لے کر آؤں۔ اس نے ایک نوجوان کا ذکر بھی کیا جس کو وہ پسند کرتی تھی اور میرے علاوہ دوسرے لوگ بھی یہ مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ اس کے مسائل کا حل شادی ہے۔ میں چپ چاپ سنتا رہا۔ نہ مجھے اس سے پھر ملنے کی ضرورت تھی نہ اس کے حالات جاننے کی۔ چائے ختم کرتے ہی میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کے ساتھ آنے پر ندامت ہو رہی تھی۔ اگر ثروت کو یہ بات معلوم ہو جائے تو اعتماد کے آئینے میں بال ضرور آئے گا۔ وہ میری کہانی پر یقین کرے یا نہ کرے۔ اور یہ سمجھے یا نہ سمجھے کہ میں نے فقط ایک مصیبت زدہ لڑکی کی مدد کی تھی۔ مجھے دروازے سے ہی لوٹ جانا چاہیے تھا۔ یہ میری چھٹی حس تھی جو مجھے اپنی غلطی کا احساس دلا رہی تھی یا میں نروس تھا۔ چائے کا ذائقہ مجھے عجیب سا لگا اور پسند نہیں آیا لیکن اخلاقاً میں نے چائے ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

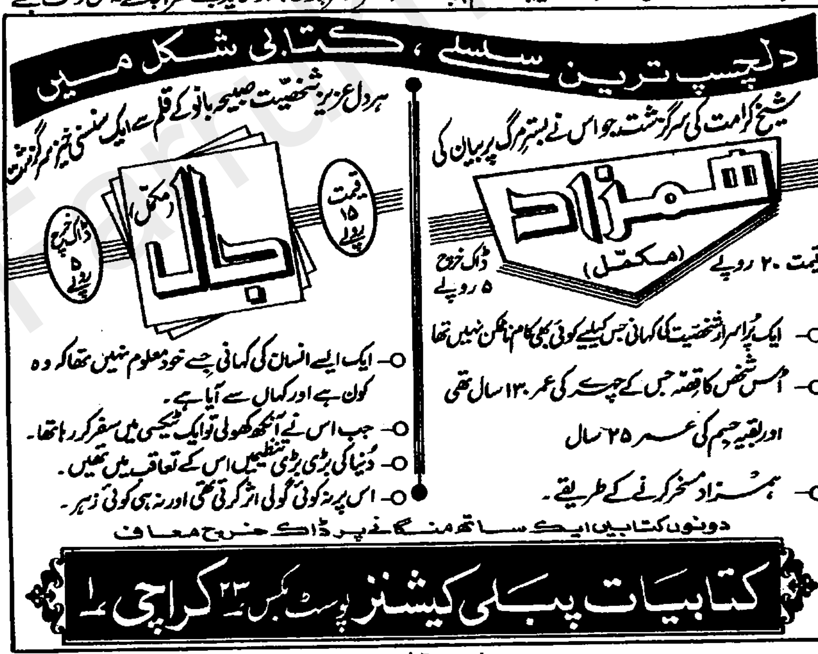
"اب مجھے اجازت دیں۔" میں نے کہا۔ "پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"چابی کہاں گئی؟" اس نے دروازے تک پہنچنے کے بعد کہا۔

"آپ نے دروازہ اندر سے مقفّل کر دیا تھا؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "کیوں؟"

"عادت ہے میری۔" وہ بولی۔ "اکیلی رہتی ہوں نا اس لیے۔"

"خیر دیکھیے چابی کہاں رکھی ہے آپ نے۔" میں نے قائل ہو کے کہا اور اسے بیگ میں ہاتھ مارتے دیکھتا رہا۔ وہ لوٹ کر کمرے میں گئی اور میں اس کے ساتھ گیا کہ چابی ادھر اُدھر پڑی ہو تو شاید مجھے نظر آجائے۔ اسی وقت مجھے



چکر سا آیا۔ کمرے کی لائٹ پل بھر کے لیے اندھیرے میں ڈھل گئی اور میں نے گرنے سے بچنے کے لیے دیوار کا سہارا لینا چاہا تو مجھے دیوار متحرک لگی۔ فرش بھی میرے قدموں کے نیچے یوں ہل رہا تھا جیسے زلزلہ آرہا ہو۔

جب مجھے ہوش آیا تو آہستہ آہستہ مجھ پر ایک بھیانک خواب کی کیفیت گزرنے لگی۔ میں نے یوں دیکھا جیسے فرش پر وہی لڑکی خاک و خون میں غلطاں پڑی ہے جس نے مجھے اپنا نام شیریں بتایا تھا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور آنکھیں بند کر کے پھر کھولیں۔ منظر اب بھی وہی تھا۔ وہ لڑکی جو رنگِ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام تھی، گوشت اور خون کے ایک کریہہ اور بدنما ڈھیر کی صورت میں قالین پر پڑی تھی۔

پھر میری نگاہ اپنی حالت پر گئی اور میں شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ بے اختیار میرے ہاتھ اپنے کپڑوں کی طرف گئے جو صوفے پر بکھرے پڑے تھے۔ میری کلائی کی گھڑی میں صبح کے سات بج رہے تھے اور تاریخ بدل چکی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ میں کم سے کم گیارہ گھنٹے بے ہوش پڑا رہا تھا۔ باہر سے متعدد افراد کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک باوردی کانسٹبل نے اندر جھانکا۔

"سر جی! ملزم ہوش میں آگیا ہے۔" اس نے بے حد مسرت سے یہ سنسنی خیز اطلاع نشر کی اور سر جی فوراً اندر آگئے۔ وہ روایتی تھانیدار تھے۔ بھاری بھرکم، پُرہیبت چہرے، خوفناک مونچھوں اور قابلِ فخر توند والے۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی اور اس کی وردی پر پلاسٹک کی جو نیلی سی پٹی لگی ہوئی تھی، اس پر 'حاکم خان' لکھا ہوا تھا۔ مجھ سے کوئی بات کیے بغیر وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"یہ... اسے — میرا مطلب ہے شیریں کو کس نے قتل کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"تمہارے باپ نے۔" وہ فائل میں کچھ لکھتے ہوئے بولا۔ "تم کو کس... نے کہا کہ اس کا نام شیریں ہے؟"

"خود اسی نے بتایا تھا۔" میں نے گھومتے ہوئے سر کو تھام کر کہا۔ "کیا مجھے ایک کپ چائے یا کافی مل سکتی ہے۔ جس سے میرے یہ چکر ختم ہو جائیں۔"

"چکر تو اب شروع ہوئے ہیں بھیّا!" وہ بولا۔ "ابھی حوالات میں سب ملے گا۔ کافی آملیٹ اور سینڈوچ۔ سارے چکر دور ہو جائیں گے۔"

"تم سمجھ رہے ہو اس کو میں نے قتل کیا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"نہیں۔ اسے میں نے قتل کیا ہے۔" وہ بولا۔ "پھانسی تمہیں ہوگی۔"

"خدا کا خوف کرو۔ میں ایک انجینئر ہوں اور شریف آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔ "شادی شدہ ہوں۔"

"کیا شادی شدہ لوگ اس طرح سے رنگ رلیاں نہیں مناتے؟" وہ بولا۔ "انجینئر قتل نہیں کرتے بھیّا؟"

"لیکن میں نے تو شیریں کی مدد کی تھی۔ اسے غنڈوں سے بچایا تھا۔" میں نے احتجاج کیا۔

"اس کا نام شیریں نہیں حسنہ ہے۔" تھانیدار نے مجھے ایک کڑک دار گالی دی۔ "ہیرو کی اولاد۔ کون سے بدمعاش تھے وہ؟ نام تو بتاؤ ذرا — اور کوئی گواہ ہے؟"

"گواہ تو کوئی نہیں لیکن میں قسم کھا کے کہتا ہوں..."

پھر میری نگاہ فرش پر گئی۔ لاش کے قریب ایک ڈبا رکھا تھا جس پر لکھے ہوئے حروف بہت واضح تھے۔ اس پر انگریزی میں 'زہر' لکھا گیا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ "یہ دیکھیں، یہ ہے ثبوت۔ غالباً مجھے یہی دیا گیا تھا چائے میں۔" میں نیچے گرا اور پھر اٹھا ہی تھا کہ تھانیدار کے جھانپڑ نے مجھے پھر بستر پر لٹا دیا۔ اسی وقت کمرے میں کچھ اور لوگ آگئے۔ انھوں نے لاش پر چادر ڈالنے سے پہلے اس کے گرد چاک بکھیر کر نشان سا بنایا۔ ایک شخص غالباً فنگر پرنٹ لینے کی کارروائی میں مصروف تھا۔

"اسے ڈالو ہتھکڑی اور تھانے لے چلو۔" انسپکٹر حاکم خان نے کہا اور واک آؤٹ کر گیا۔ اس کے احکامات کی تعمیل دو پولیس والوں نے کرنی چاہی مگر میں نے ان کا مقابلہ کیا۔

"تم میری بات سنے بغیر مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔ "میں قاتل نہیں ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔" دروازے میں ایک سب انسپکٹر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

"جو کہنا ہے تھانے چل کر کہنا۔ میں گولی مار دوں گا اگر تم نے مزاحمت کی۔"

ہر فلیٹ سے جھانکنے والے دہشت زدہ تماشائیوں سے نظریں چرا کے میں نیچے تک پہنچا۔

"دیکھو، یہ میری کار ہے۔ میں ایک معزز آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔

"کار تھانے لے آؤ۔" سب انسپکٹر نے چابیاں ایک نائک کی طرف اچھال دیں۔ "ذرا خیال سے۔"

تھانے میں میرا پہلا باضابطہ بیان لیا گیا۔ "یہ لڑکی کل رات مجھے ایک پارک میں ملی تھی۔"

Farrukh Malik

"یہ سب لوگوں سے پارکوں اور ہوٹلوں میں ہی ملتی تھی۔" انسپکٹر حاکم خان نے لکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ بدمعاش اس کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ اس کی چیخ و پکار پر میں نے مداخلت کی۔ یہ مدد کے لیے پکارتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"اس قسم کی لڑکیوں کو اغوا کون کرتا ہے احمق آدمی!" حاکم خان مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔

"اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک دفتر میں ٹائپسٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "جب وہ بدمعاش بھاگ گئے...۔"

"واہ بھئی ٹارزن۔ شکل دیکھتے ہی بھاگ گئے تھے یا مار کھا کے بھاگے تھے؟" وہ طنز سے بولا۔

"نہ انھوں نے میری شکل دیکھی تھی، نہ میں نے ان کی۔" میں نے کہا۔ "اندھیرا بہت زیادہ تھا۔"

"اور تم اندھیرے میں چھپ کر حُسنہ کا انتظار کر رہے تھے۔ کب سے جانتے ہو اسے؟" وہ بولا۔

"میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زندگی میں ایسے کام نہیں کیے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ تھانیدار کو میرا لہجہ سخت ناگوار گزرا۔ اس نے مجھے تمیز سے بات کرنے کا حکم دیا۔ پندرہ منٹ بعد مجھے پھر اس کے سامنے پیش کیا گیا تو تمیز سے کیا، میں بات کرنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔

"ہاں تو اندھیرے میں کیا کر رہے تھے تم، شادی شدہ شریف انجنیئر صاحب؟" حاکم خان بولا۔

"میں ذرا پریشان تھا۔ ایک کاروباری مسئلے کی وجہ سے۔" میں نے کہا۔

"کاروباری مسائل کی وجہ سے تو آدھا شہر پریشان ہے۔ وہ سب وہاں کیوں نہیں ٹہل رہے تھے؟" وہ بولا۔

"آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن میری بات سن لیں۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "بے شک یہ مدد کے لیے چلا رہی تھی اور اس کے پیچھے کچھ لوگ بھی تھے لیکن میرا خیال ہے وہ بھی شریک... میرا مطلب ہے حُسنہ کے ساتھی تھے اور وہ سب ڈراما تھا جس کا مقصد مجھے یہاں لانا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے میرے فلیٹ پر چھوڑ دو اور میں انکار نہ کر سکا۔ میں وہیں سے لوٹ جانا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے ایک کپ چائے پینے پر مجبور کر دیا اور میں نے اخلاقاً وہ چائے پی لی۔ مجھے اس کا ذائقہ عجیب سا لگا تھا۔ اس میں یقیناً کچھ ڈالا گیا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا تھا۔"

"چائے پیتے ہی؟ اتنی جلدی اثر ہو گیا تھا زہر کا؟"

"نہیں۔ مجھے روک کے رکھنے کے لیے اس نے دروازے کو اندر سے قفل لگا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ اکیلی رہتی ہے اور اسے عادت پڑ گئی ہے قفل لگانے کی۔ پھر دروازے کی چابی نہیں ملی۔ اس نے ظاہر کیا کہ وہ کہیں رکھ کے بھول گئی ہے لیکن اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ جتنی دیر میں زہر کا اثر ہو، میں باہر نہ جاؤں۔ میں نے چائے دو منٹ میں ختم کر لی تھی کیونکہ مجھے واپس پہنچنے کی جلدی تھی۔ میری بیوی کھانے پر میرا انتظار کرتی ہے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس لطف و عنایت کے بعد زیادہ دیر ٹھہرتا۔ ممکن ہے رات بھر ٹھہرنے کی سوچتا پھر اسے چابی گم کرنے کا ڈراما نہ کرنا پڑتا۔"

"تمھاری بات سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی نے تمھارے خلاف سازش کی۔" حاکم خان نے کہا۔ "کیوں، تم سے دشمنی تھی اس عورت کی؟"

"یہ عورت تو ایک وسیلہ بنی۔" میں نے کہا۔ "سازش کرنے والے دوسرے تھے۔ کاروبار میں آدمی کے دوست کم ہوتے ہیں، دشمن زیادہ۔ میں کسی ایک کا نام نہیں لے سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ اصل مقصد حُسنہ کو قتل کرنا تھا اور وہ کسی کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتے تھے۔ ان کی اسکیم یہ تھی کہ حسنہ اپنے قاتل کو خود اپنے ساتھ لائے۔ فرار ہونے والے تین تھے اور جب وہ ایک گارڈن لائٹ کے پاس سے گزرے تھے تو میں نے صرف ایک کی صورت کی جھلک دیکھی تھی۔ اس کی ناک طوطے جیسی تھی اور وہ بھاگتے ہوئے لنگڑاتا تھا۔ باقی دو اندھیرے میں نکل گئے تھے۔ مجھے کچھ یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ بیہوش ہونے سے پہلے وہی شخص دروازہ کھول کے اندر آیا تھا اور اس نے کچھ کہا تھا۔ معلوم نہیں کیا۔"

"فلیٹ میں آنے جانے کے لیے ایک ہی گیٹ ہے۔" حاکم خان بولا۔ "وہاں رات کا چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ جب تم اس بدکردار عورت کے ساتھ آئے تھے، اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں تقریباً آٹھ بجے آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"چوکیدار کو تمھارے خلاف غلط بیان دینے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا وہ بھی تمھارا دشمن ہے؟" حاکم خان بولا۔ "اس نے کہا ہے کہ گیارہ بجے کے بعد نہ کوئی آیا، نہ گیا۔ فلیٹ میں اگر کوئی آتا تو اس کے سامنے سے گزر کے آتا۔"

"ہو سکتا ہے کوئی فلیٹ میں پہلے سے موجود ہو۔" میں نے کہا۔ "دوسرے کمرے میں۔"

"اس فلیٹ میں کوئی طوطے جیسی ناک والا لنگڑا نہیں

رہتا۔" حاکم خان بولا "حسنہ اکیلی رہتی تھی۔ اگر وہ اندر گیا تھا تو کہاں گیا؟"

"میں نہیں جانتا۔" میں نے چلا کر کہا۔ "میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ میں نے حسنہ کو قتل نہیں کیا۔ ۔ ۔"

اچانک میری نظر میز پر گئی اور میں نے اسی ڈبے کو دیکھا جو حسنہ کے کمرے میں تھا۔ "یہ زہر۔ ۔ ۔"

"اس میں زہر نہیں ہے، چینی ہے۔" حاکم خان نے کہا۔ "یہ لیبارٹری بھیجا جائے گا۔"

میں نے ہر مقدمے اور ہر عدالت میں ہر پیشی پر یہی کہا کہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور اپنی اسی بات پر قائم رہا جو سو فیصد حقیقت پر مبنی تھی لیکن میرے پاس سچ کو ثابت کرنے کی صورت کوئی نہ تھی۔ میرے خلاف گواہ بھی بہت تھے اور ثبوت بھی۔ چوکیدار نے پیسے لے کر جھوٹ بولا تھا۔ دو عورتوں نے بھی مجھے نام لے کر پہچانا اور کہا کہ میرے ان سے پرانے مراسم تھے لیکن شادی کے بعد مجھ سے ملاقات نہ رہی تھی۔ میں ان دونوں عورتوں کو نہیں جانتا تھا مگر پولیس نے مجھے بتایا اور عدالت کو آگاہ کیا کہ وہ بدنام عورتیں ہیں۔ انھی عورتوں نے یہ بھی کہا کہ میں شراب پیتا تھا اور انھیں معلوم نہیں کہ میں شراب کہاں سے لاتا تھا لیکن پینے کے بعد میں ان سے جھگڑتا تھا۔ ایک نے تو یہ بھی کہا کہ میں نے اسے نشے میں مارا تھا۔ دو کانسٹبل گواہ بنے کہ انھوں نے مجھے آوارہ گردی میں پکڑا تھا لیکن انجینئر سمجھ کے چھوڑ دیا تھا اور نشے کی حالت میں گھر چھوڑ آئے تھے۔ میں کس کس کو جھٹلاتا اور کسے دشمن قرار دیتا۔ کیا کہتا کہ میرے خلاف اس سازش کا مقصد کیا ہے جس کے نتائج میں نے بھگتے۔ میرا گھر تباہ ہوگیا۔ ثروت نے بدگمان ہو کے مجھے چھوڑ دیا اور میں سات سال کے لیے جیل گیا۔ نہ جانے کون سی نیکی میرے کام آئی کہ مجھے سزائے موت نہیں ہوئی۔ ورنہ آج صرف تین ماہ بعد میں پھر زندہ انسانوں کی دنیا میں کیسے پہنچتا۔ تین ماہ میں تو قبر کے اندر صرف میرا ڈھانچہ بچا ہوتا۔

اب میں لوٹ کر اپنے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اب انجینئر ارشد محمود نہیں تھا، علی بھائی تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھ میں اپنے ماضی سے نظر ملانے کا حوصلہ نہ تھا جو ابھی تک اس گھر کے حصار میں قید تھا۔ چابی میرے بھائی کے پاس تھی لیکن علی بھائی بننے کے بعد میں اپنے بھائی کا بھائی بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے بہت سوچا اور پھر فیصلہ کیا کہ باہر نکلنے کے بعد مجھے تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ کون جانے آزادی کی یہ فرصت کب ختم ہو جائے اور میں پھر پکڑ لیا جاؤں۔ اس سے پہلے مجھے اپنا کام ختم کرنا ہوگا۔ میرے ذہن میں ایک نام اور ایک پتا تھا۔ یہ منزل کا پہلا نشان تھا جس سے منزل کا سراغ ملتا تھا۔ میں نے نور افشاں سے ملنے کا فیصلہ التوا میں رکھا اور ایک بس میں بیٹھ گیا۔

❖

میری توقع کے مطابق مسز ڈی سلوا نے مجھے نہیں پہچانا۔ اس کے لیے میں صرف ایک نام تھا۔ نمبر نو سو گیارہ تھا یا پچاس ہزار روپے کا نوٹ تھا۔ وہ یوسف پلازا میں رہتی تھی جس میں دو کمروں والے سیکڑوں فلیٹ تھے اور کراچی جیسے شہر کے اندر یہ خود ایک شہر تھا جس کے مکین بدلتے رہتے تھے۔ اس میں رہنے والوں کے پاس گاڑیاں بھی تھیں مگر وہ غریب شمار ہوتے تھے۔ غریب نہ ہوتے تو کم سے کم گلشن اقبال میں دو سو چالیس گز کی کوٹھی لے کر رہتے ورنہ ڈیفنس میں ہوتے۔ میں نے ملاقات کے لیے بہت مناسب وقت کا انتخاب کیا تھا۔ بیشتر مرد نوکری پر یا دکانوں پر گئے ہوئے تھے۔ بچے اسکولوں اور کالجوں میں تھے اور گھروں کے اندر خواتین روزمرہ کے کام نمٹا رہی تھیں۔

"کون ہے تم ینگ مین؟" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولی لیکن اس نے دروازہ پورا نہیں کھولا۔

"میں۔ ۔ ۔ مجھے ڈی سلوا نے بھیجا ہے۔" میں نے کہا۔ "جیل سے۔"

اس کی آنکھوں میں شکوک کے سائے نمودار ہوئے اور میں نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کیا کہ میں نے دیر کی تو دروازہ بند ہو جائے گا اور پھر یہ ناممکن ہوگا کہ میں اندر داخل ہو سکوں۔ میں نے ایک دھکا دیا اور مسز ڈی سلوا جھٹکے سے پیچھے ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ چیخ مار کے لوگوں کو متوجہ کرتی، میں اس کا منہ دبا چکا تھا۔ لات پیچھے کی طرف مار کے میں نے دروازے کو بند کیا اور تڑپتی مچلتی مسز ڈی سلوا کو گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ اندر اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے اسے باورچی خانے میں لے جا کر دیوار سے لگا دیا اور ادھر ادھر دیکھ کر سبزی کاٹنے والی چھری اٹھالی۔ اس کی دھار نئی تھی اور اتنی تیز تھی کہ بآسانی دبلی پتلی اور عمر سے زیادہ ضعیف نظر آنے والی مسز ڈی سلوا کا گلا کاٹ سکتی تھی۔

"مجھے غور سے دیکھو مسز ڈی سلوا۔" میں نے کہا۔ "میں موت کا فرشتہ ہوں۔ اگر میں ایک لاش ہوتا تو میری قیمت تمھیں پچاس ہزار روپے ملتی لیکن معاملہ الٹا ہوگیا ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمھاری یا ڈی سلوا کی لاش کے کوئی کتنے پیسے

Farrukh Malik

دے گا۔ شاید پانچ روپے بھی نہیں۔ ہر لاش کی قیمت نہیں ملتی۔ خصوصاً ان سے جو لاشوں کے سوداگر ہوں۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی۔ میں نے چھری کو اس کے گلے پر رکھا اور وہ ہاتھ ہٹا لیا جو اس کے منہ پر تھا۔ "خیال رکھنا مسز ڈی سلوا کہ تمہارے حلق سے اونچی آواز نہ نکلے۔ ورنہ اس کے ساتھ ہی تمہاری جان بھی نکل جائے گی۔"

"تم... کیا... کیا چاہتے ہو... فار گاڈ سیک۔" وہ لرزتے ہوئے بولی۔

"گاڈ کو بیچ میں مت لاؤ۔ جو کام تم نے کیا تھا، وہ گاڈ کی خاطر نہیں کیا تھا۔" میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا بھرپور طمانچہ مارا۔ "تم نے اپنے شوہر کو پیغام دیا تھا کہ مجھے قتل کر دے۔ کیا گاڈ نے تم کو بولا تھا کہ یہ پیغام لے جاؤ۔ یا میرا قتل ہو جاتا تو کیا گاڈ تم کو پچاس ہزار روپے دیتا؟ اس سُور کے بچے کا نام بتاؤ جس نے تم سے یہ پیغام لے جانے کو کہا تھا۔ وہ مجھے کیوں مروانا چاہتا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم... بائی گاڈ۔" وہ دیوار کے ساتھ ساتھ کھسکتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی کیونکہ اس کی کانپتی ہوئی ٹانگیں اس کے وجود کا بوجھ سنبھالنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔

"میں نے بولا ہے گاڈ کا نام مت لو۔ اس کا نام بتاؤ جو مجھے قتل کرانا چاہتا تھا۔" میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چھری کو اس کی گردن پر تھوڑا سا دبایا۔ "یاد کرو وہ کون تھا اور یہ بھی یاد رکھو کہ جیسے اس وقت تمہاری زندگی میرے قبضے میں ہے، ایسے ہی تمہارے شوہر کی زندگی جیل کے اندر میرے دوستوں کے قبضے میں ہے۔ میرا اشارہ ملتے ہی وہ اس کو ٹھکانے لگا دیں گے اور لاش جب تمہیں ملے گی، اس کے ساتھ کوئی پچاس ہزار کا چیک نہیں ہوگا۔ صرف یہ پیغام ہوگا کہ قیدی نے خودکشی کر لی تھی۔ یا وہ حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ جیل والے ہر موت کو اسی طرح گاڈ کی مرضی بنا دیتے ہیں۔ خواہ کوئی ان کے تشدد سے ہلاک ہو جائے۔ کفن دفن کا خرچ تک تمہیں نہیں ملے گا۔"

"موتیوں والا بابا۔" وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان کے ساتھ بولی۔ "اس کا نام مجھے نہیں معلوم۔"

"اور یہ موتیوں والا بابا کہاں ملے گا؟" میں نے کہا۔

"لانڈھی۔ چھتیس بی — اس کے بعد جنگل سا ہے۔" وہ بولی۔ "وہاں معلوم کر لینا۔"

"میں معلوم کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ تم اپنی مرضی سے خاموش رہنا پسند کرو گی۔ یا میں تمہیں خاموش کر جاؤں ہمیشہ کے لیے۔ جب میں جیل سے نکل سکتا ہوں تو یہاں سے نکلنا کیا مشکل ہے۔ ایک قتل کا الزام تو مجھ پر ہے، ایک اور سہی۔"

میں نے چھری کو تھوڑا سا اور دبایا۔ اس کی کھال پر ایک سرخ لکیر نمودار ہوئی اور چھری کی دھار پر لہو کا ایک قطرہ آ گیا۔ اس نے ایک چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے پھر منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اپنا خون دیکھ کر اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ وہ میرے ہاتھ پر جھکی اور بے سدھ ہو گئی۔ خوف نے اس کو بے ہوش کر دیا تھا۔

میں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے ہاتھ پیر اچھی طرح باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا لیکن باورچی خانے کا دروازہ باہر سے بند نہیں کیا۔ پھر میں نے ایک قفل تلاش کیا اور فلیٹ کو باہر سے مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔ اب مجھے دو چار گھنٹے کی مہلت ملنے کی امید تھی۔ شاید مسز ڈی سلوا کا کوئی بیٹا ہوگا یا بیٹی ہوگی۔ وہ اسکول کالج سے واپس آئیں گے تو دروازے کو مقفل پا کے پہلے ماں کی واپسی کا انتظار کریں گے پھر تشویش میں مبتلا ہوں گے اور بالآخر لوگوں کی مدد سے تالا توڑ کر اندر چلے جائیں گے۔ کوئی نہ آیا تب بھی ہوش آنے پر مسز ڈی سلوا کسی نہ کسی طرح آزاد ہو جائے گی۔

جیل سے ملنے والی رقم اتنی تھی کہ میں رکشا لے کر لانڈھی جا سکتا تھا۔ پون گھنٹے کی مسافت طے کر کے میں نے رکشا والے کو بیس روپے دیے اور ہر طرف پھیلی ہوئی ویرانی کو دیکھا۔ خاموشی میں لوٹ کر جانے والے رکشا کی کرخت آواز دور ہوتے ہوتے ختم ہو گئی لیکن اس سڑک پر سے ایک ٹرک کے سوا کوئی نہ گزرا۔ بالآخر ایک شخص کوارٹروں کی جانب سے نمودار ہوا۔ وہ بوڑھا اور باریش آدمی تھا جس نے لنگی باندھ رکھی تھی اور کندھے پر چار خانے والا رومال ڈال رکھا تھا۔ غالباً وہ ظہر کی نماز ادا کرنے کی نیت سے نکلا تھا۔ میری آواز پر وہ رکا۔

"جناب! میں موتیوں والے بابا کا ڈیرا تلاش کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ارے میاں، پہاڑ کے دامن میں کھڑے پوچھتے ہو، پہاڑ کہاں ہے؟" وہ بولا۔ "وہ دیکھو اُدھر۔"

میں نے اس کے ہاتھ کی انگلی کے اشارے کو دیکھا تو مجھے ایک درخت پر سبز رنگ کا تکونا پرچم سا لہراتا نظر آیا جس کے کناروں پر سفید گوٹا چمک رہا تھا۔ میں نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزر کر جھنڈے کو نظر میں رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ دس منٹ سے بھی کم وقت میں ڈیرا میرے سامنے آ گیا۔ یہ ایک کچا کمرہ تھا

جس پر ایسبیسٹاس کی شیٹوں کی چھت تھی۔ باہر دو مخبوط الحواس قسم کے مریل افراد گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ جوان آدمی تھا لیکن نشہ اس کی جوانی کو کھا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ اس کی داڑھی کے بالوں میں گھاس پھونس نظر آرہا تھا اور لمبے لمبے بالوں کی بے ترتیبی سے جھاڑ جھنکاڑ کا خیال آتا تھا۔ وہ گیروے رنگ کے چغے میں ملبوس تھا۔ اس کے ساتھی کا حلیہ بھی مختلف نہ تھا لیکن وہ شلوار قمیص میں تھا اور اس کی داڑھی نہیں تھی۔

"موتیوں والے بابا کا ڈیرا یہی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"سچے موتیوں والی سرکار کا آستانۂ عالیہ یہی ہے۔" گیروے چغے والے نے جھوم کر، گنگنا کے اور نیم غنودگی کی کیفیت میں کہا اور بالواسطہ طور پر مجھے سمجھایا کہ مجھے ادب سے نام لینا چاہیے۔

"سائل کو آنے دے کبوتر۔" اندر سے ایک آواز آئی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ آواز اصل نہیں۔ بے شک آواز بہت صاف تھی لیکن کسی حد تک غیر قدرتی لگتی تھی۔ نہ جانے میری آواز اندر کیسے پہنچی تھی؟

"جا، تیرا نصیب اچھا ہے۔ موتیوں والی سچی سرکار نے سوال کرنے سے پہلے مقدر کے در کھول دیے ہیں۔" گیروے چغے والا بولا اور "حق" کا نعرہ لگا کے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ میں نے دوسرے شخص کو دیکھا۔ وہ بھی اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ معلوم نہیں موتیوں والے بابا نے اسے کیا نام دے رکھا تھا۔ ایک کبوتر تھا تو دوسرا بگلا بھگت یا فاختہ کی دم۔ میں کھلے دروازے کا پردہ ہٹا کے اندر داخل ہوا۔ دن میں بھی اندر ٹھنڈا اندھیرا تھا۔ کچی مٹی سے لپے پوتے فرش پر ایک ہٹا کٹا شخص آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا حلیہ روایتی جوگیوں جیسا تھا۔ لمبے جٹا دھاری بال، طویل لہراتی ہوئی داڑھی، سیاہ چغہ اور گلے میں رنگ رنگ کے منکوں کی مالا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تسبیح تھی اور وہ فرشِ خاک پر آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ کمرے میں لوبان و اگربتی کا دھواں تھا اور کافور کی مہک تھی۔ اس کا کسرتی بدن چغے کے کھلے گریبان سے نمایاں تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جوان آدمی ہے۔

"جھک جا سچے رب کے سامنے جھک جا۔" وہ گرج کر بولا۔ "خبردار جو ہم سے کچھ مانگا۔ سب کو وہ دیتا ہے۔ جگ کا پالن ہار۔" یہ سب ڈراما تھا جو سادہ لوح عقیدت مندوں کو متاثر کرسکتا تھا۔

"آپ کو بھی دنیا کے معاملات میں دخل درمعقولات کی

جمعہ

بازار میں مٹرگشت کرتے ہوئے شاہد ایک اسٹال پر رک گیا جہاں بچوں کے ریڈی میڈ سوٹ فروخت ہو رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ہاکر نے آواز لگائی "پندرہ روپے کے دو، پندرہ کی جوڑی!"

"یہ ایک سوٹ کتنے کا ہے؟" شہزاد نے پوچھا۔

"آٹھ روپے کا۔"

"ٹھیک ہے، میں یہ دوسرا سوٹ لے رہا ہوں۔" شاہد نے دوسرا سوٹ اٹھا لیا۔

اجازت وہی دیتا ہے؟" میں نے گستاخی سے کہا۔

"کیا بکتا ہے گستاخ! ہم فقیر صرف دعا دیتے ہیں۔" وہ اسی طرح گرج کر بولا۔

"آپ لوگوں کو پچاس ہزار روپے بھی دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کہ جیل کے اندر فلاں شخص کو قتل کردو۔" اس کو میری بات نے بھڑ کے ڈنک کی طرح کاٹا۔

"اس بکواس کا مطلب؟" اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ پھر تسبیح اس کے ہاتھ سے گر گئی اور ایک لمحے کے لیے حیرت نے اسے منجمد کر دیا۔

"سچے موتیوں والی سرکار۔" میں نے پلک جھپکتے میں چھری کو اس کے حلق پر رکھ دیا اور اسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ "زندگی اور موت تم جیسے کمینوں کے ہاتھ میں ہوتی تو دنیا کب کی اجڑ چکی ہوتی۔ تم نے دیکھا کہ مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ کتنا زبردست ہے۔ میں قتل نہیں ہوا تمھیں قتل کرنے کے لیے جیل کی دیواروں سے نکل آیا ہوں۔"

"کون ہے... اندر کون ہے۔" باہر سے کسی نے چلّا کے کہا۔ پھر دوڑتے قدموں کی آواز آئی اور دو افراد دو مختلف دروازوں سے اندر آئے۔ اندر آتے ہی ان کے بریک جام ہوگئے۔

"وہیں کھڑے رہو۔ کسی نے ایک قدم آگے بڑھایا تو موتیوں والے بابا آنجہانی ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ وہ دونوں بے بس کھڑے مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے رہے۔ "خیریت چاہتے ہو تو واپس چلے جاؤ۔" وہ بادلِ ناخواستہ واپس چلے گئے۔

"مجھے جیل بھجوانے کی سازش تم نے کی تھی؟" میں نے کہا۔ جعلی پیر نے آہستہ سے گردن ہلا کے اقرار کیا۔

"وہ لڑکی کون تھی جس نے مجھے اپنا نام شیریں بتایا تھا لیکن اس کا اصل نام حسنہ تھا؟" میں نے کہا۔

Farrukh Malik

"وہ ہمارے لیے کام کرتی تھی۔" وہ بولا۔

"کیا کام کرتی تھی؟ منشیات کے دھندے میں مدد کرتی تھی یا بردہ فروشی میں؟" میں نے کہا اور چھری کو تھوڑا سا دبایا۔

"دونوں . . . دونوں کام کرتی تھی۔" جعلی پیر نے تھوک نگل کے کہا۔

"پھر اسے تم نے کیوں قتل کروا دیا تھا؟" میں نے کہا۔ "وہ لنگڑا کون تھا۔"

"وہ بغاوت پر آمادہ تھی۔ دھمکی دیتی تھی اور پیسے زیادہ مانگتی تھی۔" وہ بولا۔ "لنگڑا ڈی سلوا کا سالا تھا۔"

"چنانچہ وہ تمھارے ہی آدمی تھے جو اس کا تعاقب کر رہے تھے؟" میں نے کہا۔ "اگر وہ ہاتھ لگ جاتی تو تم اسے یہاں لاکے زندہ دفن کر دیتے مگر شامت نے مجھے گھیرا تھا کہ میں نے اس کی مدد کی۔ تم لوگ اپنا کام کر گئے مگر مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے جیل بھجوانے کے بعد تمھیں مجھ سے کیا خطرہ تھا کہ تم نے مجھے مروانے کی کوشش کی؟"

"ہمیں ڈر تھا کہ کہیں اس نے تم کو ہمدرد سمجھ کے ہمارے متعلق سب کچھ نہ بتا دیا ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"اگر اس نے مجھے کچھ بتایا ہوتا تو کیا میں خاموش رہتا!" میں نے کہا۔ "سزائے موت پانے کے بعد بھی کچھ نہ بولتا؟ جیل جا کے بھی چپ رہتا۔ جعل ساز، مکار، پیرین کے دنیا کو دھوکا دیتا ہے اور اس وقت بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ جب موت کے اور تیرے درمیان صرف چھری کی دھار حائل ہے۔"

"چھری پھینک دے . . . ." کسی نے مجھے ایک فحش گالی دے کر کہا۔ میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو مجھے ایک ریوالور کا رخ اپنی طرف نظر آیا لیکن میری نظر ریوالور پر نہیں اس شخص پر تھی جو ریوالور لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی ناک طوطے جیسی تھی اور وہ چلتے وقت تھوڑا سا لنگڑاتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ سیدھا ہوا اور چھری کو نیچے گرا دیا۔ جعلی پیر ایک دم کھڑا ہوا اور مجھے صرف ایک لمحہ ملا، جب ریوالور سے نکلنے والی گولی کے اور میرے درمیان خود پیر کا بھاری بھرکم وجود حائل ہوا۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا اور وہ جھٹکا لے کر ریوالور والے کی طرف بڑھا۔ گولی کی آواز اور نقلی پیر کی کربناک چیخ میں نے بعد میں سنی۔ اس سے پہلے میں بست لگا کے عقبی دروازے سے نکل چکا تھا۔ باہر نکلتے ہی میں نے دور دور تک پھیلا ہوا جنگل دیکھا جس میں اونچے درخت بہت کم تھے۔ زیادہ تر جھاڑیاں، کیکر اور ببول کی قسم کے درخت تھے۔ میں نے سر جھکا کے سمت کا اندازہ کیے بغیر دوڑنا شروع کیا۔ مجھے معلوم تھا، وہ میرے پیچھے ہیں اور ان راستوں کو مجھ سے زیادہ پہچانتے ہیں لیکن زندہ رہنے کی تمنا مجھے بھاگتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میرے کپڑے پھٹ گئے تھے اور ہاتھ پیر کانٹوں کی رگڑ سے زخمی ہو گئے تھے لیکن میں آہوئے صیاد دیدہ کی طرح جسم کی ساری قوت کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔

کامیابی ایک پل میں، ناکامی بن گئی تھی۔ میرا سارا پلان فیل ہو گیا تھا اور میں بے حد دل گرفتہ سڑک پر اپنا چہرہ چھپائے چل رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب تک موتیوں والا بابا اور اس کے ساتھی پولیس کے ذریعے جیل کے حکام کو بھی بتا چکے ہوں گے کہ تمھارا قیدی تو فرار ہو گیا ہے۔ ممکن ہے وہ جعلی پیر مر گیا ہو اور اس کے ساتھیوں نے یہ الزام بھی مجھ پر لگا دیا ہو کہ فرار ہونے والا قیدی ایک اور قتل کر چکا ہے۔ انھوں نے مسز ڈی سلوا سے بھی رابطہ قائم کر کے سب اگلوا لیا ہوگا اور اسے افشائے راز کی سزا بھی مل چکی ہوگی۔ پچاس ہزار کے فریب نے اسے زندگی جیسی نعمت سے محروم کر دیا۔ جیل کے اندر ڈی سلوا کا کیا بنے گا یہ اس کا مقدر۔ ابھی تو مجھے اپنی فکر تھی۔ اب تک پولیس چوکس ہو گئی ہوگی۔ میرا حلیہ مشتہر کر دیا جائے گا تو میرے لیے کوئی جائے اماں بھی نہ رہے گی۔ اگر میں نور افشاں کے پاس جاتا تو میری وجہ سے وہ بھی خطرے میں گھر جاتی اور یہ مجھے منظور نہ تھا کہ میں اپنے ایک پرانے محسن کے احسانات کا یہ صلہ ادا کروں۔

نہ جانے وہ کون سی سڑک تھی اور کون سی جگہ تھی۔ میرے قدم تو ایک میکانکی انداز میں اٹھ رہے تھے اور میرا ذہن خیالات کے گرداب میں غوطہ زن تھا۔ اچانک میں نے سامنے سے سیاہ رنگ کی ایک کار کو آتے دیکھا اور اسے میں صرف اپنی چھٹی حس کا کرشمہ ہی قرار دے سکتا ہوں کہ میں نے بروقت خطرے کو محسوس کر لیا۔ گاڑی تیزی سے میری طرف بڑھی کہ مجھے فٹ پاتھ پر ہی کچل دے لیکن میں بچ کر بھاگا۔ بائیں ہاتھ پر کسی اسکول کی دیوار تھی۔ میں نے ہاتھوں کے بل پر خود کو اٹھایا اور چار فٹ کی دیوار پھلانگ گیا۔ کار بے قابو ہو کے دیوار سے ٹکرائی۔ میں نے شیشہ ٹوٹنے کی، دھات کے پتھروں پر رگڑ کھانے اور پھر دیوار کے گرنے کی آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھنے پر مجھے کار میں وہی طوطے جیسی ناک والا اور اس کا ساتھی نظر آئے۔ شاید وہ مجھے گلی گلی سڑک سڑک ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور یہ محض اتفاق تھا کہ انھوں نے سامنے سے مجھے دیکھ لیا۔

گاڑی کا کافی نقصان ہوا تھا لیکن وہ دونوں اسے ریورس کر رہے تھے۔ جمع ہونے والوں نے ان کی مدد کی اور کار کو آگے

سے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کیا کریں گے۔ ذرا آگے اسکول کا گیٹ تھا۔ وہ اب گیٹ سے اندر آنے کی فکر میں تھے۔ مجھے ایک لق و دق میدان عبور کرنا تھا اور وہ اس تیز رفتار کار میں مجھے پکڑنے کی کوشش ضرور کر سکتے تھے، ورنہ اس میدان کو عبور کرنے سے پہلے ہی مجھے گولی مار کے جا سکتے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسکول میں چھٹی ہو چکی تھی اور کمرے بند پڑے تھے۔ کار کو میں نے اس وقت گراؤنڈ میں داخل ہوتے دیکھا جب میں برآمدے میں تھا۔ کسی نے ایک فائر کیا اور ایک بند دروازے کے شیشے چھناکے سے بکھر گئے۔ میں نے پیچھے کی طرف نکلنے والے راستے کی تلاش میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک دوڑنا جاری رکھا مگر سب کمرے مقفل تھے۔ کار برآمدے کے سامنے آ رکی اور میں نے ان دونوں کے چلانے کی آواز سنی۔ لنگڑا اپنے ساتھی سے ایک طرف جانے کو کہہ رہا تھا اور خود دوسری طرف جا رہا تھا۔

اچانک میرے سامنے ایک زینہ آ گیا۔ میں سوچے سمجھے بغیر اوپر چڑھ گیا۔ سپاٹ چھت پر دھوپ تھی اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر پڑا تھا۔ میں نے آخری کنارے پر سے جھانک کر دیکھا۔ دس فٹ اونچی چھت کے نیچے کچی زمین تھی۔ پھر چند فٹ کے فاصلے پر احاطے کی عقبی دیوار تھی اور دیوار کے بعد ایک سڑک تھی جس پر خاصی ٹریفک تھی۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں نیچے کود گیا۔ میرے ایک پاؤں کے مڑنے سے پوری ٹانگ میں درد کی لہر سی اٹھی لیکن میں اٹھتے ہی دیوار کی طرف لپکا۔ چھت کے اوپر سے دوسرا فائر ہوا مگر اس وقت تک میں دیوار پر سے کود چکا تھا۔

"خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔" میں نے اٹھ کر دوڑنے کی کوشش کی۔ ایک موٹر سائیکل والا رک گیا پھر دو راہ گیر لپکے۔ "وہ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے اسکول کی چھت کی طرف اشارہ کیا مگر وہ غائب ہو چکے تھے۔ جواب کا انتظار کیے بغیر میں اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ گیا۔ "چلو۔ نکل چلو یہاں سے۔" میں نے چلا کر کہا۔

اسکوٹر والا سخت بدحواسی میں بھاگا۔ وہ اکیلا ہی بھاگ جاتا لیکن میں پیرِ تسمہ پا بن کے اس پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے لے کر فرار ہوا۔ اس امید میں کہ خطرے کی حدود سے نکل جانے کے بعد مجھ سے سوال جواب کرے گا۔ اچانک مجھے اپنے سامنے ایک آڈیٹوریم نظر آیا۔ جس کے باہر ایک ڈرامے کے بینر لگے ہوئے تھے اور ہر بینر پر نورافشاں کا نام بہت نمایاں تھا۔

"بس بھائی، اسکوٹر روک دو۔" میں نے کہا۔ "اور بھاگ جاؤ۔ تمھارا بہت شکریہ۔"

"وہ... اب تمھیں ۔ میرا مطلب ہے مجھے کوئی خطرہ تو نہیں۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"جب تک کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرو گے خطرے کی کوئی بات نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "صرف اسی لیے میں تم کو تھانے نہیں لے جا رہا ہوں۔ رپورٹ تو مجھے کرنی ہے مگر تم خواہ مخواہ مدد کر کے گواہی کے چکر میں آ جاؤ گے۔"

"کیا انھوں نے نمبر نوٹ نہیں کیا ہوگا؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ وہ بہت دور تھے اور آس پاس لوگ بھی تھے تم جاؤ۔" میں نے کہا۔ "ایک بار پھر شکریہ۔" میں لنگڑاتا ہوا آڈیٹوریم کی طرف بڑھا۔

"مس نورافشاں سے ملنا ہے مجھے۔" میں نے ایک شخص کو روک کر کہا۔

اس شخص نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "کیا نام ہے؟ وہ شو کی تیاری کر رہی ہیں۔"

"کوئی کام نہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "میں ان کا کزن ہوں۔ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔"

"میک اپ روم میں دیکھ لو۔ آگے سے بائیں ہاتھ کو تیسرا کمرہ۔" وہ بولا اور چل پڑا۔

نورافشاں نے ابھی میک اپ شروع نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنے مقابل پا کے اس کو ایک خوشگوار حیرت نے منجمد کر دیا۔ "آپ... یہاں..." اس نے میری حالت دیکھ کر کہا۔

"ہاں ۔ مجھے ایک بہت ضروری کام تھا تم سے۔ میں سخت بیمار ہوں اور مجھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔" میں نے ایک کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔ چند دوسرے لوگوں نے مجھے اور نورافشاں کو عجیب نظروں سے دیکھا لیکن میں نے ان کو نظر انداز کر دیا۔ چند منٹ بعد میں نورافشاں کی کار میں اس کے گھر کی جانب رواں تھا۔ کار کو نہ جانے کون چلا رہا تھا لیکن نورافشاں نے اسے مکمل ہدایات دے دی تھیں اور مجھ سے کہا تھا کہ وہ شو ختم ہوتے ہی پہنچ جائے گی۔

وہ رات کے دس بجے لوٹی تو میں بہت بہتر تھا۔ میں گرم پانی سے غسل کر چکا تھا، کپڑے بدل چکا تھا اور کھانا کھا چکا تھا۔ ایک ڈاکٹر میری مرہم پٹی کر گیا تھا اور کچھ سکون آور دوائیں دے گیا تھا۔ نورافشاں کی واپسی تک میں اس کی ماں کو اپنے متعلق سب کچھ بتا چکا تھا۔ سوائے اپنی شادی، قتل کے الزام اور جیل سے فرار کی داستان کے۔ میں نے صرف یہی بتایا تھا کہ اب میں اپنا کام کرتا ہوں۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا تھا

اور پھر اپنے مرحوم شوہر کو یاد کرکے روتی رہی تھیں۔ پھر روایتی ماں کی طرح انھوں نے نور افشاں کے شوق کی مجبوری پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کسی طرح اس کے ہاتھ پیلے ہو جائیں تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوں اور مرنے سے پہلے حج کر سکیں۔ احتیاطاً میں نے اپنا نام غلط بتایا تھا۔ ارشد تو انھیں یاد تھا لیکن میں نے ارشد محمود کو ارشد سلطان کر لیا تھا۔

یہ خبر میں نے تیسرے دن اخبار میں پڑھی کہ ایک اسکول کی دیوار کو توڑنے والے اور کسی نامعلوم شخص کو قتل کرنے کی کوشش کرنے والے گرفتار ہو گئے ہیں۔ انھیں لوگوں نے پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ بیماری کے بہانے میں ایک مہینے تک گھر سے نہیں نکلا۔ میں جانتا تھا کہ علی بھائی اور کرم داد کو میرا راز افشا ہونے کا کتنا دکھ ہوگا اور اب ہر لمحہ وہ منتظر رہتے ہوں گے کہ کب میں پھر پکڑا جاؤں اور پھر جیل پہنچوں لیکن میرے مستقبل کی راہیں تقدیر نے متعین کر دی تھیں۔ جس دن نور افشاں مجھ سے ملنے جیل پہنچی تھی، میرے لیے آزمائش کا دور ختم ہو گیا تھا۔

"خالہ جان، آپ نے ایک بار حج پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔" میں نے ایک ماہ بعد موقع پاتے ہی کہا۔

"ہاں بیٹا!" انھوں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "دل تو چاہتا ہے لیکن جب تک اپنا یہ فرض ادا نہ کر لوں، کیسے جاؤں۔"

"دراصل مجھے سعودی عرب میں ایک بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تنخواہ بھی دس ہزار ریال ماہانہ ہے۔ رہائش کے علاوہ دوسری سہولتیں ہیں، فیملی کو لانے لے جانے کی۔"

"تمھاری تو ابھی فیملی ہی نہیں۔ کب تک جا رہے ہو؟" انھوں نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"ایک ہفتے کے اندر اندر رپورٹ کرنی ہے۔" میں نے کہا۔ "پاسپورٹ، ویزا سب کا بندوبست ہو گیا ہے۔ کمپنی نے ٹکٹ بھیج دیا ہے اور ویزا پاسپورٹ وغیرہ ایک ٹریول ایجنٹ نے بنوا دیے ہیں۔"

"اچھا بھئی، خدا مبارک کرے۔" انھوں نے کہا۔ "ضرور جاؤ لیکن ہمیں بھول مت جانا جیسے پہلے برسوں خبر نہیں لی۔"

"بھولنے کا کیا سوال! میں تو چاہتا ہوں، آپ ساتھ ہی چلیں۔" میں نے کہا۔ "آپ دونوں۔"

"ہم دونوں؟" انھوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "ہم کیسے جا سکتے ہیں تیرے ساتھ۔"

"میری فیملی بن کے۔ مجھے فیملی ویزا ملا ہے اور ٹکٹ بھی۔" میں نے کہا۔ "آپ حج بھی کر لیں گی۔"

"لیکن ہم تیرے فیملی ویزا پر کیسے جائیں گے لڑکے؟"

"میری فیملی بن کے۔ کیا ایک ہفتے میں ہم ایک فیملی نہیں بن سکتے؟ بات تو صرف آپ کے رضامند ہونے کی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور... نور افشاں... اس نے اپنی رضامندی پہلے ہی دے دی ہے۔" انھوں نے برہمی سے کہا۔ "میں سب سمجھتی ہوں۔ بے وقوف بناتے ہو مجھے دونوں مل کے۔ جتنا بھولا اور شریف نظر آتا ہے تو..." پھر وہ رونے لگیں۔

میں نے سر جھکا لیا۔ یہ ڈانٹ پیار کا اظہار تھی اور یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے۔ بہانہ معقول تھا۔ چنانچہ نکاح کی تقریب بہت سادگی سے ہوئی جس میں گنے چُنے افراد شریک ہوئے۔

جب میں دُولھا بنا بیٹھا تھا تو مجھے خیال آیا کہ کیا ہو اگر اس وقت فلمی وِلن کی طرح انسپکٹر حاکم خان وارد ہو جائے اور ریوالور نکال کے کہئے "ٹھہرو۔ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔" اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔ چند بزرگوں نے مجھے اس بے حیائی کے مظاہرے پر گھورا۔ وہ افراتفری کی اس شادی سے پہلے ہی خوش نہ تھے۔ خوش تھا تو میں۔ خوش تھی نور افشاں اور اس کی ماں جس کے لیے منزلِ مراد ایک خواب کی تعبیر بن کے اچانک سامنے آ گئی تھی۔ یہی میری منزلِ مراد بھی تھی اور ایک ہفتے بعد جب جہاز نے ٹیک آف کیا تو میں کرم داد اور علی بھائی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ علی بھائی کی منزلِ مراد بھی قریب تھی لیکن کرم داد کی زندگی کا سفر تنہا ہی کٹنا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ رہائی پاتے ہی میں تم دونوں کے گھر آؤں گا۔ ہمارا گھر اب ہماری منزلِ مراد تھا لیکن مجھے دکھ تھا کہ جب بالآخر کرم داد اس گھر کی تلاش میں نکلے گا تو اسے ہمارا گھر کہیں نہیں ملے گا۔ پھر وہ کہاں جائے گا؟ میں نے سوچا، اس کی منزلِ مراد کیا ہوگی اور کہاں ہوگی؟

"کیا سوچ رہے ہیں؟" نور افشاں نے آہستہ سے میرے میرے کان میں کہا۔

"میں... کچھ نہیں... یہ سوچ رہا تھا کہ منزلِ مراد سے پہلے کتنے سراب آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا کہ تم اور میں ایک ہی منزل کے مسافر ہو گئے ہیں۔ ہمارا یہ سفر کہاں تک ہے؟"

"بس جی..." تیسری سیٹ کے مسافر نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ ریاض کی فلائٹ ہے؟"



Farukh Malik